August-September 2021

# الرسالہ

Al-Risala

خصوصی شمارہ

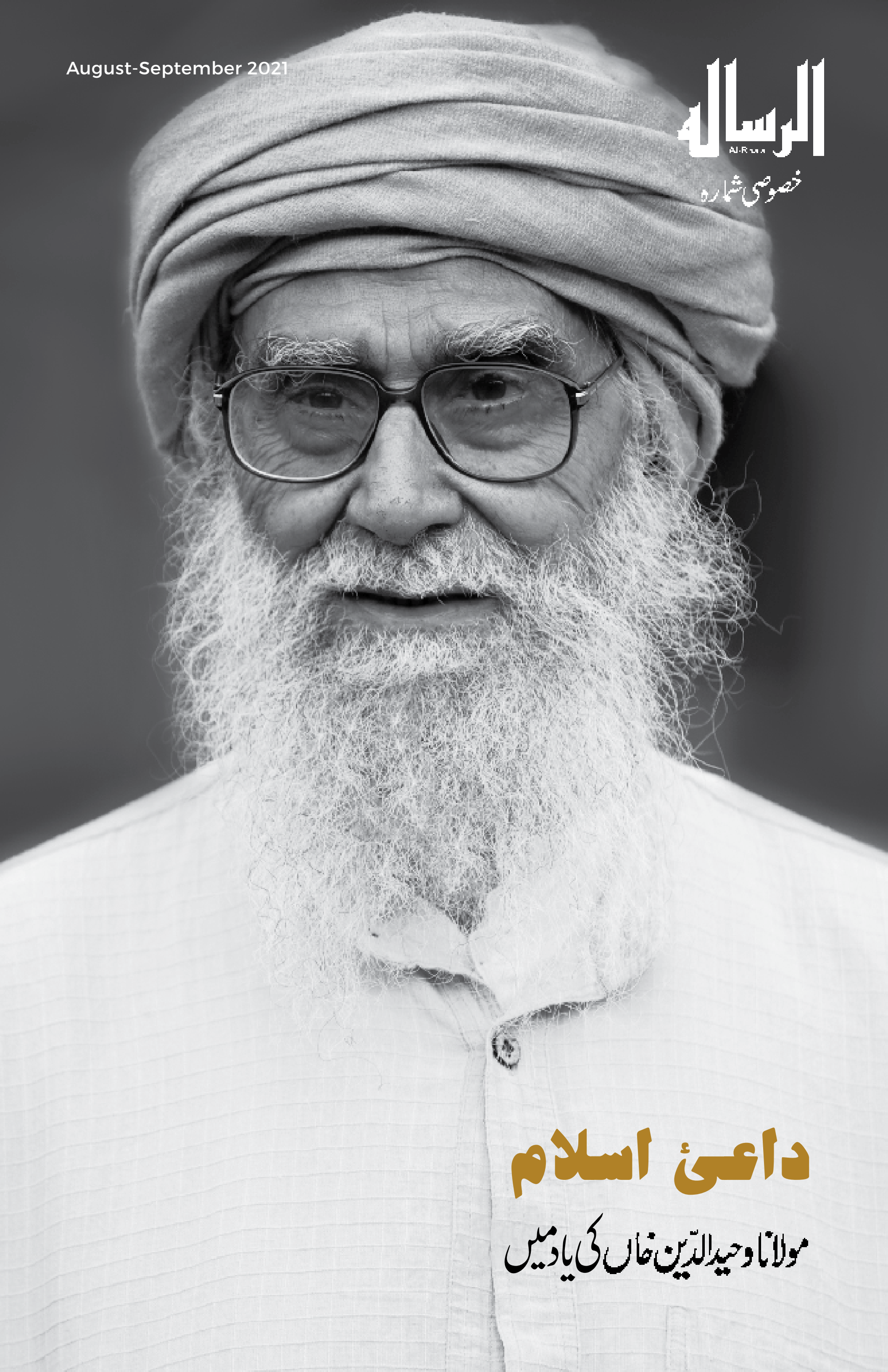

# داعئ اسلام

## مولانا وحید الدّین خاں کی یاد میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الرسالہ

August-September 2021
Volume 46 | Issue 8-9

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: +91-8588822679
Tel. 0120-4314871
Email: skhan@goodwordbooks.com

Price Special Edition ₹200

Annual Subscription Rates

| | |
|---|---|
| Retail Price | ₹30 per copy |
| Subscription by Book Post | ₹300 per year |
| Subscription by Regd. Post | ₹400 per year |
| Subscription (Abroad) | US $20 per year |

Bank Details Al-Risala Monthly

Punjab National Bank
A/c No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000
Nizamuddin West Market Branch

To order books by Maulana Wahiduddin Khan, please contact Goodword Books
Tel. +91 120-4314871, Mobile: +91-8588822672
Email: sales@goodwordbooks.com

Goodword Bank Details

Goodword Books
State Bank of India
A/c No. 30286472791
IFSC Code: SBIN0009109
Nizamuddin West Market Branch

خصوصی شمارہ

## داعیٔ اسلام

### مولانا وحید الدّین خاں کی یاد میں

زیرنگرانی

ڈاکٹر فریدہ خانم

ایڈیٹوریل بورڈ

مولانا سید اقبال احمد عمری
مولانا خطیب اسرار الحسن عمری
مولانا فرہاد احمد
ڈاکٹر نغمہ صدیقی
ڈاکٹر رجت ملہوترا
محمد عارف

ڈی ٹی پی ٹیم

عمران احمد اصلاحی
راجیش کمار
دنیش دیوگن
محمد اسجد

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd., A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| پیش لفظ | ثانی اثنین خاں | 6 |
| حق کا مسافر | مولانا وحید الدین خاں | 9 |
| والد صاحب | ڈاکٹر ظفر الاسلام خان | 12 |
| والد صاحب، ایک با اصول مربّی | ڈاکٹر فریدہ خانم | 13 |
| مولانا وحید الدین خاں | ڈاکٹر محمد اکرم ندوی | 28 |
| ایک عالم ربانی و ہمہ جہت شخصیت | پروفیسر ظہیر الدین خواجہ | 32 |
| مولانا سے میرا تعلق | خواجہ کلیم الدین | 38 |
| خیال در خیال | محمد فاروق | 44 |
| بے مثال شخصیت | فاروق مضطر | 49 |
| ایک صاحبِ طرز داعی | مولانا ابو عمار زاہد الراشدی | 51 |
| اپنے عہد کی ایک منفرد آواز | جاوید احمد غامدی | 52 |
| انسان کی تحریر اَبدالآباد تک باقی رہتی ہے | ڈاکٹر محمد طاہر القادری | 55 |
| مولانا وحید الدین خاں — ایک منفرد شخصیت | شمشاد محمد خان | 56 |
| ایک عارف باللہ کی بات | حافظ سید عمیر احمد عمری مدنی | 58 |
| ایک خط | نور الحسن راشد کاندھلوی | 59 |
| اسلامی، علمی وفکری روایات کا سنگ میل | سید سعادت اللہ حسینی | 60 |
| وحید الدین خان کی رحلت | ڈاکٹر خضر یاسین | 61 |
| مرحوم کی ’مذہب اور جدید چیلنج‘ منفرد تصنیف | مفتی ناصر الاسلام فاروقی | 62 |
| آہ! وہ فکرِ آخرت میں آنسو بہانے والا نہ رہا! | عابد حسین رحمانی | 63 |
| مولانا وحید الدین خاں | ابو یحیٰی | 64 |
| موت العالِم موت العالَم | خواجہ عبد الرسول | 66 |
| ایک یادگار گفتگو: جو قلب و ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ گئی | مولانا غلام قادر بانڈے | 67 |
| پھل دار درخت کے نیچے، بیتے کچھ لمحات | ڈاکٹر محی الدین غازی | 69 |

| | | |
|---|---|---|
| خود احتسابی | حسن نثار، روزنامہ جنگ | 74 |
| خس وخاشاک سے اس نے کیے برق وشرر پیدا (منظوم) | حیدر میواتی ندوی | 76 |
| بڑے ابا | مز فہمیدہ خان | 77 |
| خدا اور آخرت کا داعی | مولانا سید اقبال احمد عمری | 79 |
| جب میں نے مولانا سے پہلی بار ملاقات کی | اظہر مبارک | 83 |
| ناقابلِ تلافی نقصان! | جعفر صادق باقوی | 86 |
| میرے محسن، میرے معلم | عمران احمد اصلاحی | 87 |
| میرے معلم ومربی | عبدالصمد ابن خلیل احمد | 90 |
| مولانا وحیدالدین خان | محمد احسن تہامی | 91 |
| مولانا وحیدالدین خان کی بات | مجیب الرحمن شامی | 93 |
| میرے مینٹر، میرے گائڈ | ڈاکٹر سفینہ تبسم | 95 |
| مولانا سے یادگار ملاقات | مولانا فیاض الدین عمری | 96 |
| وہ جو آنسوؤں پر ٹھہرا ہوا تھا | مولانا خطیب اسرار الحسن عمری | 98 |
| ایک تاثر | عبدالصمد خاں | 102 |
| کچھ یادیں | مولانا فرہاد احمد | 103 |
| مولانا وحیدالدین خاں | ڈاکٹر ذاکر فاز | 108 |
| امن اور مولانا وحیدالدین خان | اداریہ، روزنامہ سالار بنگلور | 113 |
| علمی روایت کا بڑا آدمی | اوریا مقبول جان | 115 |
| کہاں ڈھونڈے گا زمانہ (منظوم) | زید ابن ریاض | 116 |
| مولانا وحیدالدین خان | امجد اسلام امجد | 117 |
| مولانا وحیدالدین خاں: آفتابِ علم وعرفاں | افضال ریحان | 119 |
| عجیب شخص تھا حیران کر گیا سب کو | ڈاکٹر محمد وقار عالم | 121 |
| دل میں نفرت نہ ہو | امجد احمد | 124 |
| میں نے مولانا وحیدالدین خاں سے کیا سیکھا | مظہر جمیل رشیدی | 125 |
| آہ! اس صدی کا عظیم مفکر | محمد نظام الدین قاسمی | 127 |
| لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے | مولانا انس ملک ندوی | 129 |
| مینارۂ نور | ہمایوں مجاہد تارڑ | 132 |

| | | |
|---|---|---|
| رازحیات والے باباجی | عارف انیس | 134 |
| مولاناوحیدالدین خان: حیات اورافکار | عزیزعلی داد | 137 |
| مولاناوحیدالدین خان، ایک عہدساز شخصیت | لونگین یوسف زئی | 141 |
| تاریخِ وفات منظوم | مولاناتحمید خضر | 143 |
| دعوتی مزاج کے شارح | اسرارمدنی | 144 |
| ارے کہاں مرتے ہیں علم والے | محمدابراہیم امین | 145 |
| تشکیک سے ایمان تک کاسفر | حبیب اللہ حقانی | 146 |
| باہوش مجذوب | محمدسجادنواز | 147 |
| ’’آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے‘‘ | قاسم رونجھا | 148 |
| مولاناوحیدالدین خاں :افکاروخدمات | محمدعارف ندوی | 149 |
| ایک پیغام | ڈاکٹرعبدالرب ثاقب | 152 |
| 200 سےزائدکتابوں اوررسائل کے مصنف | ڈاکٹرعبدالرب ثاقب | 152 |
| مولاناوحیدالدین خان: کچھ یادیں اورباتیں | ظہیراحمد | 155 |
| مولاناوحیدالدین خاں | مولانامحمدشمشادندوی | 160 |
| مولاناوحیدالدین خاں سے ایک غیررسمی ملاقات | سہیل ارشد | 162 |
| میرے علمی استاداوررہبر | فاروق عادل | 164 |
| اعظم گڑھ سےنظام الدین ویسٹ براستہ پٹھان کوٹ | عبداللہ طارق سہیل | 167 |
| مولاناوحیدالدین خان انتقال فرماگئے! | ایم ایم ادیب | 169 |
| آہ!مولاناوحیدالدّین | نوازخالدعاربی | 172 |
| دبستانِ شبلی کی ایک اہم شخصیت | گل رحمان ہمدرد | 175 |
| رازِحیات کے مصنف | ساجدبھٹو | 177 |
| بزم ہستی کوسوگوارکرگئے | ڈاکٹرسیدطفیل ہاشمی | 178 |
| مولاناوحیدالدین خاں: تین ملاقاتیں اورکچھ باتیں | آصف تنویرتیمی | 179 |
| وحیدالدین خان کااحسان | فاروق عادل | 183 |
| سائنٹفک نظریات کے علمبردارعالم | عبدالحئی خان | 186 |
| بصائروعبرکے ایک عہدکاخاتمہ | ناظم اشرف مصباحی | 188 |
| ایک عہدساز شخصیت کی دنیاسے رخصتی | عامرندیم | 189 |

| | | |
|---|---|---|
| روشن دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے | سالم فاروق ندوی | 190 |
| مولانا وحید الدین خاں صاحب کے اوصاف | جاوید اقبال | 192 |
| مولانا وحید الدین خان نے کیا کیا؟ | مالک اشتر | 193 |
| خاکسارانہ خودداری کا رول ماڈل | صہیب سلیم رومی | 196 |
| مولانا وحید الدین خان میری نظر میں | ناصر منصور | 198 |
| بابا چلے گئے | ڈاکٹر اشفاق | 200 |
| تحریک الرسالہ ایک تعارف | پروفیسر ظہیر الدین خواجہ | 201 |
| مولانا وحید الدین کی فکر کا ایک مطالعہ | خالد محمود | 207 |
| بڑے نانا سے میں نے کیا سیکھا | مزطرب خان | 209 |
| اسلام کا داعی بے مثل | نعیم بلوچ | 211 |
| مولانا وحید الدین خان، اپنی تصانیف کی روشنی میں | طاہر محمود | 217 |
| مولانا وحید الدین خاں کی فکر اور میرے تاثرات | سید اسفندیار | 219 |
| مولانا وحید الدین خان کے اہم افکار کا خلاصہ | مولانا ابوالمرجان فیضی | 221 |
| ایک قاریٔ الرسالہ کی ڈائری | نذیر الاسلام | 222 |
| مولانا میری نظر میں | مولانا عبداللہ چترویدی | 231 |
| الرسالہ مشن کی تحریروں کا تعارف | مولانا سید اقبال احمد عمری | 236 |
| مغالطوں کا جائزہ | پروفیسر ابواریب | 263 |
| مولانا کی تحریریں میری نظر میں | محمد ندیم ندوی | 273 |
| مولانا وحید الدین خان اور علماء کا اعتراض | مولانا انس ملک ندوی | 275 |
| موت العالِم، موت العالَم | خورشید احمد ندیم | 287 |
| مولانا وحید الدین خان اور ہندوستانی مسلمان | ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری | 291 |
| امن اور عدم تشدد کا نقیب: مولانا وحید الدین خاں | حکیم شمس الآفاق، نئی دہلی | 295 |
| طارق بدر صاحب کے نام ایک خط | مولانا وحید الدین خاں | 301 |
| خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ | مولانا محمد عبدالہادی عمری | 302 |
| جوانی اور بڑھاپا | مولانا وحید الدین خاں | 304 |
| اہم تجاویز | ڈاکٹر محمد خالد | 305 |
| مولانا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان برج تھے | سید عبداللہ طارق | 307 |
| علمی وادبی دنیا کا بہت بڑا خسارہ | فیروز خان | 308 |
| میرے مولانا صاحب | ڈاکٹر شیام سندر شرما | 311 |
| فہرست کتب | ادارہ الرسالہ | 312 |

# پیش لفظ

21 اپریل 2021 کی رات کو میرے والد، مولانا وحید الدین خاں کا انتقال ہو گیا۔ وہ میرے والد ہی نہیں تھے، بلکہ وہ میرے استاد بھی تھے۔ وہ مادی جسم کے اعتبار سے اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں، لیکن معنوی اعتبار سے مشن کے تمام افراد کے ساتھ ہیں۔ مولانا کی تحریریں اور ان کا مشن ہمارے ساتھ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 24 جون 1967 کو جب گنگا جمنا ایکسپریس، پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پر رکی تو مولانا اپنے ہاتھ میں ایک باسکٹ لیے ہوئے ٹرین سے اترے۔ باسکٹ میں کچھ کھانے کی چیزیں تھیں، جسے میری والدہ نے زادِ سفر کے طور پر تیار کیا تھا، کچھ کپڑے اور تقریباً دوسو روپے تھے۔ مولانا ایک ہاتھ میں مجھے تھامے ہوئے تھے، اور دوسرے ہاتھ سے باسکٹ کو۔ میں اس وقت تقریباً سات سال کا تھا۔ اس طرح مولانا اعظم گڑھ، یوپی کے ایک دور دراز گاؤں سے دہلی شہر پہنچے۔ یہ بظاہر ایک عام سفر تھا مگر یہی سفر آگے چل کر الرسالہ مشن کی تاریخ بننے والا تھا۔

دہلی میں مولانا نے ہفتہ وار اردو میگزین الجمعیۃ کے مدیر کے طور پر کام شروع کیا۔ کچھ سالوں کے بعد میگزین کی اشاعت بند ہو گئی۔ چنانچہ مولانا نے اپنے آبائی وطن لوٹ جانے کا ارادہ کیا، لیکن میری والدہ محترمہ نے گاؤں واپس جانے کے اس خیال سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہم گاؤں واپس نہیں جائیں گے۔ کیونکہ ہمارے بچے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت بھائی صاحب (ڈاکٹر ظفر الاسلام خان) نے بھی دہلی میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا، اور یہ بھی مشورہ دیا کہ ہم خود ایک میگزین شروع کریں۔ اس کے بعد انھوں نے ہی اس میگزین کا نام الرسالہ تجویز کیا۔ اس طرح بھائی صاحب کی تحریک اور مالی تعاون سے ہم نے اکتوبر 1976 میں الرسالہ کی اشاعت شروع کی۔ اس وقت میں دسویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ مولانا نے مجھے یہ ذمہ داری دی کہ میں ہر ماہ الرسالہ چھپواؤں اور اسے پوسٹ کروں۔

اسی طرح جب الرسالہ شائع ہونا شروع ہوا تو آپا (ڈاکٹر فریدہ خانم) نے خط وکتابت کرنا اور الرسالہ کے مضامین کو انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ پھر الرسالہ کا انگریزی اڈیشن نکلنے لگا جس کو خواجہ کلیم الدین صاحب نائجیریا سے بھی شائع کرانے لگے۔ چند سالوں کے بعد اس انگریزی اڈیشن کو ہارون شیخ

صاحب نے اسپریچول میسیج (Spiritual Message) کے نام سے ممبئی سے نکالنا شروع کیا۔ اب یہ انگریزی اڈیشن اسپرٹ آف اسلام (Spirit of Islam) کے نام سے سارہ فاطمہ صاحبہ کی نگرانی میں بنگلور سے شائع ہورہا ہے۔ اسی طرح بعد میں الرسالہ کا ہندی اڈیشن بھی نکالا گیا جو کہ چند سالوں تک نکلا اور اب کیپٹن خرم اسلام قریشی کی کوششوں سے ہندی الرسالہ دوبارہ جاری ہوگیا ہے۔

جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی، الرسالہ کے مضامین سے میری دلچسپی بھی بڑھنے لگی۔ میں نے مولانا کی بہت سی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ جس کی وجہ سے اسلام کے متعلق میرے علم میں اضافہ ہوا۔ مولانا کی تحریروں کا فوکس شعوری سطح پر خدا کی ڈسکوری تھا، اس میں جامد و بے روح رسمی عقیدے کی بات نہیں ہوتی تھی۔ مولانا خدا کے بارے میں ڈسکوری کی سطح پر جو باتیں لکھتے تھے اس سے میرا مائنڈ ایڈریس ہوتا تھا۔ اس طرح خدا کی معرفت کی طرف میرا سفر شروع ہوا۔

میرے اندر دعوتی ذہن پیدا ہوا۔ اور مولانا کی باتوں کو دوسرے لوگوں تک پہنچانا میری زندگی کا مقصد بن گیا۔ اس کے علاوہ مولانا کی مزید باتیں جو مجھے بہت پسند آئیں وہ یہ تھی: مثبت سوچ، ہر قسم کے منفی خیالات سے ذہن کو پاک رکھنے کی تلقین، وقت کی قدر کرنا اور وقت کو ضائع نہ کرنا۔ انسانیت سے محبت، یہ ماننا کہ انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں، امن، عدم تشدد اور کمیونل ہارمنی، برادرانِ وطن سے آخری حد تک خیر خواہانہ رویہ رکھنا، قرآن کی تلاوت کے بجائے قرآن کی آیات پر تدبر کرنا، ہر موقع پر دعا کرنا اور خدا پر مکمل بھروسہ کرنا۔ اگر ان تمام باتوں کو صرف ایک جملے میں کہا جائے تو وہ یہ ہوگا: مولانا ہمیشہ ہمیں آخرت رخی زندگی اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔

یہ کچھ بنیادی تعلیمات تھیں جو میں نے الرسالہ اور مولانا کی دیگر کتابیں پڑھ کر حاصل کیں۔ مولانا ہمیشہ خدا سے دعا مانگتے تھے۔ وہ اکثر موت کو یاد کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا فارمولا تھا: سادہ زندگی گزارو مگر اعلیٰ سوچ والے بنو۔ وہ اکثر اٹھتے بیٹھتے، فطرت کے عجائبات پر غور کرتے رہتے تھے۔ کائنات اور روزمرہ کے واقعات کو اللہ کی یاد کا ذریعہ بناتے تھے۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں اور نہ ہی کسی کے خلاف کسی قسم کی محاذ آرائی۔ کسی سے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اس کے حق میں دعا کرنا۔ ہر طرح کے منفی اقدام سے اپنے آپ کو بچانا۔ یہ چند مولانا کی امتیازی خصوصیات تھیں جن سے میں بہت متاثر ہوا۔

2001 میں چند سیکولر تعلیم یافتہ نوجوانوں نے مولانا کی تعلیمات سے متاثر ہو کر سی پی ایس انٹرنیشنل

(CPS International) کو بطور مشن شروع کیا جن میں ڈاکٹر رجت ملہوترا، ڈاکٹر نغمہ صدیقی، ڈاکٹر استوتی ملہوترا اور جناب نودیپ کپور سرفہرست ہیں۔

جس مشن کا عملی خاکہ مولانا کے ذہن میں پہلے ہی سے تھا اور جس کو اسلامی مرکز کے نام سے جانا جاتا تھا، اب اس نے سی پی ایس انٹرنیشنل کی صورت اختیار کرلی۔ اس طرح مولانا کے مثبت افکار نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی اور ہزاروں، لاکھوں لوگ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک میں بھی اس سے جُڑ گئے۔ سی پی ایس مشن کے قیام سے الرسالہ کے قارئین کو ایک ٹیم کی صورت میں مولانا کی تعلیمات کو دور دور تک پہنچانے کا ایک بہترین پلیٹ فارم حاصل ہوگیا۔ اب اس مشن کے لوگ ساری دنیا میں قرآن کے تراجم اور مولانا کی کتابوں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ تقسیم کررہے ہیں اور ممکن حد تک لوگوں کو اسلام کا پرامن پیغام پہنچا رہے ہیں۔

اب مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے! اب ان کی کتابیں، ان کے خطابات اور ان کی تحریریں ان کا بدل بن گئی ہیں۔ مولانا کے افکار اور ان کا پرامن پیغام ہمارے پاس موجود ہے، اور عصری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم پوری دنیا میں قرآن کا پیغام پہنچائیں، اس خدائی مشن کے کام کو اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھیں اور اس میں اپنے آپ کو ہمہ تن لگادیں۔

مولانا کے انتقال کے بعد، انڈیا اور کئی ممالک سے ہمیں مولانا کے بارے میں مضامین، تعزیتی پیغامات، اور مولانا کی تحریروں کے خلاصے موصول ہوئے۔ ہم الرسالہ کے اس خصوصی شمارے میں کچھ منتخب مضامین اور پیغامات پیش کررہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس خصوصی شمارہ کے ذریعہ قارئین کو مولانا کے مشن کو مزید سمجھنے کا موقع ملے گا۔

اللہ ان تمام لوگوں کو جزائے خیر عطاء فرمائے جنھوں نے اس موقع پر پیغامات ارسال کیے، یا مضامین لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مولانا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

والسلام

ثانی اثنین خان

نئی دہلی، 20 اگست، 2021

# حق کا مسافر

## مولانا وحید الدین خاں

جنوبی افریقہ کے ناول نگار اولیو شرینز (1855-1920ء) کی ایک کتاب ہے:

ایک افریقی فارم کی کہانی

Story of an African Farm

اس میں ایک اجنبی مسافر ایک کسان لڑکے کو ایک شکاری کا قصہ بیان کرتا ہے۔ اس شکاری کو سچائی کی خوبصورت سفید چڑیا کی تلاش تھی، جس کی ایک جھلک اس نے ایک جھیل کے کنارے دیکھی تھی۔ اس نے خوش اعتقادی کے پھندے اور تصورات کے پنجرے میں چڑیا کو پکڑنا چاہا مگر اسے معلوم ہوا کہ سچائی کو سچائی ہی کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے توہمات کی وادی کو چھوڑ دیا اور سچائی کے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک اونچی کھڑی ہوئی چٹان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اس چٹان کو کاٹ کاٹ کر سڑھیاں بنانی شروع کیں۔

سالہا سال تک وہ سیڑھیاں بناتا رہا اور اوپر چڑھتا رہا، یہاں تک کہ بوڑھا ہوتے ہوتے وہ اس کی چوٹی پر پہنچ گیا مگر اب اسے معلوم ہوا کہ اس کے آگے ایک اور چٹان ہے جو اس سے بھی زیادہ اونچی ہے مگر اب اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور وہ وہیں مرجاتا ہے۔ تاہم مرتے وقت اوپر سے ایک سفید پر آ کر اس کے پاس گرا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ مطلوب چڑیا اس اگلی چٹان پر ہے۔ اگرچہ وہ خود سچائی کی چڑیا تک نہیں پہنچ پاتا۔ مگر وہ اس اطمینان کے ساتھ جان دے دیتا ہے کہ میرے بعد آنے والے کو پچھلی سیڑھیاں نہیں بنانی پڑیں گی۔ وہ پر کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور یہ کہتے ہوئے مرجاتا ہے:

Where I lie down worn out other men will stand, young and fresh. By the steps that I have cut they will climb...They will mount, and on my work, they will climb, and by my stair!

They will find her, and through me! (*The Story of an African Farm*, by Olive Schreiner, Chapter 2.II.)

جہاں آج میں بوڑھا اور کمزور ہو کر گر پڑا ہوں، دوسرے لوگ یہاں سے کھڑے ہوں گے۔ نوجوان اور تازہ دم۔ جو سیڑھیاں میں نے کاٹی ہیں، وہ اس سے چڑھیں گے۔ وہ کبھی نہ جانیں گے سیڑھیاں بنانے والے کا نام کیا تھا۔ مگر وہ ان سیڑھیوں پر چڑھتے رہیں گے اور بالآخر سچائی تک پہنچ جائیں۔

راقم الحروف کی پیدائش کی (تخمینی) تاریخ یکم جنوری ۱۹۲۵ء ہے۔ میرے والد فریدالدین خان مرحوم کا ۳۰؍دسمبر ۱۹۲۹ء کو اس وقت انتقال ہو گیا جبکہ میری عمر صرف پانچ سال تھی۔ اس کے بعد میری پرورش اعظم گڑھ کے ایک روایتی مذہبی ماحول میں ہوئی۔ میرے حالات کا تقاضا تھا کہ میں ہر چیز کو تجسّس کی نگاہ سے دیکھوں۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ دین جو ''دور قدیم'' میں ایک ہزار سال تک انسانی افکار پر حکمراں تھا۔ دور جدید میں ہر لحاظ سے مغلوب ہو گیا، تو میرے اندر یہ جذبہ ابھرا کہ میں اس مسئلہ کی تحقیق کروں۔ میں نے باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔

مجھ کو بہت سے لوگ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میری باقاعدہ تعلیم تمام تر صرف عربی مدرسوں میں ہوئی ہے۔ عربی مدرسہ سے فراغت کے بعد میں نے بطور خود انگریزی سیکھی۔ بعد کے دور میں انگریزی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے طرزِ تحریر پر جدید اسلوب غالب آ گیا۔ اس سے لوگوں کو شبہ ہونے لگا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی تعلیمی اصطلاح میں میں تمام تر ایک ''مولوی'' ہوں۔

میرے اس تعلیمی اور فکری پس منظر نے اسلام کا کم از کم روایتی علم مجھے دیا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ دورِ جدید کی نسبت سے اسلام کو سمجھنے کے لئے وہ ناکافی تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں میں نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ ایک طرف میں نے جدید افکار کو براہ راست مآخذ سے جاننے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اسلام کو ازسرنو سمجھنے کے لئے قرآن وحدیث اور اس سے متعلق علوم کو پڑھنا شروع کیا۔ میری زندگی کے ابتدائی ۲۵ سال اگر درسی تعلیم میں گزرے تھے، تو اگلے ۲۵ سال اس تحقیقی مطالعہ میں صرف

ہو گئے۔ آج جب کہ میری عمر پچاس سال ہو چکی ہے، میں اس کتاب کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو گویا میری طویل تلاش کا جواب ہے۔ میں شاید نظریاتی چٹان کی سیڑھیاں کاٹ چکا تھا کہ میرے سامنے دوسرا پہاڑ آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ضرورت تھی کہ دریافت کردہ حقائق کی روشنی میں اسلام کی مہم کو عملی طور پر چلایا جائے۔

مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری طاقت ختم ہو گئی۔ ماضی کی شدید جدوجہد نے مجھے قبل از وقت بوڑھا بنا دیا۔ ''نظریاتی سیڑھیاں'' کاٹنے میں میں نے اپنی عمر تمام کر دی۔ اب ''عملی سیڑھیاں'' کس طرح کاٹوں۔ تاہم میرے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ میں نے سچائی کو کم از کم فکری طور پر دریافت کر لیا ہے۔ اب شاید میں یہ کہتے ہوئے مر سکتا ہوں کہ — ''میرے بعد آنے والے کو پچھلی سیڑھیاں نہیں بنانی پڑیں گی''۔

ستمبر ۱۹۷۵ء

(''الاسلام'' سے ماخوذ)

''اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آدمی یہاں اس طرح زندگی گزارے کہ اس کے دل میں کسی کے خلاف ذرا بھی نگیٹیو تھاٹ نہ ہو۔ وہ دنیا سے اس طرح چلا جائے کہ اس کا مائنڈ پوری طرح پازیٹیو مائنڈ ہو — اس دنیا کی یہی میری آخری دریافت ہے۔''

''زندگی میرے لیے اس دن کا انتظار ہے جب کہ رب العالمین براہِ راست طور پر انسان کے سامنے ظاہر ہوگا اور میں خوشی اور حیرت کے آنسوؤں کے ساتھ اس کا استقبال کروں گا۔''

# والد صاحب

## ڈاکٹر ظفرالاسلام خان، دہلی

میرے والد مولانا وحید الدین خاں مرحوم کی پیدائش یکم جنوری 1925ء اعظم گڑھ (مشرقی یوپی) کی تھی اور وہ چالیس سال قبل دہلی نظام الدین ویسٹ کالونی منتقل ہوئے۔ 96 سال میں بھی ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ وہ تمام سوالات کا حاضر جوابی سے جواب دیتے لیکن جسمانی طور پر اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو چکا تھا۔ انھیں بستی حضرت نظام الدین سے متصل پنج پیراں قبرستان میں ہماری والدہ کے پاس دفن کیا گیا۔ دادی مرحومہ بھی وہاں آسودۂ خواب ہیں۔

والد مرحوم کی قرآن پاک کی تفسیر تذکیر القرآن اور دیگر کتب بہت مقبول ہوئیں، لیکن سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت علم جدید کا چیلنج (جس کا نام بعد میں ''مذہب اور جدید چیلنج'' رکھا گیا) کو حاصل ہوئی۔ یہ 1966ء میں منظر عام پر آئی۔ جدید ذہن کے اسلام پر جو اعتراضات ہیں، اس کتاب میں ان کا سائنس اور نئے فلسفے کے حوالے سے مدلل جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کو اصل شہرت اس وقت ملی جب میں نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور یہ بہت سی عرب یونیورسٹیز میں پڑھائی جانے لگی۔ بعد ازاں اس کا ترکی، فارسی، انڈونیشین اور دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔

والد مرحوم کا کسی سے اختلاف نہیں تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں لڑائی کر کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور نہ ہی ترقی کر سکتے ہیں۔ اسی تناظر میں وہ آر ایس ایس کے لوگوں سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ ہمارے لوگ اور سیاستدان جذباتی ہو کر سوچتے ہیں۔ انھوں نے کسی کے الزامات کا برا نہیں مانا اور نہ ہی جواب دیا۔ وہ صرف اپنی بات کرتے۔ وہ جسے صحیح سمجھتے تھے وہی کہتے اور بیان کرتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جنھیں ہم اسلام کی دعوت اور پیغام دے رہے ہیں ان سے اچھے تعلقات استوار کریں، اگر کوئی مسئلہ ہے تو اسے فی الحال فراموش کر دیں۔ صبر کریں، کیوں کہ تناؤ کے ماحول میں دوسرا آپ کی بات کیسے سنے گا؟ والد مرحوم کا جاری کردہ مشہور زمانہ الرسالہ 1976ء سے اردو میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے، جب کہ اس کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔

# والد صاحب، ایک با اصول مربّی

ڈاکٹر فریدہ خانم

والد صاحب اپنی نوجوانی کے زمانے میں جماعت اسلامی کے افکار سے متاثر ہوئے تھے، اور آزادی کے بعد 1947 میں جماعت اسلامی سے جڑ گئے۔ اعظم گڑھ میں جماعت اسلامی کے حلقہ میں بطور ایک رکن کام کرتے رہے۔ انھوں نے جس مستعدی اور انہاک اور اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ جماعت کے مقامی کام کو چلایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع اعظم گڑھ کے افرادِ جماعت نے متفقہ طور پر والد صاحب کو ''ناظم ضلع'' منتخب کیا۔ اس وقت جماعت اسلامی کے کل ہند امیر مولانا ابو اللیث ندوی، اصلاحی تھے۔ ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ والد صاحب کو ناظم ضلع منتخب کیا گیا ہے تو انھوں کے کہا کہ ان کے اندر لکھنے کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے اس لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ انہیں جماعت اسلامی کے مرکزی شعبہ تصنیف و تالیف میں لے لیا جائے۔ چنانچہ ناظم ضلع منتخب ہونے کے فوراً بعد والد صاحب جماعت اسلامی کے مرکزی شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہو کر 1956 میں تصنیفی کام کرنے کے لئے رام پور چلے گئے۔ اس کے بعد ہم سب لوگ رام پور آ گئے۔ اس وقت میری عمر 5 سال تھی۔ ''بازار نصر اللہ خاں'' میں ہمارا کرایے کا ایک مکان تھا۔ یہاں ہم لوگ 6 سال تک مقیم رہے۔ اسی گھر میں 10 دسمبر 1959 کو ہمارے چھوٹے بھائی ''ثانی اثنین خان'' کی پیدائش ہوئی۔

بچیوں کا مدرسہ ''رام پور'' میں جماعت اسلامی کے زیر انتظام کھولا گیا تھا۔ مدرسہ کا کمپاؤنڈ کافی بڑا تھا، لیکن جس وقت ہم لوگوں کو داخل کیا گیا اس وقت وہاں صرف دو کمروں کی تعمیر ہوئی تھی۔ طالبات بھی بہت کم تھیں۔ استانیوں کے نام یاد نہیں البتہ ہیڈ مسٹریس کو لوگ ''آپا'' کہا کرتے تھے۔ میں اور میری بڑی بہن ''ام السلام'' ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ اس اسکول میں ہم لوگوں نے 5 ویں کلاس تک پڑھائی کی۔

سادہ زندگی اور اونچی سوچ (simple living and high thinking) کا اصول والد صاحب کی ذات پر مکمل طور پر apply ہوتا تھا۔ کھانا انتہائی سادہ کھاتے تھے۔ سال بھر گزر جاتے

تھے مگر گوشت گھر میں نہیں آتا تھا۔ ''طعام واحد'' کے اصول کے تحت صرف ایک سبزی پکتی تھی۔ ایک بار والد صاحب ایک مہینے کے لیے اعظم گڑھ جارہے تھے۔ گھر میں 2 ٹن بھنی ہوئی مکئی رکھ کر چلے گئے کہ یہی مہینہ بھر استعمال کرنا۔

والد صاحب انتہائی بااصول ہونے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا اعلیٰ سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ جماعت اسلامی کے دفتر میں سب سے پہلے داخل ہوتے اور سب سے آخر میں وہاں سے نکلتے۔ مزید یہ کہ دوپہر کو بھی انٹرول نہیں کرتے تھے۔ جب کہ تمام اسٹاف دوپہر کو لنچ کے لیے اور آرام کرنے کے لیے وقت نکالتے تھے۔ اسی حسنِ کارکردگی کی وجہ سے وہ جماعتِ اسلامی میں بہت مقبول تھے۔ ان کے مضامین لوگ بہت شوق سے پڑھتے۔ ''ماہنامہ زندگی'' کا شمارہ جب لوگوں کو ملتا تو سب سے پہلے اس میں والد صاحب کا مضمون پڑھتے، اس وجہ سے ان کی سخت زندگی بھی لوگوں کو قابل تقلید نظر آتی۔

ہماری ایک پڑوسن راشدہ آپا، جو کہ اس وقت بچیوں کے مدرسے میں عربی کی ٹیچر تھیں، اکثر ہمارے یہاں آتیں۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ ہم بھی ''طعام واحد'' اپنے گھر میں چلائیں گے۔ یہ اسلامی طریقہ بھی ہے اور بہت آسان بھی۔ انھوں نے شاید ایک ہی ہفتہ ایسا کیا۔ ان کے بھائی جوان کے ساتھ رہتے تھے، وہ طعام واحد سے پریشان ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ واحد کو نکالیے اب صرف طعام ہی طعام رہے گا۔

اسی طرح والد صاحب ہم تینوں بہنوں کو ہمیشہ سادہ کپڑا پہناتے۔ ایک بار ملیشیا (خاکی رنگ کا موٹا کھدر) کا ایک تھان لے آئے۔ اماں سے کہا کہ ان لوگوں کو چار چار جوڑا اس کا بنا دو۔ اماں کبھی ابا کی بات سے انکار نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے پسند نہ کرتے ہوئے بھی انھوں نے وہ سارے کپڑے ہم لوگوں کے لیے سی دیے۔ اب ہم لوگ روز وہی کپڑا پہنتے۔ یہاں تک کہ محلہ کی لڑکیاں ہم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگیں کہ یہ ان کا یونیفارم ہے۔ ایک بار والد صاحب اعظم گڑھ گئے ہوئے تھے تو والدہ نے بازار سے پاپلین کی چھینٹ کا ایک ایک جوڑا ہم لوگوں کے لیے خرید کر منگوایا، ہم لوگ اتنا زیادہ خوش ہوئے کہ جیسے عید کا چاند نکل آیا ہو۔ اس کپڑے کی پرنٹ کا نقش ابھی تک دماغ میں محفوظ ہے۔

ہم لوگوں کو کبھی کہیں گھومنے کے لیے نہیں جانے دیتے تھے۔ حتیٰ کہ 6 سالہ رامپور کے قیام کے

دوران ہم لوگ ایک بار بھی اپنے آبائی گھر نہیں گئے۔ شہر میں بھی کہیں گھومنے کے لیے جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف کام سے باہر نکل سکتے تھے۔

اس وقت والد صاحب کی اصولی زندگی کو ہم ظلم سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ ہم دیکھتے تھے کہ ہماری دوسری ہم عمر سہیلیاں ہر طرح کی تفریح کرتی ہیں۔ لیکن ہم لوگ Spartan زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ تفریح کا نام بھی غالباً والد صاحب کی ڈکشنری میں موجود نہ تھا۔ اب باشعور ہونے کے بعد ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دراصل والد صاحب کے بااصول (man of principle) ہونے کی قیمت تھی، جو ہم لوگ ادا کر رہے تھے۔ ان کے کہنے اور کرنے میں کوئی فرق نہ تھا۔ جس بات کی وہ دوسروں کو ترغیب دیتے تھے اس پر پوری شدت سے سب سے پہلے خود عمل کرتے اور گھر میں عمل کرواتے۔

ایک بار ہماری پڑوسی، راشدہ آپا کو آٹا چھاننے کے لیے چھلنی کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ عبدالحیٔ صاحب (ایڈیٹر الحسنات) کے گھر سے مانگ کر لادو۔ گھر بالکل قریب تھا۔ مگر مجھے شرارت سوجھی۔ عبدالحیٔ صاحب کے گھر گئے بغیر میں نے تھوڑی دیر کے بعد راشدہ آپا سے کہہ دیا کہ عبدالحیٔ صاحب کے گھر والوں نے چھلنی دینے سے انکار کر دیا کہ وہ روز روز مانگتی ہیں۔ عبدالحیٔ صاحب کا خاندان ایک شریف خاندان تھا۔ ان کے گھر والے محلہ والوں کا خیال رکھتے تھے۔ اس لیے راشدہ آپا کو یقین نہ آیا کہ انھوں نے ایسا کہا ہوگا۔ وہ خود ان کے گھر گئیں تو معلوم ہوا کہ سویرے سے ان کے پاس کوئی آیا ہی نہیں۔ یہ خبر والد صاحب تک پہنچ گئی کہ میں نے اس طرح سے خلافِ واقعہ بات کہی ہے۔ والد صاحب انتہائی غضب ناک ہوئے۔ انھوں نے مجھے مارا۔ اس واقعے کے بعد سے میں نے جھوٹ بولنے سے توبہ کر لی۔ اب کسی ضرورت پر بھی جھوٹ بولنا انتہائی مشکل لگتا ہے۔ اگر بروقت تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو شاید جھوٹ بولنے کی عادت اتنی پکی ہو جاتی کہ اس کو چھوڑنا مشکل ہو جاتا۔

والد صاحب چھوٹی سی چھوٹی غلطی کی بھی گرفت کرتے تھے۔ سزائیں بھی اپنی قسم آپ ہی ہوتی تھیں۔ اکثر سزا میں سو، سو رکعت نماز پڑھنی ہوتی، بڑی بہن کو میرے پاس بٹھا دیتے کہ تم گنتی کرتے رہنا۔ وہ اس قدر فرماں بردار تھیں کہ ایک رکعت بھی چھوڑنے نہیں دیتی تھیں۔ ایک بار اسی طرح میں روتی جاتی تھی، نماز پڑھتی جاتی تھی۔ اس دوران راشدہ آپا آ گئیں۔ انھوں نے پوچھا یہ کیا ماجرا

ہے، والدہ نے بتایا تو وہ بولیں — چچا میاں (وہ والد صاحب کو چچا میاں کہتی تھیں) تو زبردستی خشوع خضوع طاری کرتے ہیں۔

بڑے بھائی ظفرالاسلام خان (پیدائش 1948ء) پر پڑھائی کے لیے بہت سختی ہوتی تھی۔ ان کا بچپن نانا کے پاس گزرا تھا۔ نانا صاحب نے ان کی پڑھائی کے لیے مستقل ٹیوٹر بھی رکھا تھا مگر نانا کے بے حد لاڈ پیار کی وجہ سے ان کے بچپن کے قیمتی دس سال کھیل کود میں گزر گئے۔ ان کے اوپر کوئی سختی نہیں تھی۔ اس لیے وہ پڑھنے بہت کم جاتے تھے۔ جب وہ رام پور آئے تو ان کی پڑھائی پر بہت زور دیا گیا کیوں کہ وہ عمر کے لحاظ سے بہت پیچھے ہو گئے تھے۔ اس طرح اچانک سختی سے وہ بہت گھبرائے۔ لیکن غیر معمولی ذہین ہونے کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد اپنی کمی کی تلافی کرلی۔ ان کی یادداشت وہ تھی جس کو فوٹو گریفک میموری (photographic memory) کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے۔ ان کا داخلہ رامپور میں درسگاہ جماعت اسلامی میں کیا گیا تھا۔ ایک بار بھائی صاحب نے ابا کی کوئی کتاب ابا کی اجازت کے بغیر کسی دوست کو پڑھنے کے لیے دے دی۔ جب ابا کو معلوم ہوا تو وہ اتنا ناراض ہوئے کہ یہ سزا سنادی کہ جب تک کتاب نہ لاؤ گے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ وہ فوراً اپنے دوست کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ اتفاق کی بات تھی کہ دوست سفر پر چلے گئے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کل رات کو آئیں گے۔ 24 گھنٹہ بھائی صاحب نے ایک مسجد میں گزارے، دوسرے دن شام کو کتاب حاصل کر کے دوبارہ گھر میں داخل ہوئے۔ اس لمبی غیر حاضری پر والد اور والدہ دونوں بہت پریشان ہوئے۔ جب بھائی صاحب گھر میں داخل ہوئے تو والد نے ان کو گلے سے لگا لیا۔ حالاں کہ وہ کبھی بچوں سے محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ثانی اثنین جب چھوٹے تھے تو ''ابا ابا'' کرتے۔ پڑوس میں آواز جاتی، راشدہ آپا کہتیں کہ صرف ''ابا ابا'' کی آواز ثانی اثنین کی زبان سے سنائی دیتی ہے۔ ابا کی طرف سے کبھی ''بیٹے'' کی آواز سننے میں نہیں آتی۔

والد صاحب اپنی زندگی کو اس سے کہیں زیادہ قیمتی سمجھتے تھے کہ وہ بچوں کی تفریح کے لیے ایک منٹ بھی ضائع کریں۔ قریبی لوگ اعتراض کرتے کہ آپ بچوں کا کچھ خیال نہیں کرتے تو جواب دیتے کہ ''میری زندگی ایک حاصل شدہ زندگی ہے میں اپنی زندگی کے مختصر لمحات کو اس امید میں ضائع

نہیں کرسکتا کہ کل میرے بچے بڑے ہوکر دین کا کام کریں گے۔ بچوں کے سلسلے میں والد صاحب کا ایک خاص نظریہ تھا۔ وہ پدرانہ حقوق اور پدرانہ محبت میں فرق کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بچوں کی زندگی کی تعمیر کے لیے انہیں وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو باپ ہونے کا تقاضا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بچوں کی تعلیم اوران کی حقیقی مادی ضرورت میں کبھی کمی نہیں کی۔ چنانچہ ہماری ایک بہن کو چھوڑ کر تمام بھائی بہنوں نے خدا کے فضل سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ البتہ پدرانہ محبت کے معاملہ میں ان کا رویہ عام باپ سے مختلف تھا۔ عام باپ اپنے بیٹے کے حق میں ''محبت برائے محبت'' کے قائل ہوتے ہیں۔ مگراس معاملے میں والد صاحب کا نظریہ ''محبت برائے دین'' تھا۔ اولاد اگر دین کے راستے چلے تو وہ تمام محبت کرنے والوں سے زیادہ محبت کرنے والے تھے۔ مگر بے دین اولاد سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگرچہ والد صاحب کی کوششوں اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے ایسا نہیں ہوا کہ ان کی کوئی اولاد بے دین ہوجائے۔

والد صاحب نے جس طرح اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لیے وقف کردیا تھا اس کا جزئی اندازہ ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے ایک بار ہومیوپیتھک ڈاکٹر وکیل احمد صاحب (رامپور) کی بیوی نے والد صاحب کو کہیں راستہ میں چلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد جب والدہ سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگیں کہ آج ہم نے وحید بھائی کو دیکھا، بالکل جیسے ''مجنون''۔ والد صاحب کو نہ وقت پر بال کٹوانا یاد رہتا، نہ کنگھی کرنا۔ ہر وقت سوچ میں غرق رہتے۔ کبھی وہ اپنے دماغ کو خدا کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتے تھے۔ جب کسی سے بات کرتے تو صرف دینی بات کرتے۔ کبھی میں نے فضول قسم کی باتیں کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کافی وقت مطالعہ میں گزارتے۔ جو بھی کوئی والد صاحب کی صحبت میں آتا اس کو زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے۔

رامپور کے 6 سالہ قیام کے دوران ایک ملازم بھی نہیں رکھا گیا۔ ہم سب بھائی بہن اتنے بڑے نہیں تھے کہ کسی کام میں والدہ کا ہاتھ بٹاسکیں۔ والدہ سارا دن کام کرتی رہتی، دوپہر کو بھی آرام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ان کے میکہ میں صرف گھر کا کام کرنے کے لیے کئی ملازمین مستقل رہتے تھے۔ اس لیے انہیں محنت کا کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ ایک بار والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو انھوں نے چاہا کہ کوئی عورت کام کرنے کے لیے رکھ لی جائے مگر والد صاحب راضی نہیں

ہوئے۔ کہا کہ ملازم رکھنے سے بہتر ہے کہ تم تسبیح فاطمہ پڑھ لیا کرو۔ کم از کم میرے علم میں ایسا کوئی کیس نہیں کہ جس میں تسبیح فاطمہ پر اس کے لٹرل معنی میں عمل کیا گیا ہو۔

رامپور میں والد صاحب کو جماعتِ اسلامی کے مکمل لٹریچر کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ روزانہ صبح فجر کی نماز کے بعد فوراً ناشتہ کرتے۔ والدہ تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد ناشتہ تیار کر دیا کرتیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد والد صاحب جماعت اسلامی کے دفتر چلے جاتے سارا دن لکھنے پڑھنے میں گزارتے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بھی گھر نہیں آتے تھے۔ چونکہ والد صاحب کی صحت بہت اچھی تھی اس لیے عام دنوں میں تو صحت پر مسلسل دماغی محنت کا اثر نہیں پڑا۔ لیکن وہ رمضان کے دنوں میں بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ ان کو رمضان میں اپنے اوقات میں تبدیلی کرنا چاہیے تھا، یعنی کم از کم دوپہر کو ایک یا دو گھنٹے وہ آرام کرتے۔ آرام نہ کرنے کی وجہ سے رمضان کے مہینے میں جو کمزوری آئی، اس کو جسم make up نہ کر سکا۔ اس کے بعد ہر سال رمضان میں جو کمزوری آتی وہ باقی رہتی۔ اس طرح علم کے شوق میں جسم کے حقوق نظر انداز کر دیے گئے۔ اس کا اثر بعد میں ظاہر ہوا۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد والد صاحب کو یہ احساس ہوا کہ جماعتِ اسلامی کا مشن قرآن کی آیتوں سے ثابت نہیں ہوتا۔ یہ احساس مزید مطالعہ کے ساتھ بڑھتا گیا۔ پھر والد صاحب نے 1962ء میں جماعت اسلامی سے استعفیٰ دے دیا۔

جماعتِ اسلامی سے تعلق ختم ہونے کے بعد رام پور سے والد صاحب ہم سب لوگوں کو لے کر واپس بڈھریا (اعظم گڑھ) چلے گئے۔ ہم لوگ گاؤں میں رہتے تھے۔ والد صاحب اپنے بڑے بھائی عبد العزیز خاں کے پاس شہر چلے جاتے۔ وہاں دن بھر دار المصنفین کی لائبریری میں گزارتے۔ اس زمانہ میں ہم لوگوں سے کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ والد صاحب ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ ایک دو دن کے لیے گاؤں آتے پھر واپس شہر چلے جاتے۔ میں تقریباً 11-10 سال کی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی رات کو چھت پر لے جاتے اور ستاروں کو دکھا کر ان کے بارے میں کچھ بتاتے تھے۔ گاؤں میں آسمان ستاروں سے جگمگاتا تھا۔ ستاروں کا ایک مجموعہ ثریا جو سات ستاروں سے مل کر بنتا تھا، اس کو بھی دکھا کر کچھ بتاتے تھے جو کہ اب یاد نہیں۔ رات کو گاؤں

میں اس وقت لائٹ نہیں تھی۔اس لیے والد صاحب دن ہی کو پڑھتے لکھتے تھے۔

جلد ہی بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) نے 1963 میں والد صاحب کو ندوہ لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔مولانا status quoist اتنے زیادہ تھے کہ کسی نئے کام کا initiative آسانی سے نہیں لیتے تھے۔دادی نے بتایا تھا کہ ایک بار جب مدرسۃ الاصلاح میں پڑھتے تھے تو ہاسٹل کا کمرہ بدلا گیا تھا۔اس وقت 13-12 سال کی عمر رہی ہوگی تو وہاں سے روتے ہوئے آئے کہ اب میں پڑھنے نہیں جاؤں گا، میرا کمرہ بدل دیا ہے۔پھر دادی نے سمجھا بجھا کر دوبارہ واپس بھیجا۔

بہرحال اماں کے اصرار پر وہ لکھنؤ روانہ ہوئے۔اور ندوہ کے ادارہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے وابستہ ہوئے۔ وہاں والد صاحب کو اسٹڈی کرنے کا اور وہاں کے اساتذہ سے دینی موضوعات پر ڈسکشن کرنے کا بہت زیادہ موقع ملا۔ وہاں کے کتب خانہ میں بہت قیمتی کتابیں تھیں۔وہیں پر مذہب اور جدید چیلنج کی تھیم دماغ میں آئی اور اس پر انھوں نے کام کرنا شروع کیا۔ وہاں ندوہ کے طلبا بھی ملنے کے لیے آتے۔والد صاحب ہمیشہ علمی باتوں پر ہی گفتگو کرتے تھے۔ذہین طلبا وہاں برابر ملنے آتے تھے۔ایک بات جو مجھے یاد ہے کہ والد صاحب وہاں لوگوں کو انگریزی زبان اور جدید علوم حاصل کرنے پر بہت زور دیتے تھے۔

والد صاحب کے لکھنؤ جانے سے پہلے مدرسہ کے طلبہ صرف روایتی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ مدرسہ کا ماحول جدید تعلیم حاصل کرنے کو discourage کرتا تھا۔جدید علوم حاصل کرنا taboo تھا۔مگر یہ والد صاحب کی ترغیب تھی کہ ندوہ کے کئی ذہین طلبہ نے وہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا اور اپنی تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹیوں میں اونچے عہدوں پر اپنی خدمات انجام دیں۔ پروفیسر حمید اللہ ندوی اس زمانہ میں ندوہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ان کو انگریزی تعلیم کا شوق دلایا۔ پھر انھوں نے یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کی اور برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال میں ان کا عربی ڈپارٹمنٹ میں تقرر ہوا۔وہاں سے وہ پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے۔اسی طرح پروفیسر شفیق احمد خاں بھی اسی زمانہ میں ندوہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ والد صاحب سے متاثر ہو کر انھوں نے جامعہ میں داخلہ لیا اور عربی ڈپارٹمنٹ سے پی ایچ ڈی کر کے جامعہ میں عربی کے پروفیسر اور ہیڈ ہو کر ریٹائر ہوئے۔دھیرے دھیرے باقاعدہ لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔

میں نے بھی باقاعدہ انگریزی تعلیم والد صاحب کی وجہ سے حاصل کی۔ میں نے پری یونیورسٹی کا امتحان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1970 میں پاس کیا تھا۔ فارسی میں میری ڈسٹنکشن آئی تھی لہذا میں نے دہلی کالج میں فارسی آنرز میں داخلہ لے لیا۔ والد صاحب نے جب یہ خبر سنی تو مجھے فوراً دوبارہ کالج واپس یہ کہہ کر بھیجا کہ فارسی پڑھ کر کیا کروگی، جا کر انگریزی میں داخلہ لو۔ گرمی کا دن تھا، دوپہر کا وقت تھا، اسی وقت میں کالج واپس گئی اور وہاں ایک ہیڈ کلرک، مبارک صاحب کی کوششوں سے مجھے انگلش آنرز میں داخلہ مل گیا۔ بعد میں میں نے ایم اے انگلش بھی دہلی یونیورسٹی سے کیا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ اگر بروقت مجھے والد صاحب کی رہنمائی نہ ملی ہوتی تو میں مشن میں اپنا حصہ ادا نہیں کر سکتی تھی۔

والد صاحب جو مطالعہ کرتے تھے اس کو لوگوں سے share کرتے، ڈسکشن کرتے۔ اگر کوئی تنقید کرتا تو بہت ہی سنجیدگی سے اس کو سنتے، برا مانے بغیر۔ پھر اس پر غور کرتے کہ فلاں شخص نے ایسا کیوں کہا۔ مثال کے طور پر کسی نے ایک بار کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخ سے نکال دیا جائے تو تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔ یہ واقعہ اس بات کو بہت اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ تنقید ان کو مزید نئے اینگل سے سوچنے کا موقع فراہم کرتی تھی۔ اس طرح وہ غصہ ہوئے بغیر یہ سوچتے رہے کہ آخر اس شخص نے ایسا کیوں کہا اور ہم کس طرح تشفی بخش جواب اس کو دے سکتے ہیں۔ کئی کئی بار کسی پائنٹ کو، کسی حدیث کو یا کسی آیت کو لے کر سالوں سوچتے رہتے تھے۔ اسی طرح مذکورہ بالا سوال پر بہت عرصہ تک سوچنے کے بعد انھوں نے 'اسلام: دورِ جدید کا خالق' کتاب تیار کی۔ والد صاحب سے ہی میں نے یہ سمجھا کہ تنقید سے غصہ ہونے میں ہمارا اپنا نقصان ہے۔ تنقید ہمارے لیے ایک چیلنج کا کام کرتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کا کوئی اینگل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، تنقید ہماری توجہ اس طرف مبذول کرتی ہے اور ہماری سوچ کے دائرہ میں وسعت آتی ہے۔ جو لوگ تنقید کو برداشت نہیں کرتے وہ ہمیشہ ایک ہی دائرہ میں گھومتے رہتے ہیں۔ ان کا انٹلیکچول ڈولپمنٹ نہیں ہو پاتا ہے۔

ہم لوگ بھی 1964 میں لکھنؤ میں تھے۔ مئی 1964 میں جب سابق پرائم منسٹر جواہر لال نہرو کی

وفات ہوئی تو ان کی Ashes ندیوں میں بہائی گئی تھیں۔ گومتی ندی جو ندوہ کے کنارے بہتی تھی، وہاں بھی راکھ ہیلی کاپٹر سے بہائی گئی۔ اسی کے ساتھ گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیاں بھی دریا میں ڈالی گئی تھیں۔ ابھی تک وہ منظر مجھے یاد ہے۔

یہ سارا دور والد صاحب کی تیاری کا دور تھا۔ وہاں ایک لائبریری تھی 'آچاریہ نریندر دیو لائبریری'۔ حضرت گنج لکھنؤ میں واقع تھی۔ وہاں پر والد صاحب برابر اسٹڈی کے لیے جاتے تھے۔ ہر سبجکٹ پر کتابیں پڑھتے تھے۔ والد صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ میں نے پامسٹری سے لے کر اسٹرانمی تک ہر سبجیکٹ کی study کی ہے۔

مولانا ندوہ میں 3 سال رہے۔ ندوہ چھوڑنے کے بعد پھر واپس اعظم گڑھ چلے گئے۔ جلد ہی جون 1967 میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر 24 جون 1967 کو نئی دہلی آئے اور جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان الجمعیۃ جمعہ ایڈیشن کے ایڈیٹر کے طور پر کام شروع کیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم لوگ بھی دلی آگئے اور یہاں سب بھائی بہن تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ والد صاحب ڈسٹریکشن سے اتنا زیادہ دور رہتے تھے کہ وہ اپنے پاس کبھی پیسہ نہیں رکھتے تھے۔ اماں گھر کی باس تھیں۔ ہم سب لوگ مل کر گھر چلاتے تھے۔

پرفکشنسٹ اتنے زیادہ تھے کہ وہ اپنا کام کسی سے نہیں کراتے تھے۔ پروف ریڈنگ بھی خود ہی کرتے تھے۔ جمعیۃ علماء کی طرف سے ان کو اسسٹنٹ دیا گیا تھا مگر انھوں نے جلد ہی اسسٹنٹ کو رخصت کر دیا۔ الجمعیۃ کا جو زمانہ تھا اس میں والد صاحب نے سب سے زیادہ ملی تعمیر پر زور دیا۔ مسلمانوں کے اندر اصلاح کا جذبہ ابھارنا ان کے اندر قومی شعور پیدا کرنا، ملی زندگی کی تعمیر کے لیے کیا کرنا ہے، حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پیدا کرنا، زمانہ کو سمجھ کر اس کی قوتوں کو اپنی تعمیری جدوجہد کے لیے استعمال کرنا، ان سب پر زیادہ فوکس تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے، مسلمانوں کے جان ومال کا بہت زیادہ نقصان ہو رہا تھا۔ اس لیے والد صاحب نے اپنی تحریر و تقریر اور زبانی بات چیت کے ذریعہ لوگوں کو بہت زیادہ متوجہ کیا کہ وقت کی ضرورت ہے کہ اعراض، حکمت اور پلاننگ کے ساتھ زندگی کے میدان میں قدم رکھا جائے۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو اسلامی اصولوں پر چلنے سے حل نہ کیا ہو سکتا ہو۔ حقیقی

مثالوں سے لوگوں کے سامنے ان باتوں کو پیش کیا۔ الجمعیۃ اس زمانہ کا سب سے زیادہ مقبول ہفت روزہ بن گیا۔ بے شمار لوگوں نے ان اصولوں کے ذریعہ اپنی زندگی اور سماج کے مسائل کو حل کیا۔ لیکن الجمعیۃ کی مقبولیت کچھ لوگوں کو پسند نہیں آئی اور بلا کسی سبب الجمعیۃ کو اچانک بند کر دیا گیا۔ وقتی طور پر پریشانی ہوئی۔ مگر یہ بلیسنگ اِن ڈسگائس کا معاملہ ثابت ہوا۔

الجمعیۃ بند ہونے کے بعد حالات اتنے خراب ہو گئے کہ والد صاحب نے پھر اعظم گڑھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ہمارے بڑے بھائی ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اس وقت جامعۃ الازہر، قاہرہ میں اپنی پڑھائی مکمل کر چکے تھے اور ان کو ایک جاب مل گیا تھا۔ انھوں نے خط لکھا کہ آپ لوگ بڈھریا نہ جائیں، میں اخراجات کا بندوبست کروں گا۔ انھوں نے نہ صرف گھر کے اخراجات کی ذمہ داری لی، بلکہ الرسالہ کا initial سرمایہ بھی دیا۔ اس طرح ہم لوگوں کی پڑھائی جاری رہی۔

اس دوران والد صاحب نے الاسلام لکھی۔ الاسلام کی طباعت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ لہذا کتاب مکمل ہونے کے بعد الماری میں رکھ دی گئی تھی۔ جب بھائی صاحب دلی آئے اور انھوں نے کتاب پڑھی تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور اس کو شائع ہونے کے لیے پریس میں دے دیا۔ اس کے انگریزی ترجمہ کے لیے بھی انھوں نے انگریزی کے ایک استاد سے بات کی اور 10 ہزار روپیے اس کے ترجمے کے لیے ان کو دئے۔ 50 سال پہلے دس ہزار روپیے کی بہت قیمت تھی۔ لیکن انھوں نے اچھا ترجمہ نہیں کیا۔ لہذا اُس وقت وہ ترجمہ شائع نہ ہو سکا۔ کافی تاخیر سے اس کا انگریزی ترجمہ میں نے تیار کیا، جو اس عنوان The Vision of Islam کے ساتھ 2014 میں گڈ ورڈ بکس، نئی دہلی سے شائع ہوا۔

1976 میں والد صاحب نے بہت زیادہ غور وفکر اور مشورہ کے بعد الرسالہ نکالا۔ الرسالہ کا ٹائٹل بڑے بھائی ڈاکٹر ظفر الاسلام نے منتخب کیا تھا۔ ماہنامہ الرسالہ کا پہلا شمارہ اکتوبر 1976 میں شائع ہوا۔ الرسالہ کے مضامین مختصر ہوتے تھے، عام طور پر ایک ہی صفحہ پر مضمون ختم ہو جاتا تھا۔ یہ چیز لوگوں کو بہت پسند آئی۔ ایک صفحہ پڑھ کر کوئی حکمت کی بات مل جاتی تھی۔ لمبے لمبے مضامین کے بارے میں لوگوں کی سوچ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ جب فرصت ملے گی تو پڑھیں گے۔

میں 1976 میں ایم اے کا امتحان دے چکی تھی۔ جب کہ ثانی اثنین ابھی اسکول ہی میں پڑھ

رہے تھے۔ لہذا دفتر کا کام میں نے سنبھالا۔ باقی کام ثانی اثنین کرتے، الرسالہ کو چھپوانا، پوسٹ کرنا وغیرہ۔ ابتدا میں کم آرڈر آتے تھے۔ کبھی کوئی بڑا آرڈر آتا تو ہم بہت خوش ہوتے۔ والد صاحب مستقل طور پر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔

الجمعیۃ کے زمانہ میں والد صاحب مسلمانوں کے ملی مسائل پر کافی لکھتے تھے۔ وہ پلیٹ فارم ہی ملی مسائل کا تھا۔ لیکن الرسالہ کے نکلنے کے بعد بالکل آزادانہ طریقہ سے کام کرنے کا موقع ملا۔ اب دعوت الی اللہ پر زور دینا شروع کیا۔ دعوت الی اللہ کا کانسپٹ بالکل شروع ہی سے والد صاحب کے اوپر واضح تھا۔ اس کو آپ ''قرآن کا مطلوب انسان'' کتاب میں دیکھ سکتے ہیں، جو کہ 1955 سے لے کر 1963 تک جماعت اسلامی ہند کے مختلف اجتماعات میں کی گئی تقریروں پر مشتمل ہے۔ لیکن الرسالہ کے ذریعہ پہلی بار مکمل آزادی سے پیغام دینے کا موقع ملا۔

والد صاحب نے سب سے پہلے جماعت اسلامی، اس کے بعد ندوۃ العلماء اور جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم پر کام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کہیں بھی آزادانہ ماحول نہ تھا۔ والد صاحب سے میں نے اس بارے میں پوچھا تھا تو انھوں نے کہا کہ میں اپنے دعوتی کام کے لیے پلیٹ فارم تلاش کر رہا تھا۔ لیکن کہیں بھی مکمل آزادی نہیں تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ جہاں کسی اکابر پر تنقید ہو جاتی تو اس حلقہ کے لوگ سخت ناپسند کرتے۔ جب کہ تنقید کے بغیر بات میں کلیرٹی (clarity) نہیں آتی۔ مثال کے طور پر الجمعیۃ میں ایک بار ایک مضمون میں لکھ دیا کہ مولانا محمود حسن کی ریشمی رومال تحریک ایک جذباتی تحریک تھی۔ اس پر بہت سے لوگ ناراض ہو گئے۔ مولانا اسعد مدنی نے ان کو ٹھنڈا کیا۔

مسلمانوں میں کام کرنے کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ کسی کے خلاف تنقید نہیں کی جاسکتی۔ پرانی پلاننگ کی غلطی واضح کیے بغیر نئی پلاننگ کیسے کی جاسکتی ہے۔ لیکن اکابر پرستی اتنی گہرائی سے پیوست ہو چکی ہے کہ لوگوں کو اپنے اکابر پر تنقید برداشت نہیں۔ اسی وجہ سے مسلم ادارے ذہین افراد کو ویلکم نہیں کرتے۔ ندوہ سے علیحدگی کی بعد کچھ لوگوں نے وہاں کے اعلی منتظمین سے بات کی کہ مولانا کو دوبارہ ندوہ بلایا جائے۔ مگر وہاں کے منتظم اعلی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ہم شیر سے کام نہیں لے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم اداروں میں بس بلڈنگیں ہیں، کوئی قابلِ ذکر کام کہیں نہیں ہو رہا ہے۔

عام طور پر تو گھر کے کام ہم لوگ خود ہی کرتے تھے لیکن کچھ کام ایسے ہوتے کہ ہمیں والد صاحب

کی مدد لینی پڑتی تو وہ فوراً تیار ہو جاتے۔ مثال کے طور پر میں پی ایچ ڈی پروفیسر مشیر الحق صاحب کے انڈر میں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس وقت ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ اور غالباً فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔ ان کی مشغولیات کی بنا پر مجھے لگ رہا تھا وہ منظور نہیں کریں گے۔

والد صاحب جب ندوہ میں تھے تو مشیر الحق صاحب بھی وہاں ایک ادارہ میں کام کرتے تھے۔ وہاں ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ لہذا والد صاحب مجھے لے کر ان کے پاس گئے۔ والد صاحب کے کہنے پر انھوں نے مجھے اپنے انڈر میں لینا منظور کر لیا۔

الرسالہ کا کام جب کچھ بڑھا تو ہم نے کالج کی دو اسٹوڈنٹس قیصر، شاہ جہاں کو پارٹ ٹائم کے لیے رکھا۔ پھر ہم 3 لوگ الرسالہ کا کام کرنے لگے۔ جب تک جمعیۃ بلڈنگ میں رہے، 1982 یا 1983 تک، تب تک اسی طرح کام چلتا رہا۔ نظام الدین آنے کے بعد پھر ثانی اثنین نے دفتر کا نظام سنبھالا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ لائٹ چلی گئی۔ دور دور تک اندھیرا ہو گیا۔ قیصر اور شاہ جہاں جو کہ دونوں بہنیں تھیں اپنے گھر اندھیرے میں نہیں جا سکتی تھیں۔ تو والد صاحب نے لالٹین لے کر ان کو فراشخانہ پہنچایا جو کہ 15-20 منٹ کا راستہ تھا۔ یہ واقعہ آج بھی مجھے یاد آتا ہے کہ کس قدر modesty تھی ان کے اندر کہ کسی کام کو چھوٹا کام نہیں سمجھتے تھے۔ ان دونوں بہنوں کی شادی پاکستان میں حیدرآباد سندھ میں ہو گئی تھی۔ شاہجہاں کا انتقال ہو چکا ہے۔ قیصر ابھی بھی touch میں ہیں۔

رات کو کبھی میری آنکھ کھلتی تو اکثر میں دیکھتی کہ والد صاحب کے کمرے میں لائٹ جل رہی ہے۔ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اصل میں وہ مسلسل سوچتے رہتے تھے۔ جب بھی کوئی ایسا خیال دماغ میں آیا جس کے لیے کسی ریفرنس کی ضرورت ہوتی تو اسی وقت اٹھ کر کتابوں کو دیکھتے تھے۔ کیونکہ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ دماغ سے بات نکل جاتی ہے۔

والد صاحب simple living high thinking کی مکمل مثال تھے۔ جہاں تک کھانے پینے کا تعلق ہے، کبھی نہیں کہا کہ کھانا ٹھیک نہیں بنا ہے۔ جو بھی کھانا ہوتا اس کو خدا کا نام لے کر شوق سے کھاتے۔ نہ کبھی یہ کہا کہ آج فلاں چیز پکاؤ۔ کبھی روٹی وغیرہ بچ جاتی تو بہت زیادہ پریشان ہو جاتے۔ کہتے کہ یہ باسی روٹی مجھے ناشتہ میں دے دو، تازی روٹی نہیں پکانا۔ بہت سختی سے کہتے کہ کھانے کا ایک دانہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کھانا پانی خدا کی بڑی نعمت ہے۔

کہیں جانا ہوتا تو پیدل جاتے۔ ایک ایک گھنٹہ کا سفر پیدل کرتے تھے۔ پیدل ہی چل رہے تھے جب بجلی لگنے کا واقعہ ہوا۔ پہلے سڑکوں پر کافی گڈھے ہوتے تھے۔ بارش کی وجہ سے کسی گڑھے میں پانی بھر گیا تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے، رات کا وقت تھا، سمجھ میں نہیں آیا گڈھے میں پاؤں چلا گیا۔ وہاں پر جنکشن باکس کا کھمبا تھا، اندھیرے میں جب گرنے لگے تو اسی کھمبے کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مجھے جو بات عجیب لگتی ہے وہ یہ کہ جب بجلی لگی ہوئی تھی اس وقت بھی پریشان نہیں تھے بلکہ یہ سوچ رہے تھے کہ ابھی تذکیر القرآن ختم نہیں ہوئی اور میرا آخری وقت آ گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے: الرسالہ اکتوبر، 1983، بعنوان: دوبارہ زمین پر)۔

میں نے والد صاحب کو کبھی پریشان نہیں دیکھا۔ لوگوں نے بہت زیادہ ستایا لیکن بس وہ یہ سوچتے تھے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ ان کی سوچنے کی طاقت میں آخر وقت تک کمی نہیں آئی تھی۔ لوگوں نے ان کے خلاف مضامین لکھے، کتابیں لکھیں۔ ان باتوں سے کبھی پریشان نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ ان میں بے دلیل تنقیدیں ہوتی تھیں۔ اس قسم کی کتابیں ان کی کتابوں کی الماری میں رکھی ہوئی ہوتیں۔ لیکن وہ اس کا جواب نہیں دیتے تھے۔ بلا دلیل تنقید کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ اردو داں طبقہ بلا دلیل باتوں کو تنقید سمجھتا ہے۔ یہ ہماری قوم کا بہت بڑا المیہ ہے۔

یہ بہت عجیب بات ہے کہ انگریزی الرسالہ کے ریڈرس نے کبھی تنقیدی خطوط نہیں لکھے جب کہ اردو ریڈرس کے ایسے خط روز ہی موصول ہوتے تھے۔ اردو طبقہ اختلاف کو برداشت نہیں کرتا۔ جب کہ انگریزی داں طبقہ کا یہ مسئلہ ہی نہیں۔ انگریزی میں بادلیل تنقید کو بڑا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ رائٹرس کے اندر creativity ہے۔ میں نے انگلش میں ایم اے کیا تو اس میں باقاعدہ ایک پیپر تنقید (criticism) پر تھا۔ بڑے بڑے رائٹرس کی کتابوں پر جب تک کوئی بڑا تنقید نگار اپنا تبصرہ لکھ کر شائع نہیں کرتا، وہ مارکیٹ میں نہیں آتی۔

نہ صرف یہ کہ وہ لوگ تنقید کے بارے میں sensitive نہیں ہیں بلکہ وہ تنقید کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ کسی بھی قوم یا فرد کی ترقی اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ ہم ماضی کی غلطیوں کو دہراتے رہیں گے۔

الرسالہ کے مختلف شماروں میں والد صاحب نے بہت وضاحت کے ساتھ بتایا کہ ان کا مشن اسلام کو مسلمانوں کے لیے rediscovery بنانا ہے اور غیر مسلموں کے لیے ڈسکوری بنانا ہے۔

غیر مسلموں سے تعلقات بڑھانا اور ان کو اسلام کا پیغام پہنچانا مسلمانوں کا اولین فریضہ ہے۔

الرسالہ بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کتابیں برابر شائع ہوتی رہیں۔ پرانی دلی میں جمعیۃ بلڈنگ کافی انٹیریر (interior) میں تھی۔ وہ جگہ آسانی سے accessible نہیں تھی۔ لیکن نظام الدین ویسٹ آنے کے بعد لوگوں سے ملاقات کی بہت آسانی ہو گئی۔

نظام الدین دہلی کا ایک سنٹرل لوکیشن ہے۔ یہاں آنے کے بعد کافی پروگرام میں جانے کا موقع ملا۔ ہر پروگرام کا مولانا صاحب سفرنامہ لکھتے تھے۔ جن میں سے اکثر الرسالہ میں اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ بیرونِ ہند اسفار نے الرسالہ کی عمومی اشاعت میں بہت زیادہ مدد کی۔ ان سفروں کے ذریعہ بے شمار تجربات ہوئے جو کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتے تھے۔ مشن کو پھیلانے میں یہ اسفار بہت معاون ثابت ہوئے۔

بعد کے دور میں والد صاحب اپنے ساتھ ہم لوگوں کو بھی لے جاتے تھے —— رجت ملہوترا، نغمہ صدیقی، پریا ملک، ساجد صاحب، استتی ملہوترا، خرم قریشی وغیرہ۔ سفر میں کئی دن کا ساتھ ہوتا، اس سے ٹیم کی زبردست ٹریننگ ہوئی۔

سی پی ایس کا قیام 2001 میں عمل میں آیا۔ سی پی ایس میں کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شامل ہوئے۔ مثال کے طور پر پریا ملک، رجت ملہوترا، نغمہ صدیقی، نودیپ کپور، وغیرہ۔ یہ لوگ اور ان کے ساتھی برابر سنیچر اور اتوار کی کلاس میں شامل ہوتے۔ اس میں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے۔ ثانی اثنین کی صاحبزادی سعدیہ خان، صوفیہ خان اور ماریہ خان اور مسلمہ صدیقی کی صاحبزادی راضیہ صدیقی، اور صاحبزادے رامش صدیقی۔ یہ لوگ اور ان کے ساتھی اور کلاس میٹ اکثر کلاس میں آتے۔ یہ سب لوگ انگلش اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ لہذا وہ اسلام کو اپنے انٹلیکچول لیول پر سمجھنا چاہتے تھے۔ والد صاحب ان کے سوالات کا جواب دیتے۔ جو لوگ سی پی ایس کی اسپریچول کلاس میں برابر شریک ہوتے تھے ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے مولانا کو کتابوں سے اتنا نہیں سمجھا تھا جتنا ان اسپریچول کلاس سے سمجھا۔

پہلے یہ لوگ ڈائری پر سارے points کو نوٹ کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ڈاکٹر نغمہ صدیقی کلاس میں آئیں تو انھوں نے لیپ ٹاپ پر سب کچھ ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ اس طرح ساری باتیں دوسروں کو forward کرنے میں بہت آسانی ہو گئی۔

جلد ہی بعد ثانی اثنین اور دوسرے سی پی ایس ممبرس نے مل کر باقاعدہ اسٹوڈیو بنایا اور والد صاحب کے سارے پروگرام کی ویڈیو ریکارڈنگ ہونے لگی۔ جو کہ آج فیس بک اور یوٹیوب پر دستیاب ہیں۔

اس طرح آج ایک بہت مضبوط ٹیم تیار ہو چکی ہے، جس میں علماء بھی ہیں اور ماڈرن اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی۔ ان کے اندر معرفت، خدارخی سوچ اور دعوہ ورک کا بھرپور جذبہ موجود ہے۔ ہندستان اور ہندستان کے باہر مختلف سی پی ایس سنٹر بنے اور پوری دنیا میں دعوہ ورک ہونے لگا۔ جب قرآن کا انگریزی ترجمہ اور ہندی ترجمہ شائع ہوا تو دعوہ ورک کافی بڑھ گیا۔ ٹیم کے لوگ ہر پروگرام میں جاتے اور وہاں قرآن کا ڈسٹری بیوشن کرتے۔ قرآن ڈسٹریبیوشن کا ایک طریقہ اور بھی اختیار کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ سی پی ایس انٹرنیشنل کی ویب سائٹ پر دنیا کے کسی بھی کونے سے آ کر کوئی بھی شخص قرآن کے لیے ایک ریکویسٹ ڈال سکتا ہے۔ اس کو مقامی ٹیم کے ذریعہ یا بذریعہ ڈاک اس کی اپنی زبان میں قرآن کا ترجمہ بھیج دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین نے بہت محنت سے قرآن کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں subsidized ریٹ میں دستیاب کیا۔ فی الحال 40 زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے، مزید تراجم کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ نوبل انعام یافتہ ایچ۔ اے۔ کریبز (H.A.Krebs) نے اعلیٰ سائنس دانوں کی زندگی کا مطالعہ کیا تو اس نے کہا:

"سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک عظیم استاد یا سائنس داں اپنے شاگرد کے ذہن میں حقائق کے بارے میں معلومات سے کہیں زیادہ ایک ذہنی رویہ (attitude) منتقل کرتا ہے... اس ذہنی رویہ میں دو باتیں بالخصوص بہت اہم ہیں۔ ایک عجز (humility) اور دوسرا شوق (enthusiasm)۔"

والد صاحب نے اپنی تمام زندگی مذہبی اعتبار سے یہی کوشش کی۔ اس کو اس کتاب میں موجود تاثرات سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ سب چیزیں جب میں دیکھتی ہوں تو مجھے اللہ کی خصوصی مدد کا احساس ہوتا ہے اور والد صاحب کے جانے کے بعد ایک بڑی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ والد صاحب کہتے تھے کہ میں ٹیم کے لیے بہت زیادہ دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ والد صاحب کی دعاؤں کو قبول فرمائے، ہماری خوب خوب مدد فرمائے تاکہ ہم لوگ والد صاحب کے expectations پر پورے اتریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جنت کے ریوارڈ کے مستحق ٹھہریں۔

# مولانا وحید الدین خاں

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، ڈین آف کیمبرج اسلامک کالج

ابھی خبر ملی کہ آج (بروز چہار شنبہ 9 رمضان المبارک 1442ھ مطابق 21 اپریل 2021) ہندوستان کے معروف اسلامی مفکر و مصنف مولانا وحید الدین خان کا 96 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا، کئی دہائیوں سے برصغیر میں ان کی انفرادیت مسلم تھی، وہ تقلید، قدامت پسندی اور اکابر پرستی سے دور تھے، مجتہدانہ اور محققانہ شان کے حامل تھے، اور ان کو تخلیق و اجتہاد سے دلچسپی تھی، وہ ''نہیں'' کو ''ہے'' میں بدلنے کے قائل تھے، اور اس کے لیے ہر قسم کی جد و جہد کرتے، یہ انہیں کا قول ہے: ''جو لوگ تخلیق کی صلاحیت کھو دیں، وہ کسی اور چیز کے ذریعہ یہاں اپنا مقام نہیں پا سکتے، خواہ وہ کتنا ہی شور و غل کریں، خواہ ان کے فریاد و احتجاج کے الفاظ سے تمام زمین و آسمان گونج اٹھیں، وہ لاؤڈ اسپیکروں کا شور تو برپا کر سکتے ہیں، مگر وہ استحکام کا خاموش قلعہ کبھی کھڑا نہیں کر سکتے'' (کتاب زندگی ص 11)۔

مولانا کی پیدائش اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تعلیم پائی، ذاتی محنت سے انگریزی میں دسترس حاصل کی اور علوم جدیدہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا، دار العلوم ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران اپنی سب سے معرکۃ الآراء کتاب مذہب اور جدید چیلنج تصنیف کی، جو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے 1966ء میں شائع ہوئی، اور اس کا عربی ترجمہ ''الاسلام یتحدی'' کے نام سے کویت سے 1970ء میں طبع ہوا، جماعت اسلامی سے وابستہ رہے، جمعیۃ علمائے ہند کے ہفت روزہ الجمعیۃ میں کچھ سالوں کام کیا، پھر سب سے الگ ہو کر اپنی منفرد شناخت بنائی، اور مثبت تحریروں کے ذریعہ فکر اسلامی کے ارتقاء میں حصہ لیا۔

ندوہ کی طالب علمی سے میں الرسالہ کا قاری رہا ہوں، اور ہمیشہ مولانا کے مضامین بڑے شوق سے پڑھتا، مولانا ریڈرز ڈائجسٹ اور انگریزی اخبارات اور مجلات سے چھوٹی کہانیوں کو لے کر ان سے بہترین نتیجہ نکالتے تھے۔

مولانا سے پہلی ملاقات نظام الدین میں ان کے گھر پر 1983ء میں ہوئی، وہ ابھی جلد ہی وہاں

منتقل ہوئے تھے، اس وقت وہ زیادتر نمازیں مرکز نظام الدین میں ادا کرتے تھے، اور تبلیغی جماعت کی افادیت کے قائل تھے، بعد میں تبلیغ کے متعلق ان کی رائے بدل گئی تھی، اس ملاقات میں ان سے ایک خاص تعلق ہو گیا تھا، پھر جب بھی دلی جانا ہوتا تو ان سے ملاقات کی کوشش کرتا، مولانا کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر ثانی اثنین خان اور ان کی پوتیاں یہاں آکسفورڈ مجھ سے ملاقات کے لیے بھی آئے، اور ان سے ای میل کے ذریعہ وقتاً فوقتاً رابطہ بھی رہا، ہر ملاقات میں مولانا اپنی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہدیہ کرتے، اور ان کی گفتگو سے فکر ونظر کے نئے دریچے وا ہوتے، ایک بار ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو اپنے گھر کے سارے افراد کو بلایا اور مجھ سے کچھ نصیحت کرنے کے لیے فرمایا، میں نے عرض کیا کہ آپ کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی، مگر مولانا کا اصرار جاری رہا تو مولانا ہی کی زندگی کے کچھ اسباق ان کے سامنے رکھے، مولانا نے ایک بار مجھ سے میری کتاب محدثات کے متعلق دریافت کیا اور پوچھا کہ ان خواتین کی زندگی میں غیر مسلم عورتوں کے لیے سیکھنے کی کیا چیز ہے؟ میں نے کسی وجہ سے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے معذرت کر لی۔

انہوں نے بڑی فعال، متحرک اور سرگرم زندگی گزاری، وہ ایک محنتی انسان تھے، راحت طلبی سے کوسوں دور تھے، ایک بار گرمیوں میں میں ان سے ملنے گیا تو اپنے بالائی کمرہ میں سخت گرمی میں اپنے کام میں مشغول تھے، چھت کی تپش جسم پر محسوس ہو رہی تھی، ہم لوگوں کے لیے وہاں بیٹھنا مشکل تھا، میں نے عرض کیا کہ اس گرمی میں آپ کو کسی ٹھنڈے کمرہ میں کام کرنا چاہیے تو انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے، اور کچھ پتہ نہیں چلتا، محنت کا یہ جذبہ ان کی حیرت انگیز کارکردگی کی روح ہے، ان کی یہ بات بڑی قیمتی ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم محنت کی درسگاہ میں پڑھائے جاتے ہیں، تمام ترقیاں محنت کی قیمت دے کر حاصل ہوتی ہیں، اور محنت وہ چیز ہے جو ہر آدمی کو حاصل رہتی ہے، حتی کہ اس آدمی کو بھی جس کو بیماری نے معذور بنا دیا ہو، جو کالج اور یونیورسٹی کی ڈگری لینے میں ناکام ثابت ہوا ہو، محنت ایک ایسا سرمایہ ہے جو کبھی کسی کے لیے ختم نہیں ہوتا'' (کتاب زندگی ص 12)۔

مولانا بنیادی طور پر ایک مفکر و دانشور تھے، یعنی وہ جذبات واحساسات کی گرفت سے آزاد ہو کر اصول کی بنیاد پر کوئی بات کہتے تھے یا کوئی اقدام کرتے تھے، برصغیر میں عام مسلمان رہنما اس فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں ان کا حلقہ ان سے کٹ نہ جائے، کہیں ان کی مقبولیت پر آنچ نہ آجائے، نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ ان کی فکر رسوم وروایات سے آزاد نہیں ہو پاتی، اور وہ اسی دائرہ میں گردش کرتے رہتے ہیں، انہیں نہ دوسرے جہانوں کا علم ہوتا ہے اور نہ اپنے بادۂ دردی آمیز کے سوا کسی شراب خالص وصافی کی جستجو ہوتی ہے:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا     منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مولانا کا خیال تھا کہ ہندوستان کے علماء و مصلحین روحِ عصر سے خالی ہیں، انہیں یہ اندازہ نہیں کہ آزادی کے بعد ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا ہے، ان کے رویوں سے لگتا ہے کہ گویا وہ مغلیہ دور میں، یا خلافت عباسیہ میں، یا عہد آل عثمان میں جی رہے ہیں، کور پسندی اور غفلت کے اس ماحول میں وہ تنہا مفکر ہیں جو روحِ عصر کی منادی کرتا ہے، طبقۂ علماء میں اس وقت ان کے علاوہ کوئی نہیں جو عصری اسلوب میں لکھتا ہو، اس میں شاید کچھ مبالغہ ہو، لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جس استقلال کے ساتھ انہوں نے اپنے زمانے کے انسانوں کو خود ان کی زبانوں میں پیغام حق سنانے کی ذمہ داری نبھائی ہے وہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

ان کو سوچنے کی عادت تھی، اور اس دائرہ سے باہر نکل کر سوچتے تھے جس کے اندر عام پڑھے لکھے لوگ مقید ہوتے ہیں، اور جس سے نکلنے کی نہیں سوچ سکتے، بلکہ نکلنے کو کفر وفسق سے تعبیر کرتے ہیں، مولانا ان بندشوں سے آزاد تھے، ان کی یہ بات بالکل سچ ہے: ''ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ بعض خیالات آدمی کے ذہن پر اتنا زیادہ چھا جاتے ہیں کہ ان سے نکل کر آزادانہ طور پر سوچنا آدمی کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے، یہ مذہبی دائرہ میں بھی ہوتا ہے، اور غیر مذہبی دائرہ میں بھی۔ یہ بند ذہن ہر قسم کی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے'' (کتاب زندگی ص 39)۔

اس پر ان کا ایمان واجب الاذعان تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا راستہ پر امن ماحول میں کام کرنا ہے، ان کا یہ ارشاد گرامی اسلامی مراجع کے وسیع وعمیق مطالعہ کا ثمرہ ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں امن کی حیثیت عموم (rule) کی ہے، اور جنگ کی حیثیت صرف استثناء (exception) کی، اسلام کی تمام تعلیمات اور پیغمبرِ اسلام کی عملی زندگی اس کی تصدیق کرتی ہے'' (امن عالم ص 13)۔

انہوں نے لوگوں سے اختلاف کیا اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا، اور اختلاف اگر مہذب اور معقول ہو تو افکار ونظریات کی تطہیر کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ ان کے متعلق

بدگمانیاں بہت پھیلائی گئیں، ان کے خیالات کو صحیح ومعتدل معیار پر نہیں جانچا گیا۔

وہ ہندوستان کے موجودہ ماحول میں مسلمانوں کو زندہ رہنے، پرامن طریقہ سے اسلام کی تعلیم اور دعوت عام کرنے اور ترقی کی راہ پر گام زن ہونے کا درس دیتے تھے، وہ ممکن کی موجودگی میں ناممکن کے پیچھے وقت ضائع کرنے کو بیوقوفی سمجھتے تھے، واقعہ ہے کہ متعدد حیثیتوں سے ان کا طریقۂ کار قابل عمل ہے، اور شاید آئندہ ان کے مخالفین بھی وہی باتیں کریں گے جن پر اب تک تنقید کرتے رہے ہیں۔

کون ہے جو اس کا اعتراف نہ کرے کہ مولانا نے بے شمار انسانوں کے ذہنوں کو متاثر کیا، ان کی تحریروں نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی رہنمائی میں بڑا کردار ادا کیا، انہوں نے مثبت اور پرامن طریقہ سے ٹھوس اور پائیدار کام کرنے کا نمونہ پیش کیا، اور کتنے مایوس لوگوں کو یاس وناامیدی سے نکالا اور انہیں جینے کا حوصلہ دیا، وہ یہ کہ سکتے ہیں: ’’شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم‘‘، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

---

مورخہ 19 ستمبر 1979ء مولانا وحید الدین خاں صاحب جموں کشمیر کے سفر کے دوران میرے گھر تشریف لائے۔ یہاں میں نے انھیں اپنے گھر میں ابابیلوں کے حوالے سے ایک چشم دید واقعہ سنایا، یہ واقعہ مولانا کی کتاب راز حیات میں اس عنوان سے درج ہے:

’’اتنی عقل جانوروں کو بھی ہوتی ہے‘‘

ابابیلوں کا یہ واقعہ میرے لیے کوئی اہم واقعہ نہ تھا مگر مولانا نے اس واقعہ کو سُن کر ایک خوبصورت تحریر قلمبند کی۔ الرسالہ میں یہ تحریر جب میں نے پڑھی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، چھوٹے چھوٹے واقعات سے اک بڑی بات نکالنا اس فن میں مولانا کو کمال درجہ کی مہارت تھی۔ بلاشبہ اس تحریر نے میری زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ پہلے میں اپنی ناکامی کی وجوہات اپنے باہر دیکھتا تھا مگر اس تحریر نے مجھے سکھایا کہ اکثر ناکامی کی وجوہات اپنے اندر ہوتی ہیں۔ بلاشبہ یہ نکتہ جسے سمجھ میں آ گیا، اس نے زندگی میں کامیابی کا راز پالیا۔ (خورشید بسمل، تھنہ منڈی، جموں کشمیر)

---

اسلام کا خوبصورت چہرہ پیش کرنے والے حقیقی عالم مولانا وحید الدین اپنے رب کے حضور پیش ہوگئے۔ (ملک سعد، سی پی ایس اسلام آباد)

# ایک عالم ربانی و ہمہ جہت شخصیت

پروفیسر ظہیر الدین خواجہ، رائچور (کرناٹک)

محترم مولانا وحید الدین خاں صاحب سے میں تین دہائی قبل 1989ء میں اپنے ایک رفیق کے توسط سے واقف ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ ہمارے شہر میں ماہنامہ الرسالہ پڑھا جانے لگا تھا، اور شہر رائچور (کرناٹک) میں فکر الرسالہ سے وابستگان کا حلقہ بھی وجود میں آچکا تھا۔

اس وقت حلقہ الرسالہ رائچور کے روح رواں شہاب الدین صاحب تھے۔ ان سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوا کرتی تھی۔ الرسالہ سے وابستہ افراد اپنے فرصت کے اوقات میں مل بیٹھتے۔ ان ملاقاتوں میں عام طور پر ماہنامہ الرسالہ کے مضامین پر گفتگو ہوتی، مولانا کے افکار و دیگر علمائے کرام کے علمی کام کا تقابل کیا جاتا۔ اس طرح میری مولانا کی فکر سے واقفیت اور ذہنی وابستگی بڑھتی چلی گئی۔

مولانا وحید الدین خاں سے تعارف ہوئے ایک دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ دسمبر 1990ء کے آخری ہفتے میں مجھے ایک تعلیمی سفر کے سلسلے میں ایک ہفتہ کے لیے نئی دہلی جانے کا موقع مل گیا۔ اس سفر کے دوران میں نے مولانا سے ملاقات کا پروگرام بنالیا۔ غالباً جنوری 1991 کی 2 یا 3 تاریخ رہی ہوگی، میں مولانا سے ملنے ان کے رہائشی علاقے نظام الدین ویسٹ گیا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مولانا گھر ہی پر ہیں اور ملاقات کی اجازت بھی مل گئی ہے۔ حالانکہ میں نے ملاقات کے لیے پہلے سے ان سے وقت نہیں لیا تھا۔ میں سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر کی منزل پر پہونچا، جہاں مولانا رہا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ میرے استقبال کے لیے مولانا پہلے سے دروازہ پر کھڑے تھے (اس وقت میری عمر 21 سال تھی)۔

سلام و دعا کے بعد میں ان کے ہمراہ فرش پر بچھی ہوئی چادر پر بیٹھ گیا۔ تقریبا ایک گھنٹہ مولانا سے گفتگو ہوتی رہی۔ اب مجھے مکمل گفتگو تو یاد نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ مولانا نے مجھ سے تعارف کے بعد مختلف سوالات کیے تھے۔ مثلاً الرسالہ سے آپ کیسے واقف ہوئے۔ شہر رائچور میں

کتنے احباب اس فکر سے جڑے ہوئے ہیں، الرسالہ کی کتنی کاپیاں آپ کے یہاں آتی ہیں؟ جہاں تک مجھے یاد ہے مولانا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ جانتے ہیں الرسالہ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے فورا جواب دیا آخرت اور دعوت۔ میرے جواب سے خوش ہو کر فرمایا کہ اس کے علاوہ الرسالہ کا ایک اور مقصد بھی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو باشعور بنانا۔ یہ تھی مولانا سے میری پہلی ملاقات کی مختصر روداد۔

یہ تو ایک رسمی ملاقات تھی اور اس سے کسی کی شخصیت کو سمجھنا کہاں ممکن ہوسکتا ہے۔ جیسے جیسے مولانا کی کتابوں کا مطالعہ کرتا گیا، ویسے ویسے یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ اتنی گہرائی سے قدیم وجدید علوم کا مطالعہ اور انکا اتنا عمیق تجزیہ پڑھ کر ایسا لگا کہ مومنانہ فراست کی اس سطح سے واقعات اور تاریخ کو دیکھا اور سمجھا جارہا ہے، جس کو حدیث میں ربانی نور سے دیکھنا کہا گیا ہے۔ فطرت اور حقائق کا ایسا بیان مشکل سے کہیں دیکھنے کو ملے گا۔ مولانا کو اپنے لطیف احساسات کو زبان دینے کا ملکہ حاصل تھا۔ مختصر الفاظ، رواں تحریر، فکر میں وضوح، مدلل اور عصری اسلوب نگارش، ایک بار جو مولانا کو پڑھتا اس کے بعد دوسرے مصنفین کو پڑھنا اس کے لیے مشکل ہوجاتا۔ ایک عرصے تک مولانا کے افکار کی ترویج کا طریقہ الرسالہ اور دیگر کتب کی اشاعت ہی تک محدود رہا۔ تشنگان علم کو اسی پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

2001ء میں سی پی ایس انٹرنیشنل کے قیام کے بعد پہلی بار مولانا کی آڈیو اور ویڈیو انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے لگیں۔ ان کو سننے کے بعد یہ احساس تازہ ہوا کہ تحریر کا دامن کتنا تنگ ہے۔ مولانا کی شخصیت وعلم کے کئی گوشے جو تحریر میں سمانہ سکے وہ پہلی مرتبہ اب آڈیو اور ویڈیو کے ذریعہ ہم تک پہنچ رہے تھے۔ ابھی اس احساس سے نکل ہی پایا تھا کہ کچھ ایسے احباب سے ملنے کا اتفاق ہوا جنھیں مولانا کی صحبت میں طویل عرصہ رہنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے مشاہدات سن کر ایسا لگا کہ مولانا کی شخصیت نہ تو تحریر میں سما سکی ہے اور نہ تقریر میں۔ اس پر میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا کہ تحریریں پڑھ کر آپ مولانا کی صرف نصف شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ کاش ہم لوگ مولانا کی قدر کرتے اور اپنے آپ کو اس سائنٹفک صوفی کی تربیت میں دیتے تو شاید ہمیں بہت کچھ اور بھی سیکھنے کا موقع ملتا۔

واضح ہو کہ یہ بیانِ واقعہ ہے، یہ کوئی شخصیت پرستی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ شخصیت سازی کا مسئلہ ہے۔ اصل المیہ ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم کسی نہ کسی درجے میں بے روح اور رسمی سطح پر باقی رہا، مگر ہمارا نظامِ تربیت نہ صرف باقی نہ رہا، بلکہ اس کی اہمیت وافادیت بھی ذہنوں سے محو

ہوتی چلی گئی، جس کی وجہ سے آج ہم نہ صرف اخلاقی بحران کا شکار ہیں۔ بلکہ زوال اور پستی کی طرف ہمارا سفر مسلسل گامزن ہے، اوراس صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے سوائے تربیت کے، مگر افسوس اب تو قحط الرّجال کا دور ہے ایسے افراد اب بمشکل ہی ملیں گے جن کی صحبت میں رہ کر آدمی اپنی تربیت کا کوئی سامان کر سکے۔

خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لیے صرف کتابیں نہیں اتاریں بلکہ تربیت کی۔اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک انسان کو پیغمبر اور ہادی بنا کر اس ذمے داری کے ساتھ بھیجا کہ وہ تعلیمِ کتاب وحکمت کے ساتھ ساتھ اہلِ ایمان کی لازماً تربیت (تزکیہ) بھی کرے۔چونکہ انسان صرف ذہن کا نام نہیں ہے بلکہ انسان ''ذہن اور وجود'' دونوں کا مجموعہ ہے۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے ادوار میں ہمارے ہاں جو تعلیمی نظام بنا اس میں تربیت کو پوری اہمیت کے ساتھ باقی رکھا گیا، بلکہ خانقاہی نظام میں صوفیا نے تو تربیت کو تعلیم پر ہمیشہ مقدم رکھا۔سالک کی تربیت پہلے ہوتی تھی اور تعلیم بعد میں۔اور تربیت کے لیے صحبت لازمی شرط ہے۔تربیت سے جی چرانے کے لیے موجودہ دور میں ہم نے ''شخصیت پرستی'' جیسے خوب صورت الفاظ بھی تراش لیے ہیں، اور علما سے استفادہ کرنے کو ہم نے صرف ذہنی سطح تک ہی محدود رکھ کر ایک طرح کے intellectual entertainment کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

کچھ ایسے ہی تربیتی پہلو جو 2013ء سے 2015ء کے درمیانی عرصے میں منعقد ہونے والے مختلف دعوہ میٹس میں شرکت کے بعد براہ راست میرے تجربے، مشاہدے اور علم میں آئے، انھیں میں یہاں ذکر کرنا چاہوں گا۔

1۔ CPS کی ایک کانفرنس میں مولانا نے تمام شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی دوسروں کے لیے کوئی منفی احساس (negativity) موجود ہے تو ایسا شخص ہمارے مشن کا ساتھی ہرگز نہیں ہوسکتا۔آخرت میں کسی کے خلاف میرا کوئی مقدمہ نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے بھی میرے خلاف لکھا، بے بنیاد الزامات لگائے، مجھے بدنام کیا، جو کچھ بھی میری مخالفت میں کیا، سب کو میں نے اسی دنیا میں معاف کر دیا۔

2۔ ایک صاحب کا انتقال ہوا جو مولانا کی شدید مخالفت کیا کرتے تھے اس خبر کو سن کر مولانا

رونے لگے۔ ایک ساتھی نے حیرت سے کہا کہ اپنے مخالف کے انتقال کی اطلاع پر آپ کا رونا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہنے لگے: یہ سوچ کر رو رہا ہوں کہ میرے پاس تو کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس کی وجہ سے خدا میری مغفرت کر دے، ہاں مگر ان لوگوں نے مجھے جتنا ستایا ہے، شاید اس پر خدا کو رحم آجائے اور وہ فرشتوں سے کہے کہ میرے اس کمزور بندے کو دنیا میں بہت ستایا گیا مگر اس نے جواب میں صرف صبر کیا لہٰذا آج میں نے اس کی مغفرت کر دی۔

3۔ حیدر آباد دعوہ میٹ کا واقعہ ہے۔ شام کی نشست کے لیے اوپر کے حال کی طرف سیڑھیوں سے جا رہے تھے، میں مولانا کے پیچھے ہی چل رہا تھا، داہنی طرف دیوار پر گلوب کا بڑے سائز کا پوسٹر لگا ہوا تھا۔ چلتے چلتے رک گئے اور پیچھے میری طرف مڑ کر کہا، یہ نقشہ دیکھ رہے ہو۔ اس طرح دنیا کا نقشہ کسی صحابی کو معلوم نہ تھا۔ جتنی دنیا کو وہ جانتے تھے وہاں تک انھوں نے خدا کے دین کو پہنچایا۔ مگر آج ہم کو پوری دنیا معلوم ہے، ایک ایک گاؤں اور ایک ایک شہر معلوم ہے کہ وہ اس نقشہ میں کہاں ہے اور وہاں کتنے انسان رہتے ہیں۔ یہ معلومات ہماری ذمے داری کو یاد دلانے کے لیے ہیں، یعنی ہم کو گلوبل سطح پر دعوت الی اللہ کا کام کرنا ہے، تا کہ ہر انسان تک خدا کا پیغام پہنچ جائے۔

4۔ ایک مجلس میں کہا نماز بہ اعتبار فارم 5 مرتبہ مطلوب ہے اور بہ اعتبار اسپرٹ ہر وقت 24 گھنٹے مطلوب ہے۔ جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں، وہ دراصل نماز کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ نماز کی تفصیلات قرآن میں نہیں، حدیث میں ملتی ہیں۔

5۔ حیدر آباد دعوہ میٹ سے واپسی کے بعد فیاض الدین عمری صاحب کا فون آیا کہ مولانا مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں میں حیران رہ گیا۔ اس وقت تک مولانا سے کبھی فون پر بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اگلی آواز مولانا کی تھی۔ سلام دعا کے بعد پوچھا آپ حیدر آباد دعوہ میٹ میں شریک تھے، میں نے کہا جی میں شریک تھا۔ اور میں نے مزید بتایا کہ ہم لوگ بہت جلد شہر رائچور میں ایک سینٹر کھولنے والے ہیں تا کہ منظم سطح پر کام کرسکیں، اس پر مولانا نے کہا یاد رکھیے ”اگر سنٹر چلانا ہے تو ہرگز کسی سے ایک روپیہ بھی نہیں مانگنا۔ اور اگر کوئی خود سے بن مانگے دے دے تو انکار نہیں کرنا“۔ اس اصول پر چلانا ہے تو سینٹر کھولیں، ورنہ نہیں۔

6۔ بنگلور دعوہ میٹ کے موقع پر ایک غیر رسمی نشست میں کہا کہ اس دعوتی مشن کو ایسے لوگ

درکار ہیں جو آخری حد تک بے نفس ہوں۔ مثلاً اگر کوئی ساتھی اس پروگرام میں شرکت کے لیے یہاں آئے اور کوئی بھی اس کا استقبال نہ کرے، نہ کوئی کھانے کے لیے بلائے، نہ رہنے اور سونے کا کوئی انتظام کرے، یہاں تک کہ کوئی بات بھی نہ کرے، ان سب وجوہات کے باوجود اس کے دل میں کسی بھی ساتھی کے خلاف نہ کوئی منفی سوچ آئے اور نہ کوئی شکایت پیدا ہو۔ ایسے ساتھی ہمیں چاہیے۔ اپنے آپ کو ایسا بنائیے تب جا کر آپ اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔

7۔ بنگلور میں، جہاں پروگرام منعقد ہو رہا تھا، اس جگہ کا نام ''وستار'' (Vistar) تھا۔ انھوں نے ایک بلی پال رکھی تھی جو کہ بہت زیادہ لحیم شحیم تھی تقریباً 20 کیلو کی رہی ہوگی اور کسی کے پاس نہ آتی تھی، ان لوگوں نے بتایا کے یہ کسی اجنبی کے پاس نہیں جاتی۔ دوسرے دن ایسا ہوا کہ مولانا کے کمرے میں آئی، وہاں کئی ساتھی بیٹھے مولانا سے گفتگو کر رہے تھے، مگر کسی کے پاس نہیں گئی سیدھے مولانا کی گود میں جا بیٹھی اور سو گئی، مولانا خاموش بیٹھے رہے اور کہا کہ اب میں اس کی نیند میں خلل نہیں ڈالوں گا جب تک یہ خود سے بیدار نہیں ہو جائے گی۔ ویسے ہی بلا حرکت بیٹھے رہے۔

8۔ بنگلور دعوہ میٹ میں مولانا کا خطاب ہونے والا تھا۔ نشست کی تیاری چل رہی تھی میز پر پانی رکھا ہوا تھا۔ گلاس اٹھا کر مولانا نے تھوڑا پانی پیا اور گلاس واپس میز پر رکھا، ہمارے ایک ساتھی محمد صلاح الدین (رائچور) نے فوراً گلاس اٹھایا اور دوبارہ بھر کر رکھا۔ مولانا نے انھیں قریب بلا کر پوچھا گلاس میں پانی بچا ہوا تھا، اسے پھینکا تو نہیں، انھوں نے کہا نہیں اُسی میں مزید پانی بھر کر لایا ہوں۔ بولے آپ نے ٹھیک کیا، پانی خدا کی عظیم نعمت ہے ہم ایک قطرہ پانی بنا نہیں سکتے لہٰذا ہمیں استعمال کرنے کا حق تو ہے پر ایک قطرہ بھی ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

9۔ کچھ مشن کے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ مولانا سے ملنے گئے۔ گفتگو کے درمیان کھجور پیش کیے گئے، ہم سب نے کھائے۔ گفتگو کے بعد کل دوبارہ ملنا طے ہوا، اور ہم اپنی رہائش گاہ واپس آ گئے۔ دوسرے دن ہم مقررہ وقت پر پہونچے تو پتا چلا مولانا ہم لوگوں سے سخت ناراض ہیں اور ملنے سے انکار کر دیا۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے، بہت معذرت کے بعد اجازت ملی تو فرمایا کچھ پتا بھی ہے کہ آپ لوگوں نے کل کیا حرکت کی؟ ہم نے کہا کہ ہمیں کچھ یاد نہیں۔ کل کھجور کھا کر آپ لوگوں نے گٹھلیاں ادھر ادھر رکھ کر چلے گئے۔ آپ کیا سمجھتے

ہیں اس طرح کے لوگوں کو جنت میں بسایا جائے گا، بلکہ ایسے لوگ شاید جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیں گے۔ جنت انتہائی درجہ کی صاف ستھری اور پاک جگہ ہوگی۔ اور وہاں انہی لوگوں کو بسایا جائے گا جو اپنے ظاہر اور اپنے باطن دونوں اعتبار سے انتہائی نفاست پسند لوگ ہوں گے۔ یاد رہے غیر شعوری طور پر بھی ایسا کرنا قابلِ معافی نہ ہوگا۔ ان چھوٹے چھوٹے سماجی آداب کو معمولی مت سمجھیں، بلکہ اپنے لاشعور کو اس قدر ٹرین (train) کریں کہ غیر شعوری طور پر بھی آپ سے ایسی حرکت نہ ہونے پائے۔

10۔ بنگلور میں ایک روز فجر کے بعد خطاب فرمایا اور ''الحمد للہ رب العالمین'' کی تشریح کی۔ اس سے زندگی میں پہلی بار سمجھ میں آیا کہ خدا کی حمد اور شکر میں جینا کسے کہتے ہیں۔

یہ صرف دس نکات ہیں جو میں نے یہاں پیش کیے ہیں اور اس احساس کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ ہم نے تو مولانا کی قدر نہ کی، ہوسکتا ہے بعد میں آنے والے کو اس میں کوئی کام کی بات مل جائے۔

---

مولانا اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ ان کی اکثر دینی تعبیر سے اختلاف اپنی جگہ مگر بطور ایک داعی آپ کی تحریریں ہمیشہ رہنمائی فراہم کرتی رہیں گی۔ دین کے تذکیری پہلو کے لحاظ سے لکھنے میں بھی مولانا اپنے ہم عصروں سے آگے نظر آتے ہیں۔ مولانا کا جدید اسلوب میں اسلام کا تعارف بھی ان کا ایک خاصہ ہے۔ پھر مولانا نے جس طرح الحاد کا علمی رد کیا ہے، اس پر مولانا کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جاسکے کم ہے۔ رد الحاد کے حوالے سے مولانا کی تین کتابیں ''مذہب اور سائنس''، ''مذہب اور جدید چیلنج''، اور ''اسلام، دور جدید کا خالق'' بہترین کتب ہیں۔ ان میں بھی ''مذہب اور جدید چیلنج'' سب سے اہم کتاب ہے۔ آج کل مولانا کی ایک ضخیم کتاب ''کتاب معرفت'' پڑھنا شروع کی تھی معلوم نہیں تھا کہ کتاب ختم ہونے سے پہلے مصنف ہی نہیں رہیں گے۔ (قاسم محمود، اسلام آباد)

---

ہمارے عہد کے عظیم مذہبی اسکالر اور دانشور مولانا وحید الدین خان بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔۔۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس قدر مثبت سوچ رکھنے والے مذہبی اسکالر تاریخ میں خال خال ہی ملتے ہیں۔ (شجاعت علی راہی، کوہاٹ، پاکستان)

# مولانا سے میرا تعلق

خواجہ کلیم الدین، سی پی ایس، امریکا

یہ مجھ پر اللہ رب العزت کا کرم رہا ہے کہ اس نے مجھے عرصہ دراز پہلے مولانا کی تصنیفات سے متعارف ہونے کا موقع عطا فرمایا۔ یہ میرا وہ وقت تھا جب کہ میں اپنی عملی اور پروفیشنل زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔ میری بچپن کی شخصیت روایتی مسلم ماحول سے تشکیل پائی تھی جس میں مذہب صرف چند بے جان رسوماتی عبادتوں کا مجموعہ تھا۔ ہر عبادتی عمل کو فضائل کے ترازو میں تولا جاتا تھا، مثلاً ان عبادتوں کو چند مخصوص دنوں اور اوقات میں ادا کرلو تو اس کی قیمت اور کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ آگے چل کر کالج کے زمانہ میں میری شخصیت اسلام کی سیاسی تعبیر پر مبنی تشریحات سے متاثر ہونے لگی تھی۔ میری بچپن کی شخصیت روایتی مسلم ماحول سے تشکیل پائی تھی تو کالج کے زمانے میں وہ اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہونے لگی تھی۔ اس وقت یہ بتایا جا رہا تھا کہ اسلام اور مسلمان اعلیٰ ہیں اور خدا مسلمانوں کو اس کی حکمرانی قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ بھی بتایا جا رہا تھا کہ مسلمانوں کی حکومت جو تقریباً ہزار سال تک جاری تھی مغرب نے سازش کے ذریعہ اس پر قبضہ کرلیا ہے۔ ان تشریحات کے زیر اثر ایسا منفی ذہن بن رہا تھا کہ دوسری قومیں ہمیں اپنی دشمن نظر آنے لگی تھیں۔ ہم اور وہ (we and they) کی تقسیم ذہن میں بٹھائی جا رہی تھی۔ غیر مسلم حکومتوں کو طاغوتی حکومتیں بتایا جاتا تھا، جس کے تحت زندگی گزارنا شرک تھا۔ یہ باتیں کتابوں اور اخبارات کے ذریعہ علم میں آرہی تھیں۔ میری پرورش ہائی اسکول کی تعلیم مکمل ہونے تک ایک دیہات میں ہوئی تھی۔ یہاں پر دین کا روایتی ماڈل مجھے روحانی تشفی نہیں دے رہا تھا تو کالج کے دور میں دین کی سیاسی تعبیر کی وجہ سے بےچینی تھی۔ غالباً وہ اس لئے تھا کے دیہات ماحول میں ہم اور وہ (we and they) کا غیر فطری ماحول موجود نہ تھا، نہ ہی کالج میں ایسی سوچ پائی جاتی تھی۔ میرے زیادہ تر دوست غیر مسلم ہوا کرتے تھے اور ان کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے اور کافی فکری تبادلۂ خیال بھی ہوا کرتا تھا۔ ہم مل کر خوب اسٹڈی کیا کرتے تھے۔

1976ء میں جب میں کالج سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوا تو میرے ایک رفیق کار نے

مجھے اردو الرسالہ کا ایک نسخہ دیا۔ مجھے اس وقت اردو پڑھنی نہیں آتی تھی۔ لیکن بچپن میں قرآن ناظرہ کے ساتھ پڑھنے کی وجہ سے چند عرصہ کی محنت کے بعد اردو پڑھنا ممکن ہو گیا۔ چونکہ الرسالہ کا ہر صفحہ نصیحت اور حکمت کا خزانہ ہوا کرتا ہے، اس لئے اس کا مطالعہ بلاانقطاع جاری رہا۔ الرسالہ میں تقریباً ہر مضمون کو میں نے قرآن یا حدیث پر مبنی پایا، ان کی تشریح دورِ جدید کی اصطلاحوں میں ہونے کی وجہ سے الرسالہ کے بعد مولانا کی دوسری کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ سب سے پہلے میں نے مولانا کی کتاب ''الاسلام'' کو پڑھا، بلکہ اس کو میں نے کئی بار بغور پڑھا۔ اس کے مطالعے سے مجھے رسوماتی دین (جس پر میں بچپن سے قائم تھا) ایک غیر عقلی ریاضت لگنے لگا، اور سیاسی تعبیر والا دین غیر مدلل۔ مولانا کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام مجھے ایک زندہ مذہب لگنے لگا۔ یہ میرے لیے صرف ایک ذاتی تزکیہ ہی کا ذریعہ نہیں بنا، بلکہ میرے لئے یہ ایک آفاقی، دعوتی اور فکری تحریک بن گیا۔ مجھے اس کا عملی نمونہ کتاب ''پیغمبر انقلاب'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ملا۔ پھر اس کے بعد میں نے مولانا کی اس وقت کی ساری کتابوں کو پڑھ ڈالا، بلکہ میں نے ان کو دو دو تین تین مرتبہ دہرایا۔ یہی طریقہ میں نے مولانا کی آنے والی ہر نئی کتاب کے ساتھ اپنایا۔ مولانا کی کتابوں میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ معرفتِ خدا، موت کی یاد، خود احتسابی اور ترغیبِ دعوت۔

مولانا کے لٹریچر میں اتنی تاثیر ہے کہ اس سے ہر سنجیدہ قاری کی شخصیت میں مثبت تبدیلی آنا یقینی بات ہے۔ وہ ایک داعی بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس لٹریچر کے مطالعہ سے میری شخصیت میں اولین ایام سے ہی تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ چنانچہ اسی وقت سے میں نے یہ پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ قرآن وسنت کے دلائل پر مبنی جدید اسلوب میں لکھے ہوئے اس لٹریچر کو خدا کی مدد سے لوگوں سے شیر (share) کرتا رہوں گا۔ جہاں بھی رہوں، اس کو دوسروں تک پہنچاؤں گا۔

مولانا کی فکر کو لوگوں تک پہنچانے کا کام نائجیریا سے شروع ہوا۔ میں وہاں پہلے مرحلے میں اردو اور انگریزی کتابوں کو دوستوں میں مفت تقسیم کرتا رہا۔ اس کے بعد عام نائجیرین تک پہنچنے کی غرض سے الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن ری پرنٹ (reprint) کروا کر لوگوں میں تقسیم کرتا تھا۔ امریکا پہنچنے کے بعد بھی یہی کام جاری رہا۔ اس وقت کے میرے نیویارک کے اپارٹمنٹ میں جہاں میری رہائش تھی، کوئی ایسی خالی جگہ نہیں تھی جس کو میں نے کتابوں سے بھر نہ دیا ہو۔ اس کے بعد اللہ کی مدد آئی

شروع ہوئی۔ اب مجھے ساتھی ملنا شروع ہو گئے۔ ان کی مدد سے یہاں امریکا میں مولانا صاحب کی موجودگی میں ہم نے الرسالہ کی ایک باقاعدہ تنظیم رجسٹر کروا کر کام کو آگے بڑھایا۔ اس تنظیم کا نام Alrisala Forum International رکھا۔

اس کے بعد مولانا کی فکر کو عمومی لوگوں تک پہنچانے کی غرض سے اس تنظیم کی ایک ویب سائٹ www.Alrisala.org بنائی۔ اس ویب سائٹ پر نہ صرف مولانا کی ساری کتابوں کے pdf بلکہ ان کے متعدد کتابوں اور رسالوں کے صوتی ایڈیشن کو بھی upload کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب امریکا کی مختلف ریاستوں میں اس تحریک سے وابستہ افراد کی تعداد بڑھنے لگی تو مولانا کا ایک ہفتہ وار ٹیلی کانفرینس پروگرام چلایا گیا۔ اس پروگرام میں مولانا پر 15 منٹ کسی ایک موضوع پر ایک تقریر کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد مولانا مشارکین کے سوالوں کا جواب دیتے۔ اس کے بعد اس پروگرام کو عالمی شکل دینے کے لئے CPS دہلی کے تعاون سے مولانا کی ان تقاریر کا ہفتہ وار پروگرام Ustream کے ذریعہ live streaming ہونے لگا۔ پھر اس پروگرام کو CPS دہلی نے مزید آگے بڑھایا، اور اس کو مولانا کے فیس بک پیج کے ذریعے live broadcast کرنے لگے۔

## افراد کا تعاون

اس سارے دعوتی مہم میں میری اہلیہ تسنیم اور بچوں کے تعاون کے علاوہ اس مہم میں جو اولین ٹیم بنی تھی ان افراد کے نام یہ ہیں: عرفان عمر، فاروق چشتی، ارتقاء جمیل، ابراہیم صاحب، ابراہیم لودھیہ، گل زیبا احمد، انیس میمن، مرتضی افضل، وقار عالم، فائق فاروقی وغیرہ۔ سن 2009 میں مولانا کا قرآن کا انگریزی ترجمہ آیا۔ اور 2010 میں مولانا نے پیغمبر اسلام کی سنت کی اتباع میں قرآن کے تراجم کو سارے عالم کے ہر گھر میں ان کی اپنی زبان میں پہنچانے کا ہدف دیا۔ یہاں بھی اللہ تعالی کی مدد ہماری ٹیم کو بہت زیادہ ملی۔ اب تک ہم لوگ قرآن کے ایک ملین سے زائد نسخے نہ صرف امریکا میں، بلکہ دوسرے ممالک جیسے کینیڈا، نیوزی لینڈ، برازیل وغیرہ میں بھی پہنچا چکے ہیں۔ سوشل میڈیا کے دور میں اس مہم کو آگے پہنچانے کے لئے نوجوانوں کی ایک ٹیم درکار تھی۔ اللہ تعالی نے اس ضرورت کو اسد پرویز کی قیادت میں ہمیں مہیا کیا۔ ان شاءاللہ اب یہ کام مزید تیزی کے ساتھ انجام پائے گا۔

## مولانا کے ساتھ انٹرایکشن

میری پہلی ملاقات مولانا سے ان کے لٹریچر سے واقف ہونے کے دس سال بعد 1986 میں ان کے دہلی کے دفتر میں ہوئی۔ اس کے بعد مولانا سے کئی بار دہلی میں، اسی طرح امریکا کے چار مختلف اسفار کے دوران ان کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ کینیڈا اور دبئی کے اسفار میں مولانا کے ساتھ لمبا وقت گزرا۔ مولانا سادگی کے پیکر تھے۔ ان کی اپنی ضروریات بالکل مختصر تھیں۔ ان کو کبھی میں نے فضول اور وقت گزاری کی بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ میں نے ان کو یا تو تدبر و تفکر میں ڈوبا ہوا یا کچھ لکھتے ہوئے یا پھر لوگوں سے کوئی فکری اور نصیحت کی بات کرتے ہوئے ہی دیکھا۔ میرا کچھ وقت دوسرے علماء کے ساتھ بھی گزرا ہے۔ ان سب کو میں نے ان کی اپنی تقاریر کے فوراً بعد غیر سنجیدہ موڈ میں دیکھا ہے۔ لیکن میں نے مولانا کو کبھی غیر سنجیدہ بات کرتے ہوئے یا کوئی مزاحیہ کلام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی خوراک بہت سادہ اور بہت کم ہوتی تھی۔ دوران اسفار وہ ہوٹل کے بجائے (اپنے کسی جاننے والے کے) گھر پر رہنا پسند کرتے تھے، اور وہ میزبان کے ساتھ no problem man کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ان کا لباس بہت ہی سادہ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ سفر کے دوران ایک عدد کرتا پاجامہ ان کے جسم پر ہوتا، اور ایک عدد بیگ میں ہوتا، اور اس لباس میں ایک کوٹ بھی ہوتا تھا۔ مولانا کے امریکا کے پہلے سفر کا واقعہ ہے۔ وہ ہمارے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری اہلیہ نے جب ان کے کپڑوں کو واش کرنے کے لئے لیا تو پایا کہ اس کوٹ کی دونوں جیبیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میری اہلیہ نے اس بات کا ذکر فاروق چشتی صاحب سے کیا تو وہ مولانا کے لیے ایک عدد اچھا سا نیا کوٹ تحفے میں لے آئے۔ مولانا نے اسے لینے سے انکار کر دیا اور نم آنکھوں سے کہنے لگے کہ میری اپنی ضرورتیں کوئی نہیں ہیں اور مجھے جیبوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ انہوں نے وہ نیا کوٹ واپس کروایا اور اپنا پرانا کوٹ ہی رکھ لیا۔ فاروق چشتی صاحب کا ہی واقعہ ہے۔ وہ مولانا کی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کے لئے ایک ریکارڈر لائے تھے۔ مولانا نے اس کو مشن کے promotion کے لئے بخوشی قبول کر لیا۔

## مولانا کی آئڈیالوجی

مولانا نے اپنے 1996 کے امریکا کے دورے میں ہم لوگوں سے کہا تھا کہ خدا اور اسلام ان کی

اپنی دریافت ہے۔انہوں نے بتایا کہ مدرسہ کی تعلیم اوراساتذہ نے ان کواس دریافت کی طرف ضرور گامزن کیا ہے۔مگر مدرسہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ خدا کی دریافت میں ایک عرصہ دراز سرگرداں رہے۔اس کے لئے انہوں نے خود سے انگریزی سیکھی۔اس کے بعد انہوں مغربی علوم کی حقیقت کو جاننے کی غرض سے ان کا گہرا مطالعہ کیا۔ریاضی اور سائنس کو مذہبی علوم کی نسبت سے پڑھا۔تب جا کر انہوں نے نص اسلام سے ماخوذ مذہب اسلام کو جدید انسان کے لئے اسلوب جدید میں پیش کیا۔مولانا کی اس بات کی تصدیق ان کی دوسو سے زائد کتابوں سے ہوجاتی ہے۔اس امریکی سفر کے دوران مندرجہ بالا باتیں New York سے North Carolina Raleigh کے راستے میں بتائیں۔انہوں نے الرسالہ میگزین کو شروع کرنے میں کتنی دقّت پیش آئی اس کا قصہ بھی بیان فرمایا۔ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ مولانا کا الرسالہ نہیں چل پائے گا وہ اس لئے کہ عوام informative مضامین پسند کرتے ہیں اور مولانا کے مضامین suggestive ہوتے ہیں اور لوگ suggestion یعنی نصیحت کو قبول نہیں کرتے ہیں۔اس لئے آپ کی میگزین پسند نہیں کی جائے گی۔مولانا نے بتایا اب چونکہ ان کے ذہن میں مضامین کی بارش ہوتی ہے،جن کا اسلوب بھی عصری ہوتا ہے۔چنانچہ انہوں نے رسالہ کو Reader's Digest کے اصول پر نکالا تھا۔اسی اصول کو اپنانے کی وجہ سے الرسالہ کامیاب ہوا۔

میں نے مولانا کو 1986 کی اپنی پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ آپ کی writing آج کے فکری مستویٰ کے مطابق ہے،مگر عام مسلمانوں کا ذہن اس کے لئے ابھی تیار نہیں ہے۔اس لئے بہت سارے مسلمان اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اس کی مخالفت کریں گے۔الحمدللہ،اب مولانا کا لٹریچر بہت زیادہ مقبولیت حاصل کررہا ہے۔ساری دنیا میں اس کو پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہوگئی ہے۔اس لٹریچر کو پھیلانے کے لئے دنیا بھر میں teams بن گئی ہیں اور وہ لوگ رضا کارانہ طور پر اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔میری اسٹڈی کے مطابق،مولانا نے اپنی مجتہدانہ کوششوں سے قرآن سنت کے بہت سارے اصولوں کو عصری اسلوب میں redefine کرکے reapply کیا ہے،اور علماء کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اس کام کو مزید آگے بڑھائیں۔اس کے لئے ملاحظہ کیجئے ان کی کتابیں تجدید دین،فکر اسلامی،دین وشریعت،اجتہادی مسائل وغیرہ۔اسلام بنیادی طور پر

مذہبِ امن ہے۔ اس پہلو کو مولانا کی ان کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے:

Islam and Peace, Islam and Non-Violence, Jihad, Peace and Intercommunity Relations in Islam, The Ideology of Peace, The Age of Peace, The Prophet of Peace.

وغیرہ۔ مولانا کے سارے لٹریچر میں خدا کی عظمت کے بعد جو موضوع سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ ہے ترغیبِ دعوت۔ اس موضوع کی خاص کتابوں کے ٹائٹل یہ ہیں: دعوت اسلامی، اسلامی دعوت، دعوت حق، دورِ دعوت، وغیرہ۔

## خلاصہ

مولانا کے لٹریچر سے جو موضوعات مختلف انداز میں نمایاں ہوتے ہیں، وہ ہیں: عظمت خدا، احساس جنت اور جہنم، تزکیہ نفس، قرآن وسنت کی روشنی میں تعمیر شخصیت، لائف مینجمنٹ وغیرہ۔

## آخری بات

21 اپریل 2021 کو مولانا کے گزر جانے کا مجھے شدید صدمہ ہوا۔ اتنا صدمہ جو کہ میرے والدین کے گزرنے پر نہیں ہوا تھا۔ غالباً یہ اس لئے ہوا کہ میرے والدین نے میری جسمانی غذا کی فراہمی کا انتظام کیا، لیکن مولانا سے مجھے میری روحانی غذا ملی۔ مولانا حکمت و دانائی کے پہاڑ تھے۔ انہوں نے اس نکٹر (nectar) کو قرآن وپیغمبر کے اسوہ سے نچوڑ کر اپنی ڈھائی سو سے زائد کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ کتابیں مولانا کے گزر جانے کے بعد ان کے بدل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالی مولانا کو اپنے پڑوس میں پیغمبر، صالحین اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ جگہ عطا فرمائے۔ آمین وثم آمین۔

مولانا نے مسلسل ہم سب کو اسلام کا پیغام یعنی قران کو دنیا کے سارے انسانوں تک ان کی اپنی زبان میں پہنچانے کے عمل کو انجام دیتے رہنے کی ترغیب دی ہے۔ اس کام کو میں آخری سانس تک جان ومال کی قربانی کے ساتھ انجام دیتے رہنے کا تہیہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالی اس کو قبول فرما اور اس میں آسانی عطا فرما۔ آمین۔

---

میں نے مولانا وحید الدین خان سے بہت کچھ سیکھا، مسلمانوں میں ان جیسے دو تین علما اور پیدا ہو جاتے تو شاید مسلمان اتنے زوال یافتہ نہ ہوتے۔ (کامران طفیل، پاکستان)

# خیال در خیال

محمد فاروق، لاہور

مولانا وحید الدین خاں رخصت ہو گئے ایک اور علم و معرفت کا گنج ہائے گراں مایہ دہلی کی خاک میں شامل ہو گیا۔ اکیس اپریل نے علامہ اقبال کے بعد ایک اور جلیل القدر عالم اور غیر معمولی شخصیت کا سانحہ ارتحال اپنے نام لکھ لیا۔ مولانا اپنی پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے، عموماً چھیانوے برس کا سفر کم ہی لوگ طے کرتے ہیں۔ ہر باشعور شخص جانتا ہے کہ اگلی منزل کیا ہو سکتی ہے۔ آخری ایام کی بیماریوں نے اندیشوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ مولانا کی زندگی کے ٹمٹماتے چراغ کو دیکھ کر دل بیٹھ سا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں خدا سے بڑا کوئی سہارا نہیں تھا۔ لہذا گھر بیٹھا ہوں یا راہ چل رہا ہوں ایک ہی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ مولانا کو کچھ ہو نہ جائے۔ فجر کی نماز ہو یا تراویح کا قیام، بس مولانا کی صحت کے لیے دست دعا دراز رہتے تھے۔ یا اللہ ابھی بہت کام باقی ہے۔ اے خدا! اِس مرد درویش کو تھوڑی مہلت اور دے دے۔

اچھی خبر آنے کی اُمید میں، میں دن میں واٹس ایپ کے متعلقہ گروپ کو بار بار دیکھتا۔ فیس بک کھولتا، کہیں آشاؤں کے پھول کھلتے نظر آ جائیں۔ کسی طرف سے اُمید بہار کی خوشبو آ جائے۔ اِس دوران اطلاع آئی کہ مولانا کی صحت میں کچھ استحکام آیا ہے۔ اِس خبرِ دلکش میں قیامت کا اثر تھا۔ آس کے پھول کھل گئے، آرزوؤں کے چراغ جھلملانے لگے۔ حوصلہ ہوا کہ مفسر قران اور داعی اسلام کا قلم پھر متحرک ہو گا، ایک محدث پھر احادیث کی حکمت کو عیاں کرے گا۔ لیکن اگلے دن خبر آئی کہ صحت میں استحکام تو ہے مگر بہتری کمیاب ہے۔ میں خود سے ہم کلام ہو گیا۔ یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے۔ ہماری دعاؤں کی تاثیر کہاں زائل ہو گئی۔ ہماری شب بیداری میں اثر کیوں نہ رہا۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے خدشات بڑھتے جا رہے تھے۔ 21 اپریل 2021 کو رات گیارہ بجے کے قریب مجھے اطلاع ملی کہ مولانا کو اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ مجھے اِسی ہونے کا ڈر تھا۔ مگر بشری کمزوری ہے کہ جن سے محبت ہو، اُن کی موت کا یقین نہیں آتا۔ عمر اور بیماری سب

ثانوی ہو جاتے ہیں۔ پھر اُس شخص کی موت کا یقین کیسے آسکتا تھا جو ہمیں جینا سکھاتا ہو۔ وہ آدمی کیسے خاموش ہوسکتا ہے جو کہتا تھا کہ —— جسے چپ رہنا آ گیا اُسے کلام کرنا آ گیا۔

میں نے جھٹ سے فیس بک گروپ دیکھا کہ شاید وہاں کچھ منظر مختلف ہو، مگر وہاں بھی یہی لکھا تھا کہ مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں چپ سا ہو گیا، قانون فطرت ہے کہ کل نفس ذائقۃ الموت۔ اِس کے سامنے سب بے بس ہیں کیا انبیا، کیا اولیا، کیا بادشاہ، کیا فقیر، کیا طبیب اور کیا مریض۔ بقا تو صرف میرے اللہ کو ہے۔ آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ دفعتاً حافظے نے کروٹ لی۔ میں نے تصور کی آنکھ سے زمانہ رسالت کو دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ آپ کے صاحبزادہ ابراہیم کی حالت نازک ہے۔ آپ عبدالرحمن بن عوف کے ساتھ ام سیف کے ہاں تشریف لائے۔ ابراہیم نزع کی حالت میں تھے۔ آپ نے ان کو گود میں لیا، چوما، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے جب اشک رواں دیکھے تو فرمایا ''یا رسول اللہ! آپ کی یہ حالت ہے۔ آپ نے فرمایا یہ رحمت ہے( إِنَّهَا رَحْمَةٌ ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 1303۔ یہ واقعہ یاد آنے کے بعد آنکھیں کھل کر برسنے لگیں۔ ایسے موقعوں پر آنکھوں کا ڈبڈبا جانا میرے نبی کی سنت ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

جن سے عقیدت ہو اُن کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے قدم خود بہ خود اُٹھ جاتے ہیں۔ نماز جنازہ صرف مرحوم کے لیے دعا مغفرت ہی نہیں ہوتی بلکہ پیچھے رہ جانے والوں کی طرف سے خراج محبت بھی ہوتا ہے۔ دہلی دور نہیں تھا جہاں پہنچا نہ جا سکے۔ مگر کیسے؟ ایک تو دہلی میں لاک ڈاؤن نافذ تھا۔ اگر وہ نہ بھی ہوتا، تو دو ملکوں کی باہمی کھینچا تانی میں محبتوں کو خراج کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں تو پیار، پریم، پریت، الفت، چاہ کے دیپ صرف اپنے دل میں جلائے جا سکتے ہیں، اور میں جلائے بیٹھا رہا۔

مولانا وحیدالدین خاں کی کتابیں، تقریریں منفرد اور جدید پیرائے میں ہیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ عصر حاضر کے تناظر میں دین اسلام کی سچی اور حقیقی روح کا احیا کیا جائے۔ اور اِس کے لیے سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ قران پاک کو پوری دنیا میں ہر خاص وعام تک پہنچایا جائے، اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کی روشنی میں عصری اسلوب میں ایسا لٹریچر تیار کیا جائے، جس کو جدید ذہن قبول کرے۔ کیوں کہ آج کا نوجوان قصہ کہانیوں سے نہیں بلکہ حقائق وشواہد سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ یوٹیوب کا

دلدادہ، سوشل میڈیا کا فریفتہ اور سائنس کی کتابیں پڑھ کر علوم قدیم کا ناقد بنا ہوا ہے۔ لہٰذا لٹریچر کی بنیاد حقائق و دلائل پر ہونی چاہیے، جو اُس کے دماغ کو اپیل کرے۔

اِس حوالے سے انھوں نے خود بہت کام کیا ہے۔ سو سے زائد کتابیں اُن کے قلم سے نکلی ہیں، اور ہر کتاب ایک شہ پارہ ہے۔ تفسیر تذکیر القران، مذہب اور جدید چیلنج، اسلام دور جدید کا خالق، فکر اسلامی، رازِ حیات، غرض ایک طویل فہرست ہے۔ مولانا اپنی ملّی ناکامیوں کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو قرار دیتے تھے۔ اُن کو اِس بارے میں یقین تھا کہ کامیابی و ناکامی کی جڑ ہمارے اندر ہے۔ اِس کی وجوہات و اسباب ہمیں اپنے اندر تلاش کرنا چاہیے۔ اگر ہم فتح کا پرچم لہراتے ہیں تو اُس کے بھی کچھ اسباب ہوتے ہیں، اور اگر شکست سے گزرتے ہیں تو اِس کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔ دوسروں کی شکایت کرنا، اپنی پسماندگی، جہالت کا قصووار غیروں کو ٹھہرانا، اپنی شکست و ناکامی کو اغیار کی سازش سمجھنا کسی طور پر قرین انصاف نہیں ہے۔ ہم اپنی جہالت اور درماندگی کے خود ذمہ دار ہیں۔ اغیار کی سازش کہہ کر ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

مسلمانوں کی ظاہری ترقی سے پہلے اُن کی باطنی ترقی ضروری ہے۔ اِس کے لیے لازم ہے کہ خالق و مخلوق میں زندہ تعلق پیدا ہو جائے اور بندہ مومن میں اطاعت الٰہی کا جذبہ بیدار ہو۔ عاجزی، انکساری، بردباری اُس کے کردار کا جُزءِ لازم ہوں۔ کیوں کہ ذات کی نفی کا ثمر ملت کے اثبات کی صورت میں ملتا ہے۔ دین اسلام توحید اور فکر آخرت میں سمایا ہوا ہے۔ اِن دو پہلوؤں کو چھوڑ کر اسلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ توحید، قیامت، جنت و جہنم اُن کا موضوع سخن رہا ہے۔ مزید اُن کے قلم میں تنقید کی کاٹ بہت تھی۔

سلف صالحین ہوں یا عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں اور تنظیمیں سب اُن کے تجزیاتی اور تنقیدی اُسلوب سے گزری ہیں۔ اور یہ طرز تحریر یقیناً بہت سے حلقوں کے لیے گراں بار تھا۔ مگر مولانا کے خیال میں، ہمیں جو محاسن نظر آئیں اُن کی نشاندہی کرنی چاہیے اور جہاں کہیں نقص نظر آئے اُس کو بھی عیاں کرنا چاہیے۔ تا کہ آئندہ ہم اپنی غلطیوں کو دہرانے سے بچ جائیں۔ مولانا امن کے بہت بڑے مبلغ تھے۔

اُن کو شکوہ تھا کہ مسلمان جنگ کی اہمیت جانتے ہیں، وہ امن کی اہمیت سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ہم امن سے وہ کچھ حاصل کر سکتے ہیں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ اور جنگ و لڑائی میں وہ

کچھ گنوا سکتے ہیں، جو ہمارے حاشیہ خیال میں کبھی آیا ہی نہ ہو۔ غزوہ بدر و احد اپنی جگہ اہم ہیں۔ اِن کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا ہے۔ لیکن صلح حدیبیہ فتح مبین کہلاتی ہے۔ اِس لیے مولانا فرماتے تھے کہ امن کو شرائط پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ امن کو قائم کرنے کے لیے صلح حدیبیہ کی طرح غیر مشروط ہونا چاہیے۔ جب امن ہوگا تو کامیابی کے مواقع عام ہوں گے اور فتح کے دروازے کھلیں گے۔ کیوں کہ اسلام امن کے ماحول میں آسانی سے دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ تاریخ میں ایسا ہوتا تو نظر آتا ہے کہ مسلمان کبھی کوئی جنگ جیتے اور کبھی ہارے ہوں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے دعوت و تبلیغ کے میدان میں کبھی مار کھائی ہو۔ اِس لیے اسلام کو سمجھنے کے لیے پُر امن ماحول اشد ضروری ہے۔

پھر مولانا غور و فکر (contemplation) کے قائل رہے، مراقبہ، سرور (meditation) اُن کی تعلیمات کا حصہ نہ تھے۔ کیوں کہ اِس تدبر و تفکر سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی دریافت اور سب سوالوں کا جواب خدا کی دریافت میں پوشیدہ ہے۔ گھاس کی پتی، پھولوں کی خوشبو، چاند کی چاندنی، سورج کی روشنی، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، کائنات کا پھیلاؤ، غرض ہر چیز پر غور و فکر خدا کی وحدانیت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ دریافت اللہ اور مومن میں ایسا تعلق پیدا کرتی ہے۔ جیسا گرڈ اسٹیشن اور گھر میں جلنے والے بلب میں ہوتا ہے۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو آپ کے دوست ہیں دوسرے وہ جن میں آپ کا دوست بننے کا امکان پوشیدہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اِس دنیا میں محبتیں، دوستیاں، تعاون، خیر خواہی، کامرانی کا زینہ ہیں۔ یہاں دشمنیاں، انتقام، حقارت، نفرت ایسے دلدل ہیں، جن میں اُتر کر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مثبت فکر کے ساتھ اور دوسروں کے خیر خواہ بن کر رہنا چاہیے۔ ہر فرد آپ کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آیا ہے۔ آپ کو محبت کرنی ہے نفرت نہیں۔ داعی پیکر محبت و صبر ہوتا ہے۔

مولانا صرف مذہبی عالم نہ تھے بلکہ وہ فلسفی و مفکر بھی تھے اُن کا خیال تھا کہ عام طور پر آدمی سماجی کنڈیشننگ کے تحت سوچتا ہے۔ جس چیز کو معاشرے نے اچھا کہا اُس کو وہ ساری عمر چھان پھٹک کے بغیر اچھا سمجھتا ہے، اور جس کو بُرا سنا اُس کو وہ کسی کسوٹی پر پرکھے بنا بُرا خیال کرتا ہے۔ مولانا چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو ڈی کنڈیشنڈ کر کے سوچیں۔ اور چیزوں کو ویسے دیکھیں جیسی وہ ہیں۔ موجودہ دور شر کا دور نہیں بلکہ دعوت کا دور ہے۔ کیوں کہ زمانہ حاضر میں دعوت کے مواقع بے شمار

ہیں۔الیکٹرانک اورسوشل میڈیا، کتابیں، رسالے بہت اہم کردارادا کر سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ آپ کسی بھی مغربی ملک میں جا کراپنی دعوت کا کام کر سکتے ہیں۔لہٰذا غیر مسلم کو دعوت دیں، اُنھیں کافر کہنے کے بجائے مدعو سمجھیں۔

مولانا اپنے آخری ایام میں اپنی ساری عمر کے مطالعہ اور مشاہدے کا حاصل و دریافت اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ''اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آدمی دنیا کا سفراس طرح کرے کہ اِس کے دل میں کسی کے خلاف ذرا بھر بھی کوئی منفی فکر نہ ہو۔ اِس سے بڑی کامیابی کوئی نہیں ہو سکتی کہ آدمی دنیا سے اِس طرح چلے جائے کہ اُس کا ذہن پوری طرح مثبت فکر کا حامل ہو۔اس دنیا میں سب سی بڑی نیکی مثبت سوچ ہے۔ اورسب سے بڑی برائی منفی فکر ہے۔ یہی میری زندگی کی آخری دریافت ہے۔''

''موت سے کس کو رُستگاری ہے''— جو یہاں آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن جانا ہے۔مولانا چلے گئے ہم نے اللہ کے فیصلہ کو قبول کرلیا۔کیوں کہ وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔اہل علم مولانا کی فکر، استدلال اوراسلوب کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کر سکتے ہیں،بعض سے اتفاق۔اور کرنا بھی چاہیے تنوع واختلاف زندگی کا حسن ہے۔لیکن یہ سب جزئی اورعام چیزیں ہیں۔اصل بات یہ ہے کہ دین اسلام کا جو حقیقی مطلوب ہے، مولانا اُسی کی دعوت دیتے تھے۔اوروہ اُس کے سب سے بڑے داعی، مبلغ اور عارف تھے۔

---

میں مولانا کی کتابوں کا مطالعہ غالباً 25 سال سے کر رہا ہوں۔مطالعہ کے دوران میری سوچ میں کافی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے۔لیکن کچھ باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں پہلے اِکرام مسلم میں جیتا تھا،لیکن آج میں اِکرامِ انسان میں جی رہا ہوں۔اللہ بہتر جانتا ہے کہ آج میرے دل میں کسی کے لیے کوئی نفرت نہیں ہے، نہ مسلمانوں کے لیے، اور نہ غیر مسلموں کے لیے۔اس کے علاوہ معرفت الٰہی، دعوت الی اللہ، تدبر قرآن، وغیرہ— یہ ساری چیزیں ہیں، جو مولانا کی کتابوں کے مطالعہ کے نتیجے میں مجھے حاصل ہوئی ہیں۔(عبدالرؤف خطیب، چپلون،سی پی ایس مہاراشٹر)

# بے مثال شخصیت

فاروق مضطر، راجوری، جموں

21 اپریل کی شب مولانا وحیدالدین خان صاحب داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے ہم سب سے رخصت ہو گئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کے امت مسلمہ پر بے پناہ احسانات ہیں جس کا اعتراف تمام علمی اور ملی حلقوں میں کھلے دل سے ہو رہا ہے ۔سوشل میڈیا اور پرنٹ میڈیا پر تعزیتی تاثرات کا سلسلہ جاری ہے اور ہر ایک شخص نہ صرف سوگوار ہے بلکہ فکرمند ہے کہ مولانا جیسی عبقری، صالح اور متحرک شخصیت کے سانحہ ارتحال کے بعد جو عظیم خلا پیدا ہوا ہے وہ کیسے پُر ہوگا۔

عام احساس یہی ہے کہ صدیوں بعد ہی ایسی مقتدر مخلص اور جامع العلوم اور جامع الکمالات اور جامع الصفات شخصیات ظہور پاتی ہیں ۔مولانا کی خدمات کی ابتدا تعمیر واصلاح ملت سے ہوئی اور آخر میں دعوتِ الی اللہ کے پیغمبرانہ مشن، ادخال کلمہ یعنی قرآنی پیغام کو ہر قوم ،نسل، خانوادے اور فرد تک پہنچانے پر موقوف ہوگئی۔

مولانا نے پون صدی سے زیادہ اپنی شعوری زندگی دین اسلام کے اصل ماخذوں یعنی قرآن و سنت کے ازسرنو مطالعہ کی بنیاد پر اسلام کی اساسی تعلیمات کو دریافت کرنے میں لگادی اور ان اساسی تعلیمات کی بنیاد پر احیائے اسلام وملت کا عظیم مشن الرسالہ مشن، القرآن مشن اور سینٹر فار پیس اینڈ اسپر یچویلٹی انٹرنیشنل کے نام سے تن تنہا منظم کیا تاہم جلد ہی اُن کے اخلاص کے جواب میں نصرت غیبی سے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگ دنیا بھر سے اس تحریک/ مشن سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔اور آج دنیا کی 30 سے زیادہ زبانوں میں قرآن کے تراجم موجود ہیں اور دنیا کے ہر کونے میں اس مشن کے وابستگان رضائے الٰہی کے حصول کے لیے سرگرم اور متحرک ہیں۔

مولانا کی تعلیمات کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہوا کہ اندرون خانہ جو گروہی مقابلہ ومناظرہ کا ماحول تھا نئی نسل نے اس سے مکمل طور اپنے کو الگ کرلیا اور محض تعمیری اور مثبت رویوں کی بنیاد پر احیائے ملت کے مشن سے اپنی وابستگی کو گہرا کیا۔

مولانا نے قرآن و اسلام کو انسانیت کا کنسرن بتایا انھوں نے بین المذاہب ڈائیلاگ کو رواج دیا اور ہر قسم کے تصادم اور تناؤ سے مسلم امت کو دور رہنے کی تعلیم و ترغیب دی۔ ملک کے اندر اور باہر ہر قسم کی نظری اور عملی انتہا پسندی کو پیغمبر اسلام کی تعلیمات کے منافی بتایا۔ برصغیر کی جدید تاریخ میں وہ پہلے مذہبی عالم ہیں۔ جو مسلمانوں کے علاوہ ہم وطنوں میں بھی برابر احترام اور عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا کی تصنیفات انگریزی، ہندی، عربی اور اُردو میں 200 سے زیادہ ہیں تاہم جو کتابیں بہت مقبول ہیں ان کے نام اس طرح ہیں: مذہب اور جدید چیلنج، مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے، الاسلام، عقلیات اسلام، ظہور اسلام، راز حیات، راہ عمل، صراط مستقیم، کتاب معرفت، مطالعۂ قرآن، معرفتِ قرآن، حکمتِ اسلام، عظمتِ قرآن، مطالعۂ حدیث، عظمتِ اسلام، مطالعۂ سیرت، پیغمبر انقلاب، سیرت رسول، الربانیہ، حقیقت کی تلاش، خدا کی دریافت، فکر اسلامی وغیرہ۔

مولانا نے اپنی ڈائریوں میں جو کچھ اپنے تجربات و مشاہدت یا تاثرات رقم کیے ہیں، وہ اعلیٰ پائے کا علمی ڈیٹا ہیں۔ اس میں اربابِ علم و دانش کے لیے اپنے علمی ذوق کی تسکین کا وافر سامان موجود ہے، اگر وہ بے تکلف اور بے تعصب ہو کر اس کا مطالعہ کریں۔

مولانا نے قرآن و اسلام کے فروغ و تعارف کے لیے دنیا بھر کے درجنوں ملکوں کے سفر کیے اور سفرنامے قلم بند کیے اور وہاں کے تہذیبی، ثقافتی ماحول کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور بتایا کہ زندہ قوموں کی کن امور پر خصوصی توجہ رہی ہے۔ اور دوسری اقوام کے بالمقابل مسلمانوں کی زبوں حالی یا پسماندگی کے کیا اسباب ہیں جن پر کام نہیں ہو سکا۔ اور اب کرنے کا کام کیا ہے۔

ان کی ایک نہایت وقیع تالیف تذکیر القرآن ہے، جو جدید محاورے کی زبان میں قرآن مقدس کی تفسیر ہے۔ اس میں انھوں نے دوسری تفاسیر قرآن کے بالمقابل علمی مباحث سے قطع نظر قرآنی پیغام کو کچھ اس طرح کھولنے کی کوشش کی ہے کہ ہر آیت اور ہر رکوع کے مطالعے کے بعد بندہ اپنے آپ کو خدا کی معیت میں محسوس کرے۔ بندہ خدا سے ہم کلامی کے تجربے سے گزرے اور اپنے آپ کو خدا کی پناہ میں محسوس کرنے لگے۔

انھوں نے ہند پاک ڈائری لکھ کر ایک طرف تقسیم وطن کے بحرانی منظر کو ہمارے روبرو کیا

ہے۔ دوسری طرف برصغیر کی قیادت کی ناعاقبت اندیشیوں کے حوالے سے بہت سے تاریخی حقائق سے پردہ اٹھایا ہے اور مسلم سماج کو حقیقت پسندانہ راہ عمل کو اپنانے کی صلاح دی ہے۔

الغرض انہوں نے جدید علم کلام، تجدید دین، حقیقت معرفت، اسلامی سماجیات، قرآن وسیرت، تعمیر واصلاح، دعوت واحیائے دین کو موضوع بنایا اور انتہائی مدلل اور موثر پیرائے میں عظیم الشان لٹریچر ہمیں دیا، جو مدتوں طالبان حق اور فلاح ونجات کے لیے فکرمند افراد کے لیے مفید اور راہ نما ثابت ہوگا۔

---

# ایک صاحبِ طرز داعی

## مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

مولانا وحید الدین خاں کی وفات اہلِ دین کے لیے باعث صدمہ ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ایک صاحبِ طرز داعی تھے جن کی ساری زندگی اسلام کی دعوت کو عام کرنے اور اپنی فکر کے مطابق دعوت کے ناگزیر تقاضوں کو اجاگر کرنے میں گزری۔ وہ دعوتِ اسلام کے روایتی اسلوب کے بعض پہلوؤں سے اختلاف رکھتے تھے اور اس حوالہ سے کچھ تفردات کے حامل بھی تھے مگر مجموعی طور پر ان کی محنت،

1۔ دعوتِ دین کے عصری تقاضوں کی نشاندہی

2۔ نوجوان نسل کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ

3۔ اور افہام وتفہیم کی عصری ضروریات

کو سامنے لانے کے لیے ہوتی تھی، اور یہی ان کی وسیع تر پذیرائی کا باعث تھی۔ برطانیہ کے ایک سفر کے دوران مجھے ان سے ملاقات وگفتگو کا موقع ملا تو ان کے خلوص وسادگی نے بہت متاثر کیا۔ ان کی گفتگو اور تحریر دونوں عام فہم اور مخاطبین کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سامنے رکھ کر ہوتی تھیں جو میرے نزدیک آج کے دور میں دعوتِ دین کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ اللہ تعالی مولانا کی کوششوں کو قبول فرمائیں اور عفو وفضل کے ساتھ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

# اپنے عہد کی ایک منفرد آواز

## جاوید احمد غامدی

مجھے بے حد صدمہ ہوا، مولانا وحید الدین خان ایک بڑی ہی غیر معمولی شخصیت تھے۔ میری نسبت تو ان کے ساتھ یہ ہے کہ ہم ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں، اس فرق کہ ساتھ کے انھوں نے استاد امام امین احسن اصلاحی (وفات 1997) سے ابتدائی دور میں تعلیم پائی اور مجھے یہ شرف استاد امام کے آخری دور میں حاصل ہوا۔ مولانا وحید الدین کی آواز ایک بڑی منفرد آواز تھی۔ ایسی منفرد کہ شاید نہ اس سے پہلے سنی گئی اور نہیں کہا جا سکتا کہ پھر کبھی سنی جائے گی۔ ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ دورِ حاضر میں دین کی جو سیاسی تعبیر کی گئی انھوں نے خالص علمی سطح پر اس کی غلطی واضح کی، ان کی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' کو پڑھ کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کیسا اعلیٰ درجہ کا محققانہ ذوق رکھتے تھے اور اگر وہ اس طرح کہ تحقیقی مباحث کو اپنا کام بناتے تو کیسی غیر معمولی چیز ان کے ہاتھ سے نکل سکتی تھی لیکن بتدریج انھوں نے تذکیر اور مسلمانوں کی عمومی اصلاح کو اپنا موضوع بنا لیا، چنانچہ اس لحاظ سے بھی بے مثال چیزیں ان کے قلم سے نکلی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جتنی چیزیں اُن کے قلم سے نکلیں موجودہ زمانہ میں بہت کم لوگ ہوں گے کہ جنھوں نے اتنا لکھا ہوگا اور وہ بھی ہر موضوع سے متعلق۔ تاہم اصل چیز یہی تھی کہ دین کی حقیقت واضح کی جائے۔ اللہ تعالی کی سچی معرفت لوگوں میں پیدا کی جائے۔ مسلمانوں نے اس وقت تک اپنے لیے جو سیاسی لائحہ عمل اختیار کر رکھا ہوا ہے اس کی غلطی اُن پر واضح کی جائے، مسلمانوں کے لیے کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ اس کو اُن پر واضح کیا جائے۔ یہ اُن (مولانا) کے موضوعات تھے۔ ان موضوعات میں بھی میں یا آپ یا کوئی بھی صاحبِ علم ان سے اختلاف کر سکتا ہے۔ لیکن وہ بڑی دردمندی کے ساتھ، بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنی بات بیان کرتے تھے، کہیں تمثیلوں میں، تو کہیں زندگی کے عمومی معاملات میں رکھ کر اسے واضح کرتے تھے اور ساری زندگی یہی کام کرتے رہے۔ 'الرسالہ' کو انھوں نے اس موضوع پر ایک کلاسک بنا دیا، ہمیشہ اس کو اسی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہے گا۔ اس لیے میں

نے یہ عرض کیا کہ مولانا اپنے عہد کی ایک منفرد آواز تھے جو نہ پہلے سنی گئی، نہ شائد اب سنی جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اخلاص اور اپنی دردمندی اور اپنے پروردگار کی سچی معرفت کے احساس کے ساتھ انھوں نے اپنی پوری زندگی بسر کی ہے۔

بعض موقعوں پر ان کی ڈائریوں کو اگر پڑھیں تو اس میں بہت سے علمی مباحث کے بارے میں بڑی نادر تنقیحات سامنے آتی ہیں۔ لوگوں کو اس حیثیت سے ان کا مطالعہ کرنا چاہیے، ان کو دیکھنا چاہیے، ان کے احوال کو دیکھنا چاہیے کہ ایک بے مثال شخصیت جو اپنی سیرت، اپنے کردار، اپنی دردمندی اور اپنے اخلاص کے لحاظ سے ہم سب کے لیے نمونہ تھی جو اب دُنیا سے رخصت ہو گئی۔ مسلمان بڑی بدقسمت قوم ہے کہ اپنی عظمتوں کے معاملے میں بھی اختلاف اور اتفاق کی بنیاد پر رائے قائم کرتی ہے۔ مولانا کی تحریروں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر نقد بھی ہوگا، اس سے اختلاف بھی ہوگا لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ آج ہمارے دور کی ایک عظمت رخصت ہو گئی ہے۔

میں اُن کے پورے کام میں سے دو چیزوں کو اُن کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں: اُن میں سے ایک دین کی اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ دین پروردگار کی حقیقی معرفت، اُس سے سچی محبت اور اُس کے امتثال امر کا نام ہے۔ اِس حقیقت کو اُنھوں نے ہر شخص پر واضح کرنے کی سعی کی اور اپنی پوری زندگی اِس کی نذر کر دی۔ اِسی طرح یہ بات بتانے کے لیے اُن کا قلم ایک گوہر بار قلم تھا کہ لوگ دین کی اصل کو دریافت کریں، اُس کے مقصود کو پانے کی جدوجہد کریں، اُن کے اندر اِس حقیقت کو سمجھنے کا داعیہ پیدا ہو کہ اُن کا مقصود آخرت ہے، اُنھیں ایک دن اپنے پروردگار کے سامنے اٹھنا ہے، اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اِس موضوع پر اُنھوں نے صفحے کے صفحے لکھے ہیں۔ اللہ کی یاد کی طرف توجہ دلائی ہے اور آخرت کی منادی کی ہے۔ یہ اُن کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو اُن کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رویوں کے بارے میں صحیح راہ دکھائی ہے۔ جب ایک شخص صحیح راستہ دکھاتا ہے تو بعض موقعوں پر کچھ سختی بھی آجاتی ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی اُنھوں نے مسلمانوں کی درست سمت میں رہنمائی کی ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو بتایا ہے کہ تم اپنی تاریخ کے پس منظر میں اِس وقت کس مقام پر کھڑے ہو، تمھارا اصلی مشن

کیا ہے، تمھیں اپنے سیاسی اور سماجی معاملات میں کیا رویے اختیار کرنے چاہئیں، تمھارے لیے مثبت طرزِ عمل کیا ہے جسے تمھیں ہدف بنا کر کام کرنا ہے؟ اِس معاملے میں جو بنیادی پیغام اُنھوں نے مسلمانوں کو دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ردِ عمل کی نفسیات سے نکل کر مثبت سوچ کے ساتھ دنیا اور اُس کے معاملات کو دیکھو۔ تمھارے پاس جو ایک بہت بڑی متاع ہے، دین کی متاع، اُس کو دنیا تک پہنچانے کی کوشش کرو۔

یہ جس کارنامے کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے، یہ بڑا غیر معمولی ہے۔ اِس لحاظ سے کہ دین کے مختلف احکام میں، اُن کی شرح و وضاحت میں اگر کہیں کوئی غلطی ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی صاحبِ علم کا کام غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ ان کے ساتھ لوگ اتفاق بھی کریں گے، اختلاف بھی کریں گے۔ مگر اِس سے کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً رفع یدین کے بارے میں ایک شخص کی ایک رائے ہے، دوسرے شخص کی ایک دوسری رائے ہے۔ اِسی طرح سجدہ کیسے کرنا ہے، تشہد میں کیسے بیٹھنا ہے، نماز کی ابتدا کیسے کرنی ہے؟ یا اِسی طرح کی بعض دوسری چیزیں ہیں۔ اُن میں اختلافات ہوتے ہیں، ہوتے رہے ہیں، ہوتے رہیں گے۔ لیکن دین بہ حیثیت مجموعی کیا ہے، اُس کا مقصد کیا ہے، وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، اُس کے احکام میں باہمی طور پر کیا نظم قائم ہوتا ہے۔

وہ بہت اچھا لکھنے والے تھے۔ اپنے بارے میں بالکل درست کہتے تھے کہ اُنھوں نے اردو زبان کو، خاص طور پر مذہبیات کے دائرے میں، ایک عصری اسلوب دیا ہے۔ وہ اپنی بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتے تھے، اُس کو تمثیلوں میں واضح کرتے تھے اور زندگی کے عمومی معاملات میں رکھ کر اُس کو دکھاتے تھے۔ ساری زندگی وہ یہی کام کرتے رہے۔

مسلمان بڑی بدقسمت قوم ہیں۔ یہ اپنی عظمتوں کے معاملے میں بھی اختلاف اور اتفاق کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض بہت بڑے لوگ ہیں جن سے ہم اختلاف کرتے ہیں اور بعض اوقات بڑا اصولی اختلاف کرتے ہیں، جیسے امام غزالی ہیں، شاہ ولی اللہ ہیں۔ لیکن کیا اُن کی عظمت کا انکار کر دیا جائے گا؟ ماضی کی شخصیات ہوں یا حال کی، ہمیں سب کے علم و فکر یا سیرت و کردار کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے، ادب اور شایستگی کے ساتھ اُن سے اختلاف کی روایت ڈالنی چاہیے۔

مولانا وحید الدین خاں تنہا کام کرتے تھے۔ کوئی جماعت، کوئی فرقہ، کوئی گروہ یا کوئی بڑا ادارہ

اُن کی پشت پر نہیں تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے — 'کان أمة فی رجل'۔ ایک ایسا آدمی جس کے وجود میں ایک پوری امت جمع تھی۔ وہ آدمی آج اپنے پروردگار کے پاس واپس چلا گیا ہے، گویا، ہمارے دور کی ایک بڑی عظمت تھی، جواب ہم سے رخصت ہوگئی ہے۔

اس طرح دعوت کو انھوں نے ایک لحاظ سے اپنی فکر، اپنی تمام تحریروں میں مرکزی حیثیت دی تھی۔ اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون۔ [یہ تحریر غامدی صاحب کی ویڈیو پیغام پر مبنی ہے]

---

## انسان کی تحریر اَبدالآباد تک باقی رہتی ہے

مولانا وحید الدین خان (1925-2021ء) کی رحلت ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مرحوم تقریباً ایک صدی تک پورے خلوص کے ساتھ ترویج وفروغِ اسلام کے لیے جہاد بالقلم میں مصروف عمل رہے۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کو روایتی انداز کے بجائے عصری مقتضیات کے مطابق پیش کیا۔ بصائر وعبر کا اظہار اور حقائقِ اسلامیہ کا انکشاف ان کی تحریروں کا خاصہ تھا۔ میں ان کے اہل خانہ اور محبین ومستفیدین سے اظہارِ تعزیت کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت فرمائے اور ان کے علمی شذرات سے اُمت مستفید ہوتی رہے۔ (ڈاکٹر محمد طاہر القادری، پاکستان)

---

اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مولانا کی علمی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ عصر حاضر میں قرآن پاک کی جو خدمت مولانا وحید الدین خاں صاحب نے کی، وہ نگاہوں کے سامنے ہے۔ مولانا نے جدید اور قابل فہم اسلوب میں دین کی تشریح کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور امت کے لیے چشمہ ہدایت بنادے۔ آمین (اویس احمد شانگلہ)

# مولانا وحید الدین خاں
## "ایک منفرد شخصیت"

شمشاد محمد خان، ڈائریکٹر آئی پی سی آئی، UK

یہ غالباً 1986ء کا واقعہ ہے کہ میرا ساؤتھ افریقہ جانا ہوا۔ قیام شیخ احمد دیدات کے مکان پر تھا۔ وہ ویرالم میں قیام پذیر تھے۔ یہ چھوٹا شہر ڈربن کے نزدیک واقع ہے۔ جہاں ان کا دفتر ہے۔ ان کے یہاں قریباً ایک ہفتہ مقیم رہا۔ ان کی کتب بھی دیکھنے کو ملیں۔ اور وہیں میں نے انگلش کا الرسالہ دیکھا، بہت پسند آیا۔ شیخ دیدات سے اس بارے میں بھی گفتگو ہوئی۔ وہ الرسالہ سے بہت متاثر تھے۔

انگلینڈ واپس پہنچ کر میں نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کو فون کیا۔ فون پر ان کی آواز ایک جوان آدمی جیسی لگی۔ کافی طویل گفتگو رہی۔ ان کو انگلینڈ آنے کی دعوت بھی دی، جو محترم نے قبول کرلی۔ الرسالہ کا آرڈر بھی دیا اور درخواست کی کہ ہر ماہ اردو اور انگریزی کے شمارے روانہ کیے جائیں۔

اور پھر الحمدللہ مولانا صاحب کئی دفعہ انگلینڈ تشریف لائے، یہاں ان کی تقاریر کے کئی پروگرام بھی کروائے جو ماشاء اللہ بہت کامیاب رہے۔ ان کے چاہنے والے یہاں پہلے سے موجود تھے۔ اب تعداد اور بھی بڑھنے لگی تھی۔

پھر 1999ء میں میرا اہلیہ کے ساتھ انڈیا جانا ہوا، مولانا کے یہاں ہی قیام تھا۔ بھائی ڈاکٹر ثانی اثنین بھی اپنی والدہ اور ہمشیرہ ڈاکٹر فریدہ خانم اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہیں مقیم تھے۔ ان کے بچے عدنان اور ماریہ اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ ان کی معصوم اور دلچسپ باتیں سن کر ہم سب بہت محظوظ ہوا کرتے۔ عدنان کا یہ جملہ "ماڑیہ گڑ گئی" (ماریہ گر گئی) یاد آتا ہے تو اب بھی زیرلب مسکراہٹ ابھر آتی ہے۔

مولانا صاحب سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی اور بہت کچھ سیکھا۔ میں نے جانا کہ مولانا صاحب کی سوچ بہت گہری تھی۔ ان کا ایک اپنا انداز فکر تھا۔ جو بلاشبہ لمبی تحقیق کے بعد رونما ہوتا ہے۔ وہ دین اسلام کے معاملہ میں بہت ہی سنجیدہ تھے اور مسلمانوں کے سچے خیر خواہ۔

اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان سے رابطہ رہا۔ اور ذہن میں جو سوالات ہوتے ان کا تسلی بخش جواب ملتا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ میرے استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔

مولانا صاحب 2000ء میں برمنگھم انگلینڈ تشریف لائے، ان کے پروگرام کا اہتمام ریکس سینٹر (Rex Centre) میں کیا گیا تھا۔ یہ بلڈنگ میں نے 1998 میں اپنی کمپنی ڈومیسٹکس (Domestiks) کے کاروبار کے لیے خریدی تھی۔ انھوں نے اس وقت یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ اس بلڈنگ کو اسلامک سنٹر بنادے۔ ان کی دعائیں اللہ رب العزت قبول فرماتے۔

آج اس بلڈنگ کا نام دی یونیٹی سینٹر (The Unity Centre) ہے، اس کی دوسری منزل پر مسجد ہے۔ پہلی منزل پر اسلامک ایکزیبیشن (Islamic Exhibition) اور گراؤنڈ منزل پر اسلامک سٹور اور آئی پی سی اسلامک ویزن (IPC-Islamic Vision) کی کتب کا سٹور ہے۔ یہاں سے گڈورڈ بکس (Goodword Books) کی کتابیں اور اسلام سے متعلق مطبوعات پورے برطانیہ اور دیگر ممالک کو فراہم کی جاتی ہیں۔ میں نے جانا کہ مولانا صاحب بولتے کم اور سنتے زیادہ تھے۔ وہ ہر شخص سے سوالات کرتے، وہ دیکھتے کہ ہر شخص ایک کتاب ہے۔ اور ہر شخص کی ایک منفرد داستان ہے۔ وہ گفتگو کے دوران ایسے کمیاب موتی تلاش کر لیتے جو دوسروں کے لیے سبق آموز ہوں اور جنھیں شیئر کیا جا سکے۔

وہ ہر واقعہ سے ایک سبق آموز پہلو نکال لینے کی انوکھی صلاحیت رکھتے تھے، پھر وہ اس کو آخرت سے جوڑ دیتے جو ایمان میں اضافہ اور تقویت کا سبب بنتا۔ مولانا صاحب کی یہ انمول اور نایاب صلاحیت یقیناً خدا داد تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک گفٹڈ (gifted) شخصیت تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ایمان میں اضافہ ہوتا اور ان کو دیکھ کر اللہ تعالی کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب تصور کرتا ہوں یہ سوچ کر کہ اس ناچیز کو مولانا صاحب کے ساتھ ایک خاص تعلق رہا۔ اور ان کے ساتھ وقت گزار کر بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ بہرحال یہ دنیا تو فانی ہے، ہر ایک کو جلد یا بدیر یہاں سے کوچ کر جانا ہے۔ IPCI سینٹر کے سب لوگ ان کو بہت یاد کرتے ہیں، ان کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی ان کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور آخرت میں ہمیں جنت میں ان کے ساتھ مجالس میں شریک ہونے کا شرف عطا فرمائے، آمین۔

# ایک عارف باللہ کی بات

حافظ سید عمیر احمد عمری مدنی، عمرآباد، تامل ناڈو

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا وحید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم شخصیت صدیوں میں کہیں کہیں پیدا ہوتی ہے۔ بجا طور پر انھیں ایک تاریخ ساز شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی دین وملت کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ چاہتے تو بڑے عیش وآرام سے زندگی گزار سکتے تھے۔ مگر انھوں نے سادگی کو پسند کیا۔ فقیرِ بے نوا کی طرح زندگی گزار دی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ صوفی منش تھے۔ آپ کی زندگی اس حدیث کے مطابق تھی، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ؟ قَالَ: مَنْ طَالَ عُمْرُهُ، وَحَسُنَ عَمَلُهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 17698)۔ یعنی لوگوں میں بہتر کون ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ جس کی عمر طویل ہو، اور اس کے اعمال اچھے ہوں۔

جہاں آپ کو مشرقی علوم میں گہرائی تھی، وہیں مغربی علوم میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ آپ کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ آپ نے الرسالہ کے ذریعے تنہا وہ خدمت انجام دی، جو ایک ادارے کے لیے بھی مشکل تھی۔ تقریباً چالیس سال سے آپ نے الرسالہ کے ذریعے خدا کے بندوں کو خدا کا پیغام پہنچانے کی آخری حد تک کوشش کی۔ اور یہ رسالہ ہر ماہ وقت سے پہلے ہی منظر عام پر آجایا کرتا تھا۔ اس کی اشاعت میں کوئی رکاوٹ مانع نہیں تھی۔

نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ ملک سے باہر بھی حق کا پیغام پہنچانے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں زندگی بھر سفر کرتے رہے۔ آپ کو کئی زبانوں میں عبور حاصل تھا۔ اردو آپ کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ فارسی، عربی، اور انگریزی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ تذکیر القرآن آپ کی ایک قابلِ قدر اور مقبول تفسیر ہے، یہ ہر خاص وعام کی پسندیدہ تفسیر ہے۔ مذہب اور جدید چیلنج اور کتابِ معرفت اور ان جیسی سینکڑوں کتابیں آپ نے تصنیف کی۔ الرسالہ کا ہر ورق زندگی کا بھرپور پیغام دیتا ہے۔ ہر صفحہ کے اندر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کردیا گیا ہے۔

# ایک خط

کاندھلہ

۱۱ رمضان المبارک ۱۴۴۲

محترم مکرم جناب ڈاکٹر صاحب، دام مجدکم

السلام علیکم!

آں جناب کے گرامی مرتبت والد مکرم کی وفات پر تعزیت پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالی مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور آپ جیسے فاضل شخص کو میں کیا کہوں، کیا لکھوں۔

میری مولانا سے واقفیت اور ملاقات بہت پرانی تھی، جب وہ جمعیت علماء کی بلڈنگ میں گلی قاسم جان میں اوپر کمرہ میں رہتے تھے، اس وقت میرا مولانا کے پاس بارہا جانا ہوتا رہا، بعد میں بھی بنگلہ والی مسجد بستی حضرت نظام الدین میں جب وہ اکثر آیا کرتے تھے اور مولانا عبید اللہ بلیاوی اور مولانا اظہار الحسن کاندھلوی سے بطور خاص رابطہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر مولانا سے نیاز حاصل ہوا۔ مولانا کی ادارت میں جو ہفت روزہ الجمعیۃ چھپتا تھا، اس کا تقریباً مکمل فائل میرے پاس ہے اور اگرچہ مولانا کے بعض نظریات سے صاف اختلاف تھا اور ہے، لیکن مولانا کی تالیفات اور الرسالہ اہتمام سے پڑھتا رہا، بہرحال مولانا کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، مستقبل میں اس کا پر ہونا آسان نہیں۔ اس نقصان کی تلافی متوقع نہیں۔ اور کیا عرض کروں۔

نور الحسن راشد کاندھلوی

مولویان، کاندھلہ، ضلع شاملی۔ یوپی

۲۴ / اپریل ۲۰۲۱ء

# اسلامی، علمی وفکری روایات کا سنگ میل

سید سعادت اللہ حسینی، امیر جماعت اسلامی ہند

مولانا وحید الدین خانؒ کی رحلت سے بہت صدمہ پہنچا۔ مولانا بلا شبہ ان مفکرین میں سے ہیں جنہوں نے موجودہ زمانے پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ملک میں مختلف مذہبی فرقوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے اور ان کے درمیان مکالمہ وتبادلہ خیال کی فضا پیدا کرنے میں مولانا کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ اسلام کو جدید اسلوب میں اور محکم سائنسی و منطقی دلائل کے ساتھ پیش کرنے کے لیے مولانا مرحوم کی کوششیں بھی ان شاء اللہ ان کے لیے صدقہ جاریہ بنیں گی۔ مذہب اور جدید چیلنج، عظمت قرآن، اسلام دور جدید کا خالق، پیغمبر انقلاب وغیرہ جیسی معرکتہ الآرا تصانیف نے، مولانا کو برصغیر کی اسلامی علمی روایات کا ایک اہم سنگ میل بنا دیا ہے۔

مولانا اردو نثر کے ایک بالکل منفرد اور بڑے پر کشش اسلوب کے بانی ہیں۔ انتہائی سادہ زبان میں بڑے اختصار کے ساتھ گہرے علمی مضامین کو بیان کرنے کا جو اسلوب مولانا نے ایجاد کیا وہ بلاشبہ ان کا غیر معمولی کمال تھا اور اس نے کئی نسلوں کے اسلوب تحریر پر اثر ڈالا ہے۔ انگریزی اور مختلف علاقائی زبانوں میں پر کشش لٹریچر کی تیاری بھی ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں لمبی عمر عطا کی اور اس لمبی عمر کا پورا حصہ جس خوبی سے انھوں نے بڑے کاموں کے لیے استعمال کیا اور جتنا بڑا علمی ورثہ چھوڑ گئے ہیں، اس پہلو سے بھی وہ ہماری حالیہ تاریخ میں منفرد ہیں۔

دین کی تعبیر اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے رویوں اور طریقہ کار پر مولانا مرحوم کے مخصوص خیالات تھے۔ ان خیالات سے بہت سے اہل علم نے بجا طور پر اختلاف بھی کیا ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے مولانا کے علمی کارناموں اور ان کی عظیم خدمات کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ وہ جدید علم کلام کے اساطین میں سے ایک ہیں۔ اور ان شاء اللہ ان کے علمی کاموں سے اسلام کے خادمین فیض یاب ہوتے رہیں گے اور عام انسانیت بھی ان کی تصانیف کے واسطے سے اسلام سے متعارف ہوتی رہے گی۔

مولانا سے ذاتی طور پر میں نے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ بچپن ہی سے ان کی کتابیں اور

ماہنامہ الرسالہ پڑھتا رہا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں ایس آئی او کے متعدد کیمپوں میں ان سے استفادہ ہوتا رہا۔ ان کے دولت کدے پر بہت سی یادگار ملاقاتیں رہیں۔ مولانا کی شفقت و محبت، فکری اختلاف کے باوجود خرد نوازی اور ہماری حقیر کاوشوں کی قدردانی اور فیض رسانی کے لیے ہر دم تیار رہنے کی خوبی سے میں ہمیشہ بے حد متاثر ہوا۔

ان کی رحلت سے اسلامی کاوشوں کے علمی محاذ پر جو بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ اسے پر فرمائے۔ ہم ان کے فرزندان ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، ڈاکٹر ثانی اثنین خان اور دیگر اقارب کے غم میں شریک ہیں۔ اور ان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں۔

---

## وحید الدین خان کی رحلت

مولانا وحید الدین خان کے انتقال کی خبر سن کر لمحہ بھر کے لیے سانس رک سی گئی۔ روایتی مذہبی ماحول کی زنجیروں اور جکڑ بندیوں سے ایک شخص خود کو کس طرح آزاد کر سکتا ہے؛ یہ سبق ہم خان کی زندگی سے سیکھ سکتے ہیں۔ خان فرقہ وارانہ آلودگیوں سے بلند ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح پہنچے۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے تعلیم حاصل کی۔ بعد میں وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے اور پھر مولانا مودودی کی فکر کا بھرپور نقد لکھا۔ ان کا فکری ارتقاء جاری رہا اور بعد کے دور میں انہوں نے خود اپنے ہی بعض سابقہ نظریات کے خلاف لکھا۔ یہ انتقادی کاوش قابلِ تحسین ہے۔ وہ ان چند علماء میں سے تھے جنہوں نے قرآن کو خود قرآن کے زاویۂ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ خان کی وفات میرے لیے ایک ذاتی صدمہ ہے۔ کل سے میں اس صدمے سے نڈھال ہوں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے؛ ہندوستان میں دیکھنے کو اب تاج محل ہی رہ گیا، مولانا تو ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ (ڈاکٹر خضر یاسین، پاکستان)

# مرحوم کی 'مذہب اور جدید چیلنج' منفرد تصنیف

مفتی ناصرالاسلام فاروقی، مفتی اعظم جموں وکشمیر

22اپریل کی صبح مجھے یہ خبر ملی کہ عالمی شہرت یافتہ عالم دین ومفکر اسلام مولانا وحیدالدین خان رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خبر میرے ذہن میں گردش کرتی رہی اور ذہن میں مرحوم کی وہ تمام تحریریں گردش کرنے لگیں جو میری نظروں سے گزری ہیں۔ بالخصوص ان کی مشہور ومعروف تصنیف ''مذہب اور جدید چیلنج'' جس کا آج بھی متبادل تلاش کرنا مشکل ہے۔ مولانا ایک وسیع المطالعہ اور کثیر اللسان عالم تھے۔ بلکہ ایک مجتہد تھے، ان کے اجتہادات سے گو اختلاف کی گنجائش ہے، تاہم مجموعی طور پر ان کی خدمات ملک وملت کے تعلق سے بے پناہ اہم اور راہنمایانہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان کی تصنیفات کا مطالعہ کریں اور مفید پہلوؤں سے راہ نمائی لیتے ہوئے اپنی اور سماج کی تعمیر نو کریں۔

ان کی تصانیف، مثلاً ظہورِ اسلام، یکساں سول کوڈ، ''مارکسزم — تاریخ جس کو رد کر چکی ہے'' مولانا نے اس دور میں تحریر کی جس دور میں مارکسزم کا ڈنکا پوری دنیا میں بج رہا تھا۔ اسی طرح جب شاہ بانو کا مشہور مقدمہ پورے ملک میں زیر بحث آیا تو مولانا نے 'یکساں سول کوڈ' تحریر کر کے قانونی دانشوروں کو حیران کر دیا۔ اسی کتابچہ کے حوالے سے مولانا علی میاں اور مولانا ابواللیث اصلاحی امیر جماعت نے بھی اس کی اشاعت کے فوراً بعد مولانا کو اس عظیم مدلل کتابچے کے لیے مبارک باد دی تھی اور بہت سراہا تھا۔ اختلاف رائے کس شائستگی کے ساتھ ہونا چاہیے یہ بھی مولانا موصوف کی تنقیدی تحریروں سے ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ کوئی بھی علمی سماج ان کے علمی وفکری سرمایے کو نہ فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز۔

---

مجھے مولانا صاحب کی فکر سے تعارف میں بہت وقت لگا مگر جب ہوا تو زندگی مکمل بدل گئی۔ قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ اور ان کی بہت سی کتابوں نے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ (اسد ربانی، ڈپٹی ڈائریکٹر، پنجاب آرٹ)

# آہ! وہ فکرِ آخرت میں آنسو بہانے والا نہ رہا!

عابد حسین رحمانی، فاضل دارالعلوم دیوبند (سابق امام جامع مسجد تھنہ منڈی)

مولانا وحیدالدین خان کے ارتحال کی خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔ میں ذاتی طور پر لڑکپن سے مولانا کو برادرم محمد فاروق مضطر کی وساطت سے جانتا تھا۔ مگر کمسنی اور روایتی طرز فکر کے باعث میں ان کی مجالس سے، جب دو مرتبہ وہ راجوری تشریف لائے، بھرپور استفادہ نہ کرسکا۔ البتہ حالیہ آٹھ دس سالوں سے میں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بلکہ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اگر ان سالوں میں میں نے ان کی تصانیف نہ پڑھی ہوتیں تو رسمی اور رواجی دین کے خول سے کبھی باہر نہ آسکتا۔

انہوں نے دین کے حوالے سے سمجھایا کہ سب انسان آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ سب انسانوں سے محبت کرنا، صبر اور مثبت سوچ کا طریقہ اختیار کرنا، نفرت کو ذہن سے نکال دینا، اپنا نقصان برداشت کرنا مگر دوسرے کو نقصان نہ دینا، حسد و تعصب سے خود کو محفوظ رکھنا۔ دشمن کے لیے دعا کرنا، عالمی پس منظر میں اسلام کی پُرامن تعلیم پر واضح طور پر لکھنا اور اسلام کے چہرے سے تشدد کا غبار قرآن وسنت کی روشنی میں ہٹانا، دعوت کو ہزار سالہ غفلت کے بعد اس دور کی چیز بنانا۔ ایسی بہت سی باتوں میں مولانا مرحوم کو انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ سب سے بڑھ کر اپنی گفتگو میں فکر آخرت پر رو پڑنا، ان کا خاصہ تھا۔

اب لازماً ہم ان کی کتب، اسفار اور ڈائریوں کو پڑھ کر فکر آخرت اور معرفت کا اور زمانہ شناسی کا سبق لے لیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ایسے مخلص بندۂ خدا کا قائم کردہ دعوتی نظم جو بفضل تعالیٰ اب عالمی حیثیت حاصل کر چکا ہے، تا قیامت پھلتا پھولتا رہے گا اور مرکز اسلامی کے ذمہ دار اسی حوصلے اور دانشمندی سے جو اُن کو مولانا سے ورثے میں ملا ہے، قائم ودائم رکھیں گے۔ اللہ نصرت غیبی سے اس خلا کو پُر کرے گا، جو ہم قدم قدم پر ان کی کمی محسوس کرتے ہیں۔

# مولانا وحید الدین خاں

ابو یحی، کراچی، پاکستان

21 اپریل 2021 کی شب مولانا وحید الدین خان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا نے چھیانوے برس کی عمر پائی۔ وہ تقریباً پچھلے ستر برسوں سے تحریر و تقریر کے ذریعے سے لوگوں کی تربیت کر رہے تھے۔ پچھلی نصف صدی سے ان کا کام ایک باقاعدہ مشن کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ ہر طرح کے منفی حالات سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کیا جائے۔ یہ ان کا طریقہ کار ہی نہیں، ان کا بنیادی پیغام بھی تھا کہ ہر طرح کے منفی حالات میں مثبت مواقع ڈھونڈ کر اپنا کام کیا جائے۔ وہ ساری زندگی جو دوسروں سے کہتے رہے، عملاً خود بھی کرتے رہے۔

برصغیر کے روایتی ماحول میں جہاں پر مقبولیت کا راستہ یہی ہے کہ سیاست اور فرقہ واریت پر جذباتی گفتگو کی جائے یا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے سے اپنی پہچان بنائی جائے، مولانا نے مثبت سوچ کے فروغ کو اپنا بنیادی مشن بنایا اور کتب و مضامین کے نسبتاً محدود راستے کو مستقل مزاجی سے اختیار کیا۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مولانا کے غیر معمولی علمی قد وقامت اور انتہائی متنوع کام کے باوجود ان کا مشن کامیاب نہیں ہوا۔ مگر معاملہ ایسا نہیں ہے۔

مولانا وحید الدین خان کے انتقال کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ یہ کہ سوشل میڈیا پر جہاں سماج کا باشعور طبقہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اس کی آمد کے بعد پہلی دفعہ اتنے بڑے پیمانے پر کسی شخصیت کے انتقال پر لوگوں نے تعزیت کی، اظہارِ عقیدت پیش کیا، ان کے کام کا اعتراف کیا اور ان اثرات کا ذکر کیا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مولانا کے کام سے ان پر پڑے۔ مولانا کی وفات پر ہونے والا یہ عجیب واقعہ اس بات کی زندہ مثال ہے کہ تعمیری کام جب مستقل مزاجی سے کیا جائے تو آخر کار وہ اپنے اثرات پیدا کر لیتا ہے۔ یہ اثرات اس معاشرے میں بھی ظاہر ہو جاتے ہیں جہاں سیاست اور فرقہ واریت سب سے زیادہ اہم بن چکے ہوتے ہیں۔

مولانا کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ نے انھیں ایک صدی کی مہلت عمل دی۔ وہ متعدد زبانوں کے

ماہر اور انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے۔علوم اسلامی کے ماخذوں تک ان کی براہ راست رسائی تھی۔ کسی بھی علم وفن کے ثانوی مصادر کے علاوہ بنیادی ماخذ بھی ان کے علم کی زد میں تھے۔ اس تمام مطالعے کو وہ انتہائی گہرے غوروفکر کے ساتھ اپنے ذہن کا حصہ بناتے، اس کا تجزیہ وتحلیل کرتے اور اس سے نتائج اخذ کرکے وہ اپنے حالات کے لحاظ سے ان نتائج کا اطلاق کرتے تھے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ ان کا قلم انتہائی تیز رفتار اور ان کا اسلوب تحریر اتنا ہی موثر بھی تھا۔ انھوں نے انتہائی متنوع موضوعات پر تقریباً پون صدی تک مسلسل لکھا۔ اس عرصہ میں انھوں نے دوسو کے قریب کتابیں تصنیف کیں اور پچاس سال تک ایک ایسا رسالہ نکالا جس کی تمام تحریریں انھی کی لکھی ہوئی تھیں۔ اپنی زندگی کی آخری ربع صدی میں انھیں اپنے کاموں کے ابلاغ کے لیے ایک بہت موثر ٹیم بھی مل گئی تھی اور ساتھ میں انٹرنیٹ کی ایجاد نے ان کے تمام مواد کو دنیا بھر کی دسترس میں پہنچا دیا تھا۔

وہ واحد مسلم رہنما اور عالم تھے جنھوں نے سات عشروں تک مسلسل لکھا اور جن کے افکار سے تین نسلیں ان کی زندگی ہی میں متعارف ہوگئیں۔ جن کا رسالہ اور کتابیں اردو، انگریزی، عربی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوکر ربع صدی سے انٹرنیٹ پر بلا معاوضہ اور با آسانی دستیاب ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کے افکار کو پڑھنے والے دنیا بھر میں موجود ہیں۔ جنھوں نے سیکڑوں ملکی اور بین الاقوامی سفر کرکے ہر طرح کی کانفرنسوں، مجالس اور اجتماعات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ہر گروہ کے ساتھ مکالمہ اور گفتگو کی۔ ان کی کتابوں اور خاص کر ترجمہ قرآن کا درجنوں زبانوں میں ترجمہ ہوکر دنیا بھر کے غیر مسلموں میں پھیل چکا ہے۔

مولانا نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی منادی، الحاد کے مقابلے میں اسلام کے استدلال، آخرت کی یاد دہانی، مثبت اندازِ فکر اور کردار سازی جیسے بنیادی کام اُس اعلیٰ سطح پر کیے جس کی دوسری نظیر اِس دور میں ڈھونڈنا آسان نہیں۔ جس شخص کے کام اس درجہ میں پھیلے ہوئے ہوں، اس سے کوئی اختلاف کرے یا اتفاق، وہ بلاشبہ مسلمانوں کی تاریخ کے بڑے لوگوں میں سے ایک میں شامل کیے جانے کے قابل ہے۔ اور جس شخص کا کام اس سطح کا ہو، اس پر نہ ایک نشست میں بات ہوسکتی ہے اور نہ ایک مضمون اس کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ (بشکریہ ماہنامہ انذار، کراچی)

# موت العالِم موت العالَم

خواجہ عبدالرسول، سجادہ نشین خانقاہ جنیدیہ

مولانا وحیدالدین خاں بھی چل دیے، وحیدالدین خاں صاحب ایک بے نام صوفی تھے۔ایک ایسے صوفی جنہوں نے کبھی لفظ صوفی استعمال نہ کیا۔لیکن انہوں نے جو تعلیمات اپنی گرانقدر کتب میں چھوڑی ہیں وہ درحقیقت اصل تصوف ہے۔انہوں نے علمائے ظواہر کی سیاسی تعبیر دین سے ہٹ کر دین کا مخاطب فرد اور فقہی موشگافیوں کے بجائے تزکیہ نفس کو قرار دیا۔ان کا سارا وقیع علمی کام انسان کے اخلاقی وجود کو مخاطب کرتا ہے۔

آپ نے جدید اذہان کو دین کی حکمت سمجھانے کے لیے خالصۃً ادیبانہ اور سائنسی اسلوب اختیار کیا۔مولانا کی تفسیر، تذکیر القرآن، بلاشبہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بلاالبیل مقاصد تصوف کی بلند پایہ تفسیر ہے۔جس میں اگرچہ صوفیانہ قیل وقال، فنی اصطلاحات اور فقہی وکلامی موشگافیاں تو نہیں البتہ جو تصوف کا مقصود ہے یعنی انسانی تزکیہ اور تصفیہ قلب وہ سب موجود ہے۔وحیدالدین خان اگرچہ علمائے ظواہر کے نزدیک ناپسندیدہ شخصیت تھے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے فرقہ واریت سے اوپر اٹھ کر دین کو تزکیہ کا مؤید ثابت کرکے انتہائی اہم خدمات سرانجام دی ہے۔

اختلاف علمی تو ارتقائے علمی کا موجب ہوا کرتا ہے وہ تو ہمیں بھی بعض جزئیات میں مولانا سے ہو سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک بلند پایہ ادیب، محقق اور مفسر تھے جن کے اثرات تاریخ حذف نہیں کرسکتی۔ہم ان کے لواحقین، متعلقین اور تلامذہ سے اظہارِ تعزیت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بلندئ درجات کے لیے دعا گو ہیں۔

---

میں اگر کسی اسلامی عالم سے متاثر ہوا ہوں تو وہ یہی ہستی تھی۔اسلام کا سچا چہرہ دکھانے والے۔اللہ رب العزت کی عطا کردہ انسانی ذہانت کا شاہکار۔(عمران علی، کراچی)

# ایک یادگار گفتگو

## جو قلب وذہن پر گہرے نقوش چھوڑ گئی

مولانا غلام قادر بانڈے، مہتمم جامعہ ضیاء العلوم، پونچھ

یہ غالباً 1970ء کی بات ہے جب میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے تازہ دم فارغ ہوا تھا اور دارالعلوم محمدیہ میل کھیڑا راجستھان میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا، دوپہر کی دھوپ کے وقت ایک الگ سایہ دار جگہ پر ہم چند نوجوان فضلاء اپنی معمول کی بات چیت میں مصروف تھے تو دیکھا ایک بارعب شخص جو عالمانہ وضع قطع کے مالک تھے، ہمارے درمیان بے تکلفی سے آ بیٹھے اور انہوں نے شائستہ علمی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ہم نوجوان فضلاء سے کچھ سوالات کیے۔ جن میں دو سوالات بہت اہم تھے، پہلا سوال یہ تھا کہ اقلیت اور اکثریت کا دارومدار کس بات پر ہے؟ اور دوسرا سوال تھا کہ مسلم اور غیر مسلم لیڈر میں کیا فرق ہے؟

چوں کہ ہم نوجوان فضلاء سیاسیات اور سماجیات سے زیادہ آگاہ نہ تھے، اس لیے ہم سے جو بھی روایتی جوابات بن پڑے ہم نے دیے۔ ہمارے جوابات سے مطمئن نہ ہونے کے بعد مولانا موصوف نے اپنے سوالات کی خود سے وضاحت کی۔ ان کی اس ملاقات نے ابھی تک میرے قلب وذہن پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ پہلے سوال کا جواب انہوں نے بتایا کہ ''اقلیت واکثریت کا دارومدار تعلیم پر ہے جو قوم تعلیم یافتہ ہے وہ کبھی بھی اقلیت میں نہیں ہوسکتی''۔ دوسرے سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ''غیر مسلم لیڈر منصوبہ بندی اور دانشمندی سے معاملات کو سلجھاتا ہے جب کہ مسلم لیڈر اشتعال اور جذبات کی رو میں بہہ کر قوم کے لیے مزید مسائل پیدا کر دیتا ہے''۔ یہ یادگاری گفتگو کرنے والا کوئی اور شخص نہیں بلکہ مولانا وحیدالدین خان صاحب تھے۔

عمر اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب سماجی اور سیاسی معاملات کا شعور ہوا تو مولانا کی تشریح وتعبیر کو درست پایا اور قوم کے تئیں مولانا مرحوم کی سنجیدگی اور تڑپ کو انتہائی مخلص پایا۔ مولانا مرحوم جواب اس دارفانی سے کوچ کر گئے اور ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے، اپنی ذات میں ایک انجمن

تھے۔ اپنے علمی، تحقیقی اور تصنیفی کمالات کے لیے مولانا کو تاریخ میں وہ نمایاں جگہ ملی ہے جہاں بہت کم لوگ ہی پہنچ پائے ہیں۔

مولانا سے بعض امور میں اختلاف رائے کی گنجائش کے باوجود یہ اعتراف ہم پر لازم ہے کہ بحیثیت مجموعی ان کی کاوشیں، ان کی رہنمائی ہمارے لیے بہت درست اور بروقت تھی۔ چونکہ ملی سطح پر ہمارا شیرازہ بکھرا ہوا ہے، اس لیے کسی بھی مخلص قائد کے لیے یہ آسان بات نہیں کہ قوم اس کی قیادت تلے جمع ہونے پہ راضی ہو جائے اور اختلافات سے بالاتر ہو کر اجتماعی مفاد کے امور میں یکجہتی دکھا سکے۔ مولانا کی ملی مسائل کے تئیں بہت سی تجاویز تقاضائے وقت ہیں اور ان کو اختیار کرنے میں کسی بھی پس و پیش سے ہمیں کام نہیں لینا چاہیے اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی سے بچتے ہوئے دوسرے بنیادی معاملات و حقائق پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔

مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ملت اجتماعی سطح پر فروعی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرے اور تعلیم و تحقیق کے میدان میں دنیا کی دیگر اقوام کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر عالمی شراکت داری میں اپنا حصہ شامل کرے اور بالخصوص برادران وطن کے ساتھ اسوۂ حسنہ اور تعلیماتِ اسلامی کی روشنی میں بہتر اور خوشگوار تعلقات قائم کرے اور ہر قسم کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو باہمی ڈائیلاگ کے ذریعے دور کرے۔

---

ایک عالم کی موت ایک عالَم کی موت کے مترادف ہے۔ ان کی وفات ایک سانحہ ہے لیکن اللہ تعالی کا حکم ہے لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں، اللہ تعالی ان کا بہتر جانشین بنائے۔ ان کے ان خیالات اور نظریات سے کئی لوگوں کو اختلاف بھی رہا اور لوگوں کو ہوتا بھی ہے۔ ان کی موت کہ ایک بڑا خسارہ اور صدمہ ہے۔ اللہ کرے کہ ان کا خلا بھر جائے۔ (مولانا مفتی مکرم احمد، امام مسجد فتح پوری، نئی دہلی)

# پھل دار درخت کے نیچے، بیتے کچھ لمحات

ڈاکٹر محی الدین غازی، جماعت اسلامی ہند

میرے خوب صورت بچپن کی ایک حسین یاد یہ ہے کہ جامعۃ الفلاح کے چمن میں کالے توت کا ایک گھنا درخت ہوا کرتا تھا۔ میں اس کے نیچے جاتا، وہاں بہت سے توت کھانے کو ملتے۔ کچھ قریبی ٹہنیوں سے اور کچھ زمین پر گرے ہوئے۔

نوجوانی میں قدم رکھا تو پھل دار درختوں جیسی شخصیات سے ملاقات ہونے لگی۔ ان کی مجلس میں بیٹھ کر وہی احساس ہوتا جو بچپن میں کالے توت کے پیڑ کے نیچے توت چنتے ہوئے ہوتا تھا۔

مولانا وحید الدین خان میرے لیے پھلوں سے لدے ہوئے ایک درخت کی مانند تھے۔ میں نے ان کی صحبت میں جتنے لمحات گزارے ان کی شاخِ فکر سے شیریں پھلوں کو چنتے ہوئے ہی گزارے۔ مولانا کی خوبی یہ تھی کہ ان کے یہاں خزاں کا موسم کبھی نہیں آتا اور کبھی یہ مایوسی بھی نہیں ہوتی کہ ابھی تو پھل آئے نہیں یا آئے تو ابھی پکے نہیں۔ جب بھی جائیں شیریں پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں دل خوش کر دیتیں اور طبیعت کو سیر کر دیتیں۔

مولانا کی باتیں سننے میں بڑی عجیب وغریب لگتیں، لیکن عمل کرو تو بڑی شان دار اور عملی لگتیں۔ ایک بار کہنے لگے کہ بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو ماں باپ اپنی تعلیم، ریسرچ اور بہت سے دیگر مفید کام اس وجہ سے ملتوی کر دیتے ہیں کہ بچہ روتا ہے اور انھیں مصروف رکھتا ہے۔ اگر آپ بچے کو گھر میں تنہا چھوڑ جائیں، یا گھر میں رہتے ہوئے اپنے کام کرتے رہیں تو بچہ روتے روتے مر نہیں جائے گا، یا تو تھک کر سو جائے گا یا پھر کھیلنے میں مصروف ہو جائے گا۔ میں نے اپنی ذاتی زندگی میں اس اصول سے بہت فائدہ اٹھایا۔

یہ مولانا کا انوکھا اور منفرد انداز تھا۔ وہ والدین کو مشورہ دیتے کہ بچے کے رونے کو وجہ بنا کر اپنی تعلیم وترقی کے عظیم منصوبے موقوف نہ ہونے دیں۔ وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے کہ فرقہ پرستوں کی پیدا کی ہوئی شر پسندی میں الجھ کر اپنے نصب العین سے غافل نہ ہو جائیں۔ ان کے نزدیک بچہ رونے

سے مرنہیں جاتا ہے اور کوئی قوم دوسروں کی شرارتوں کو نظر انداز کرنے سے ذلیل ورسوا نہیں ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا مشورہ نہ والدین کو بھاتا اور نہ ہی ملت کو اپیل کر پاتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا کے مشوروں پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والی جذباتی ملت نے جب بھی مولانا کے مشوروں پر عمل کیا کوئی نقصان نہیں اٹھایا۔

ایک دن میں نے مولانا کو بتایا کہ میں نے لفظ ارہاب پر ایک تحقیقی مضمون لکھا ہے، جو اردو میں مجلہ تحقیقات اسلامی اور عربی میں کویت کے المجتمع میگزین میں شائع ہوا ہے۔ مولانا نے میری پوری بات غور سے سنی اور پھر کہا کہ تم کو یہ اہم تحقیق انگریزی میں لکھنی چاہیے تھی۔ میں نے کہا مجھے انگریزی میں لکھنا نہیں آتا۔ کہنے لگے یہ تو تمھاری بہت بڑی کم زوری ہے، اسے فوراً دور کرو۔ روزانہ ایک گھنٹے تک غور سے انگریزی اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرو۔ یہ کم زوری اس طرح دور ہو سکتی ہے۔ تم اردو میں لکھو گے تو ایک محدود حلقہ پڑھے گا۔ وہی باتیں انگریزی میں لکھو گے تو بہت بڑے حلقے تک پہنچے گی۔ میں نے مشورہ بہت غور سے سنا لیکن اس پر عمل نہ کر سکا۔ ابھی بھی عمل کرنے کا موقع ہے، لیکن کاہلی ابھی بھی راستہ روکے کھڑی ہے۔

ایک بار کی بات ہے، مولانا آزاد کے بارے میں کہنے لگے کہ میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی تھی، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کانگریس کے ہاتھوں بک گئے تھے۔ کیوں کہ پہلی بات غلط ہوئی تو مجھے گناہ نہیں ملے گا لیکن دوسری بات غلط ہوئی تو میں گناہ گار ہو جاؤں گا۔ پھر انھوں نے کہا کہ لوگ میرے بارے میں بھی یہی بات کیوں نہیں کہتے کہ میں نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی، یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں بک گیا ہوں؟ یہ کہہ کر وہ زار وقطار رونے لگے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایس آئی او آف انڈیا نے ایک ملک گیر مہم منانے کا فیصلہ کیا۔ مہم کا عنوان تھا 'جاگو حساب کا وقت قریب آ گیا'۔ مہم کے پیغام کو ایک فولڈر کی صورت میں لوگوں تک پہنچانا تھا۔ فولڈر کے لیے مواد کی ضرورت تھی جسے تیار کرنے کی ذمے داری میرے سر آئی۔ حسن اتفاق کہ انھی دنوں مولانا کے یہاں جانے کا موقع نکل آیا۔ مجلس سے اٹھتے ہوئے خیال آیا اور میں نے مہم کا تذکرہ کیا اور مولانا سے درخواست کر ڈالی کہ فولڈر کی عبارت لکھ دیں۔ مولانا نے کچھ کہا نہیں، مسکراتے ہوئے رخصت کر دیا۔ دو دن بعد مولانا کا فون آیا، کہنے لگے میرے دوست کے بیٹے نے

مجھے ایک کام دیا اور کام دے کر خود بھول گیا۔ فولڈر کی عبارت تیار ہوگئی ہے۔ آ کر لے جاؤ، اگر آج آنا ہے تو ابھی فوراً آجاؤ، مجھے ایک پروگرام کے لیے نکلنا ہے۔ میں فوراً آٹو میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچا تو مولانا گاڑی میں بیٹھ رہے تھے، میں نے کہا کیا مجھے ساتھ چلنے کی اجازت ملے گی۔ انھوں نے کہا: ہاں، اور میں ان کے ساتھ ہولیا، یہ جانے بغیر کہ کہاں جا رہے ہیں۔

ہماری منزل ستیہ سائیں انٹرنیشنل سینٹر کی عمارت تھی۔ وہاں ملک بھر کے ملٹری اسکولوں کے پرنسپل حضرات کا روحانی تربیت پر ورکشاپ چل رہا تھا۔ مجھے تجسس تھا کہ مولانا اسلام کا تعارف کس طرح پیش کرتے ہیں، مولانا کی وہاں اسلام کے تعارف پر تقریر ہوئی، اور انھوں نے اسی طرح اسلام کو پیش کیا جس طرح غیر مسلموں کی مجلس میں عام طور سے پیش کیا جاتا ہے۔ بس خاص بات یہ تھی کہ تقریر کے دوران مولانا پر رقت طاری تھی اور سب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

مولانا نے دعوتی فولڈر کے لیے جو عبارت مجھے دی، وہ نہایت اثر انگیز تھی۔ ہم نے اسے فولڈر کی شکل دی، ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کرایا اور پورے ملک میں اس کے ذریعہ شاندار دعوتی مہم انجام دی۔

ایک دن میں نے انھیں بتایا کہ میں جماعت اسلامی کا رکن بن گیا ہوں۔ مسکرانے لگے، کہنے لگے مجھے تمھارے رکن بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ایک نصیحت ضرور کروں گا۔ رکنیت کے تمام تقاضے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دینا، لیکن اپنی زندگی کا منصوبہ خود بنانا۔ اس کا انتظار مت کرنا کہ جماعت تمھیں تمھاری زندگی کا منصوبہ بنا کر دے گی۔ جو لوگ اپنی زندگی کے منصوبے کے لیے جماعت پر انحصار کرتے ہیں وہ پوری زندگی بغیر منصوبے کے گزار دیتے ہیں۔ بعد میں میں نے بہت سے لوگوں کو ایسے منصوبے کا منتظر پایا۔

میں نے مولانا سے خوب بحثیں کی ہیں۔ سب سے پہلے ایس آئی او آف انڈیا کے کل ہند تربیتی کیمپ میں، اس کے بعد ان کے گھر پر، اس کے بعد ای میل سے اور آخر میں ان کے فیس بک پیج پر۔ لیکن عالم بن کر نہیں بلکہ ایک نٹ کھٹ بچے کی طرح، جو اپنی شرارتوں سے غصہ بھی دلاتا اور دل بھی لبھاتا۔

میں مولانا کے سامنے بچہ بنا رہتا اور وہ مجھے بڑا دیکھنا چاہتے۔ ایک ملاقات میں انھوں نے والد محترم سے کہا، آپ کا یہ بچہ بڑا آدمی بن سکتا ہے، لیکن یہ اپنے آپ سے ناواقف ہے، اسے چاہیے کہ

اپنے آپ کو دریافت کرے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے زندگی میں ایسے چند بزرگ ملے جنھوں نے اپنے حسنِ نظر سے میرے اندر بڑا آدمی بننے کا امکان دیکھا اور میرے دل میں اس کا شوق پیدا کیا۔ ایاز اپنے سلسلے میں کبھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا، لیکن ان بزرگوں کی خوبصورت توقعات اس کی زندگی کے لیے زادِراہ ضرور بنی رہیں۔

جب میں نے روزگار کے لیے دبئ جانے کا پروگرام بنایا، تو اپنی اہلیہ کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ اتوار کے دن ان کا پروگرام ہوتا تھا۔ ہم کچھ تاخیر سے پہنچے۔ پروگرام کے بعد قریب جا کر ملاقات کی، اہلیہ کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا سنا ہے تم دبئ جارہے ہو، آخر اس قبرستان میں دفن ہونے کہاں جارہے ہو۔ میں نے کہا، ان شاء اللہ، جلد واپس آجاؤں گا، مایوسی سے مجھے دیکھا اور کہنے لگے قبرستان سے کبھی کوئی واپس آیا ہے۔

پھر پوچھا تم تاخیر سے کیوں پہنچے۔ میں نے بہانہ بنایا آٹو ملنے میں دیر ہوگئی تھی۔ کہنے لگے تم دبئ جارہے ہو، وہاں یہ بہانہ کام نہیں آئے گا۔ وہاں تمھاری وقت کی پابندی کو دیکھ کر تمھاری کارکردگی ناپی جائے گی، خواہ عملاً کارکردگی کچھ نہ ہو۔ دبئ گیا تو مولانا کی بات کو حرف بہ حرف درست پایا۔ مولانا نے ہم دونوں کو ایک نصیحت کی کہ ہمیشہ ایک دوسرے کو اپنا آئیڈیل سمجھنا، تمھارے رشتے خوش گوار رہیں گے، میری بیوی اس مشورے پر ابھی تک سختی سے عمل پیرا ہے۔

دو سال میں دبئ سے واپس ہوجانے کا ارادہ تھا، مگر قبرستان کی خاردار سنہری جھاڑیاں بری طرح جکڑے ہوئی تھیں اور کسی طرح نکلنے نہیں دے رہی تھیں، آخر کار آٹھ سال بعد لوٹا۔ مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ سوچا شاید مولانا مجھے بھول گئے ہوں گے۔ نام بتایا کہنے لگے تمھارا نام میرے دل پر پتھر کی طرح نقش ہے۔ میں نے کہا قبرستان سے لوٹ آیا ہوں۔ مولانا نے حسب معمول پوچھا اپنی تازہ دریافت پیش کرو۔ اس مرتبہ میں پہلے سے سوچ کر آیا تھا جھٹ سے بتادی، پھر مولانا نے سورہ فاتحہ کے مضامین پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی دریافتیں بتائیں۔

دیر تک گفتگو رہی، مجلس میں برادرم ابوالاعلی سید اور مولانا صباح الدین ملک صاحب بھی شامل تھے۔ مولانا نے بتایا کہ انھوں نے طے کرلیا ہے کہ اب وہ صرف انگریزی میں لکھیں گے۔ اس میں وہ زیادہ خوشی محسوس کررہے ہیں۔ ان کو قارئین کی نئی دنیا ملی ہے۔ میں ڈر رہا تھا کہیں مولانا یہ نہ پوچھ

لیں کہ تم نے اپنی انگریزی اچھی کرلی؟ چلتے ہوئے مولانا کی صاحب زادی ڈاکٹر فریدہ خانم نے کہا مولانا کئی دنوں سے بیمار تھے۔ آج تم لوگوں سے مل کر تروتازہ ہوگئے۔ میں نے ان کے ساتھ ملاقات کی خبر فیس بک پر ڈالی، بعض احباب نے سوال کیا کہ آپ نے ان کے فکری انحراف کی اصلاح کی کوشش کی؟!!

مجھے ان کی سادگی پر ہنسی آئی۔ انھیں کیا پتہ کہ میں تو شہتوت کے پیڑ کے نیچے شہتوت کھانے گیا تھا۔ مولانا وحید الدین خان اس دنیا کے تزئین کاروں میں سے تھے۔ اللہ تعالی انھیں جنت میں اونچا مقام عطا فرمائے۔

---

مولانا وحید الدین خان مسلم دنیا اور دین اسلام کی مایہ ناز شخصیت اور ایک ممتاز اسلامی اسکالر تھے جنہوں نے برصغیر ہندوپاک کے دل ودماغ کو اپنی تحریروں سے فتح کیا۔ وہ ایک سلف سٹائل شخصیت تھے، ایک مفکر، اسپیکر؛ سب سے بڑھ کر ایک کامل معنی میں داعی الی اللہ تھے۔ جو لوگ ان کے کچھ نظریات اور ان کی مسلم پالیسی سے اختلاف کرتے ہیں وہ لوگ بھی ان کی فہم وعقل، ان کی فکری مضبوطی، اور اسلامی علوم پر ان کی دسترس کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایک ٹیم تیار کی ہے، جو ان کے مشن کے سفر کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اللہ رب العزت ان کے نیک اعمال کو قبول فرمائے، اور انہیں جنت کی زندگی عطا فرمائے! وہ ان کے شاگردوں کو، رضا کاروں کو مولانا کے کام کو جاری رکھنے کا شدید احساس، ہمت، حوصلہ اور تحریک پیدا فرمائے! آمین (شیخ اے سی آغا محمد، ڈائریکٹر جامعہ نظیمیہ، بیروو الا، سری لنکا)

---

آہ باباجی!! سب کے مولانا وحید الدین خان صاحب، جب کہ میرے باباجی اللہ کے مہمان بن گئے.. رب کی مرضی کے آگے بھلا کس کی مجال.. ہیرے نگینے عظیم الشان لوگ دنیا سے اٹھے جا رہے ہیں۔ ابھی خبر غم ملی ہے. باباجی بھی رخصت ہوئے. آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے ہیں.. بہت بہت دکھ محسوس کر رہا ہوں.. باباجی میرے استاد محترم تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ (مظہر صدیقی، ملتان)

# خود احتسابی

حسن نثار، پاکستان

گزشتہ چند سالوں میں بہت سے مہربان قارئین سے یہ شکوہ سن چکا ہوں کہ کبھی کبھی میں خود احتسابی و خود ملامتی میں کچھ زیادہ ہی آگے نکل جاتا ہوں۔ دلچسپ بات یہ کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ برسوں باہر رہتے ہوئے ان کی تربیت کچھ اور انداز میں ہو چکی ہوتی ہے اور وہ خاصے حقیقت پسند واقع ہوتے ہیں جب کہ یہاں ''ہم سا ہو تو سامنے آئے'' والا مائنڈ سیٹ عروج پر ہے۔ اخلاقی انحطاط اپنے عروج پر ہے۔ لیکن ''خود فریبی'' اس سے بھی کہیں زیادہ عروج پر ہے، اور ہم ''ملی نغموں'' کے نرغے میں ہیں۔

میں نے کچھ فورمز پر اپنی اس نااہلی اور کمزوری کی وضاحت کرتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ''اپنا'' وہ ہے جو آپ کو آپ کی خامیوں، کجیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کرے۔ اچھا باپ ہو یا عمدہ اور ذمہ دار استاد، اپنی اولاد یا شاگردوں کی شان میں قصیدے نہیں کہتا بلکہ انہیں ان کی کمزوریوں کی طرف متوجہ کر کے ان پر قابو پانے کے مشورے دیتا ہے تا کہ وہ عملی زندگی کے امتحان میں بہتر طریقے سے پرفارم کر سکیں۔

بہر حال پچھلے دنوں مولانا وحید الدین خان صاحب مرحوم و مغفور کی ایک تحریر نظر سے گزری جس کا موضوع بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جو دوست مولانا کے بارے میں نہیں جانتے، ان کی معلومات کے لیے پہلے تو یہ عرض ہے کہ میں ان کا زبردست مداح تھا، ہوں اور رہوں گا۔ کیونکہ مولانا اسلام کے ان مفکرین میں سے تھے جو تھرڈ ڈائمینشن دیکھنے کی بصیرت رکھتے اور آرٹ آف تھنکنگ بلکہ ''اوریجنل تھنکنگ'' کی علامت تھے اور گھسی پٹی بات سے گریز کرتے تھے۔ کوئی ایسے شخص سے اتفاق کرے یا اختلاف، ان کا اصل حسن اور کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ قاری کو خود سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور یہی کسی خیال و تحریر کا اصل کمال ہوتا ہے کہ وہ آپ کی سوچ کو ٹریگر کر دے۔ مولانا وحید الدین خان 1925 کو یوپی (انڈیا) کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور چند ہفتے قبل ہی اس دنیا

سے رخصت ہوئے۔ ان کی تحریروں میں بین المذاہب مکالمہ اور امن کا ذکر زیادہ ہے۔ خود احتسابی کے حوالہ سے ان کی یہ تحریر پیش خدمت ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی وہ کتابت کا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا میں ''الرسالہ'' پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مجھ کو ''الرسالہ'' بہت پسند ہے مگر آپ کی ایک بات مجھے کھٹکتی ہے، آپ اکثر مسلمانوں کی کمیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے تو مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ آپ ایک کاتب ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ حرف ''ج'' اور ''ع'' کا دائرہ صحیح نہ بناتے ہوں۔ اب اگر آپ کے استاد آپ کی اس کمی کو بتائیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ استاد صاحب میرے اندر احساس کمتری پیدا کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ''نہیں''۔ میں نے کہا اسی ذاتی مثال سے آپ ''الرسالہ'' کے ان مضامین کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے مضامین کا مقصد مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کرنا نہیں بلکہ احساس اصلاح پیدا کرنا ہے اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ اپنی کمیوں کی اصلاح کیے بغیر کوئی شخص یا گروہ اس دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا۔ عربی زبان کا ایک مثل ہے کہ جو شخص تم کو نصیحت کرے وہ اس سے بہتر ہے جو تمہاری تعریف کرے۔ یہ مثل سو فیصد درست ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی کے ساتھ خیر خواہی رکھتا ہو، وہ یہی کرے گا کہ وہ اس کی کمیوں کی نشاندہی کرے اور اس کی کوتاہیوں پر اس کی فہمائش کرے۔ یہی سچے مصلح کا طریقہ ہے۔

قرآن میں گھاٹے (خسر) سے بچنے کے لیے جو لازمی صفات بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک ضروری صفت ''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' ہے یعنی آپس میں ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کرتے رہنا۔ وہی گروہ اس دنیا میں نقصان اور بربادی سے بچ سکتا ہے جس کے افراد میں یہ روح زندہ ہو کہ جب وہ اپنے بھائی کو حق کے راستے سے ہٹتا ہوا پائے تو فوراً اس کو ٹوکے۔ اور وہ جب بھی اس کو بے صبری کی طرف جاتا ہوا دیکھے تو اس کو صبر کی اہمیت سے آگاہ کرے (سورہ العصر)۔

صحابہ کرام کے اندر نصیحت کرنے کا جذبہ بھی پوری طرح موجود تھا اور نصیحت سننے کا بھی۔ حضرت عمر فاروق نے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کیا۔ حضرت علی کو اس میں غلطی نظر آئی۔ انہوں نے اس پر

ٹوکا۔ حضرت عمرؓ اگرچہ خلیفہ اور حاکم تھے، آپ نے فوراً اسے مان لیا اور کہا.... ’’اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا‘‘۔

قارئین! امید ہے مولانا وحید الدین خان مرحوم جیسی شخصیت کی اس مختصر سی تحریر کے بعد ہم کوتاہیوں کی نشاندہی کو ذرا اور انداز میں دیکھنا شروع کر دیں گے۔

https://jang.com.pk/news/964807

---

# خس و خاشاک سے اس نے کیے برق و شرر پیدا

(مولانا وحید الدین خاں 1925-2021ء)

حیدر میواتی ندوی

’’خدا نے اپنی قدرت سے کیے شمس و قمر پیدا
جہاں آباد میں کتنے ہوئے لعل و گہر پیدا
وحید الدین خاں صاحب یقیناً مرد حق بیں تھا
ہزاروں میں کوئی ہوتا ہے ایسا راہبر پیدا
بہت سلجھی ہوئی وہ گفتگو فرمایا کرتے تھے
دلوں میں اس کو سن کے ہو ہی جاتا تھا اثر پیدا
جہاں سے اہل دل اہل یقیں اٹھتے ہی جاتے ہیں
کہ کم ہوتے ہیں سچے عاشق خیر البشر پیدا
امین و پاسباں علم نبوت کا انہیں پایا
ہوئے اس کی نظر سے بے شمار اہل نظر پیدا
یقیں محکم عمل پیہم تھا وصف خاص اک اس کا
خس و خاشاک سے اس نے کیے برق و شرر پیدا
ہمارے گھر میں وہ اک بار مہماں بن کے آئے تھے
کیے جس نے زمانہ میں الگ شام و سحر پیدا
بنا مالی کے اب گلشن بھی ویرانہ سا لگتا ہے
کیے تھے اس نے دل کی آہ سے گلہائے تر پیدا
تھکا ہارا مسافر سایۂ رحمت میں جا ٹھہرا
خدا سے آہ و زاری کر کیا عزم سفر پیدا
’’ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا‘‘
بتاؤ سانحہ حیدر یہ کس کا پیش آیا ہے
وحید عصر کے غم میں ہوئی ہے چشم تر پیدا

yusufhaider4313@gmail.com

# بڑے ابا

## مسز فہمیدہ خان، فیض آباد

انسان دنیا میں بہت کچھ حاصل کرتا ہے، دولت، پیسہ، پراپرٹی اور ہر قسم کی مٹیریل چیزیں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی دولت مولانا وحید الدین خاں صاحب، یعنی بڑے ابا ہیں۔ انھوں نے میری زندگی کو اندھیرے سے اجالے کی طرف لوٹایا ہے۔ میری زندگی انسانوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی، مگر وہاں مجھے کچھ نہ ملا۔ میری روح ایک سوکھے پیڑ کی طرح ہو چکی تھی۔ پھر مولانا کی رائٹنگس اور لکچرس نے میری روح کو سینچا اور اس میں ہریالی آئی۔ میری زندگی کا رخ انسانوں سے ہٹ کر خدا سے جڑ گیا۔ مولانا کے چھوٹے چھوٹے جملوں نے میرے دماغ کی پرتیں ہٹائی ہیں، جس کو میں پہلے نہیں سمجھ پائی تھی، مولانا نے میری ڈی کنڈیشننگ کی ہے۔

جب میں مولانا سے ملی تو میں بہت غمگین رہتی تھی۔ میرے والد کا جلد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ میں اکثر روتی رہتی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر مولانا نے کہا کہ آنسو بہت قیمتی چیز ہے، وہ صرف خدا کے لیے ہے۔ اس دن میری سمجھ میں آیا کہ ہمارا قیمتی آنسو کسی برتر ہستی کے لیے ہی ہو سکتا ہے۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے نہیں۔

ایک بار مولانا نے اپنی کلاس میں مجھ سے کہا تھا کہ آپ اسی طرح دنیا سے چلی جائیں گی، خدا کے لیے کچھ نہیں کریں گی۔ اس بات نے مجھے ہلا دیا کہ میں نے زندگی میں لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا مگر ریٹرن میں مجھے ذہنی سکون تک نہ ملا۔ اور جو میرا خدا جو مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے، جس نے میری ہر مشکل کو آسان کیا اور مصیبت سے بچایا، اپنے اس مالک کے لیے ہی میں نے کچھ نہیں کیا۔ پھر مولانا کے ذریعے مجھے خدا کے مشن میں کام کرنے کا موقع ملا۔ میری زندگی کا آدھا حصہ بے مقصد گزر گیا، مگر اللہ تعالی نے مجھے بچالیا جس کا ذریعہ مولانا صاحب بنے۔

میری زندگی نماز، روزہ، حج کرنے کے بعد بھی خدا کے بغیر تھی۔ مگر مولانا صاحب کی کتابیں پڑھنے کے بعد زندگی میں خدا کا رنگ آنے لگا۔ میرے سوچنے سمجھنے کا طریقہ خدا سے شروع ہو کر خدا پر

ختم ہونے لگا۔ میں ہمیشہ یہی سمجھتی تھی کہ میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ مگر مولانا صاحب کے مشن سے یہ موقع ملا کہ میں بھی خدا کے لیے کچھ کرسکتی ہوں۔ اب مجھے زندگی جینے کا مقصد مل گیا ہے۔ جب تک میری زندگی ہے، ان شاءاللہ سی پی ایس مشن میری پرائریٹی (priority) رہے گا۔

مولانا صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں، مگر ان کی رائٹنگس، ان کے لکچرس مجھے یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ میرے پاس ہیں، مجھے گائڈ کررہے ہیں۔ مولانا صاحب نے خدا کے بندوں کو جنت کا راستہ دکھایا ہے جو ایک سچے خدا کے بندے کو کرنا چاہیے۔

مولانا 28-26 جون 2014 میں سی پی ایس ٹیم کے ساتھ میرے گھر آئے تھے۔ اس وقت کو میں اپنی زندگی کا سب سے قیمتی وقت سمجھتی ہوں۔ اس دوران میں نے جنت کا تجربہ کیا کہ جنت میں کیسا ماحول ہوگا۔ ہر وقت خدا کی گلوری کا احساس ہونے لگا۔ مولانا کے ساتھ ایسا قیمتی وقت میری زندگی میں پھر نہیں آئے گا۔ مگر میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ آخرت میں مجھے اس کا تجربہ کرادے۔

اپنی زندگی میں میں نے کتنے ہی اپنوں کی موت کو دیکھا مگر مولانا کے انتقال کی خبر میرے لیے ایسی تھی جو میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ اس لمحہ میں نے محسوس کیا تھا کہ میری ہارٹ بیٹ تھوڑی دیر کے لیے رک گئی ہے اور میں نے بہت دیر کے بعد یہ ریلائز کیا کہ مولانا واقعی اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ شاید غم اور تکلیف کا اتنا بڑا تجربہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔

مولانا صاحب کی اہمیت کو دنیا والے سمجھیں یا نہ سمجھیں، مگر مجھے پوری امید ہے کہ خدا نے اپنے فرشتوں کے ساتھ مولانا صاحب کا وارم ویلکم کیا ہوگا۔

---

مولانا وحید الدین خاں صاحب نے دورِ جدید میں، جب کہ الحاد کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اپنے قلم سے سائنسی دلائل کی روشنی میں اللہ کی معرفت اور اس کے تخلیقی منصوبے سے پوری انسانیت کو آگاہ کیا۔ شرک، شخصیت پرستی، فرقہ واریت جیسی بیماریوں کا پوری طاقت سے رد کیا۔ اس مردِ مجاہد نے مخلوق میں جینے کے بجائے خالق میں جینے کا سلیقہ سکھایا۔ ہم نے ان کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھ کر مذہب کے تعلق سے اپنے اندر یقین پیدا کیا ہے۔
(مسعود انصاری، ٹیٹا گڑھ، ویسٹ بنگال)

# خدا اور آخرت کا داعی

مولانا سید اقبال احمد عمری، تامل ناڈو

مولانا سے میری پہلی ملاقات دہلی میں سن 2007 میں نظام الدین C-29 پر ہوئی، ان دنوں میں اس تلاش میں تھا کہ عربی زبان میں قرآن اور سائنس کے موضوع پر کوئی کتاب مل جائے۔ میں نے مولانا کے شیلف پر نظر ڈالی تو وہاں کئی عربی کتابیں نظر آئیں، میں نے اپنی تلاش کے مطابق دو عربی کتابیں عاریتاً مولانا سے حاصل کرلیں۔

اس ملاقات میں مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں کہ جنت صرف حور وقصور کی جگہ ہے؟ یہ نعمتیں تو خدا کے یہاں قرآن کے الفاظ میں بطور نزل یعنی مہمان نوازی (hospitality) کے طور پر دی جائیں گی مگر جنت حقیقت میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر نہ صرف یہ کہ مادی نعمتوں کی تکمیل کا سامان ہوگا بلکہ وہاں روحانی تقاضوں کی تکمیل کا بھی مکمل انتظام ہوگا۔ پھر مولانا نے اپنی بات کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ —

''جیسے کسی شخص نے اپنی ساری زندگی آلاء اللہ کی دریافت اور اس کی تحقیق وجستجو میں گزار دی ہو تو اس کو آلاء اللہ کی دریافت کے لیے جنت میں ایک لامتناہی میدان دے دیا جائے گا اس کو ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ دنیا میں ایک شخص تھا جو نباتات کا عالم (Botanical Professor) تھا اور وہ اس حال میں وفات پا گیا کہ مزید پھولوں کی کیمسٹری، اس کی تخلیق کا راز اور اس کی خوشبو کی حقیقت کو جاننے کی خواہش رکھتا تھا تو آخرت میں اس کو بھرپور طور پر اس کا موقع دیا جائے گا اور مزید اس کے لیے ہر قسم کے اعلیٰ انتظامات فراہم کیے جائیں گے۔ یہ صرف ایک مثال ہے جس کے ذریعہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جنت کیسا اعلیٰ ترین مقام ہوگا کہ وہاں ہر انسان کی خواہش کو اس کے اعلیٰ عقلی سطح پر فُل فِل کیا جائے گا''۔

جیسے ہی میں نے مولانا کی یہ بات سنی تو میں نے برو قت قرآن کی دو آیتیں بطورِ استدلال تلاوت کیں۔ جن کا ترجمہ یوں ہے:

وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی۔(41:31)
وہاں موجود رہے گی ہر وہ چیز جو من کو بھاتی ہو اور نگاہوں کو لذت دینے والی ہو۔(43:71)

یہ سن کر مولانا نے کہا کہ آپ نے بالکل صحیح ریفرنس دیا ہے اور پھر اسی وقت مولانا نے میرے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ آپ کے لیے ایک بوڑھے آدمی کی یہ نصیحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انٹلکچولس میں دعوتی کام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، آپ اپنے وقت کو ضائع کیے بغیر خوب انگریزی لٹریچر کا مطالعہ کریں تا کہ ملا قوم میں دعوتی کام کرنے کے قابل بن سکیں۔ مجھے یہ بات سن کر بہت ہمت ملی کہ مجھ میں بھی انٹلکچولس میں دعوتی کام کرنے کا کچھ پوٹینشل موجود ہے۔ اب تک کسی نے بھی میرے بارے میں ایسی بات نہیں کہی تھی۔ اسی وقت سے میرے ذہن میں ایک پروسس جاری ہو گیا کہ میں بھی مدعو کی نسبت سے دعوت کے لوَر ورزن اور ہائیر ورزن کو جاننے کی کوشش کروں۔ اسی تجسس نے مجھے مولانا تک پہنچایا۔

مولانا سے میری دوسری ملاقات 2009ء میں نظام الدین ویسٹ (نئی دہلی) میں ان کے آفس میں ہوئی۔ میں اس وقت دہلی میں منعقد ایک دعوتی کیمپ میں بحیثیت محاضر شریک تھا۔ اس زمانے میں اس قسم کے دعوتی کیمپ ہندوستان بھر میں منعقد ہوتے رہتے تھے جن میں میرے درس کا موضوع العقیدۃ فی اللہ ہوا کرتا تھا یعنی اللہ کے بارے میں ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے، اور پھر یہ کہ دعوت الی اللہ کا منہج کیا ہونا چاہیے۔ مگر میں خود ایک عرصے سے اس بات کو لے کر پریشان رہتا تھا کہ اللہ کی صحیح معرفت کیا ہے، ازدیادِ ایمان اور خدا سے زندہ تعلق پیدا کرنے کا راستہ کیا ہے۔ میں اپنے اندر خدا کے زندہ شعور کی بہت زیادہ کمی محسوس کرتا تھا۔ میری فطرت کی گہرائیوں سے کچھ بنیادی سوالات اٹھتے تھے، جن کا جواب پانے کے لیے مجھے کسی کی تلاش تھی۔ چونکہ مادرِ علمی جامعہ دار السلام عمر آباد نے اپنے ابناء کی یہ تربیت کی تھی کہ ہر مکتبِ فکر کے علماء سے استفادہ کے لیے آدمی کو اپنا ذہن کھلا رکھنا چاہیے۔ لہٰذا اس سفر میں میرے اندر مولانا وحید الدین خاں صاحب سے بھی ملاقات کا عزم پیدا ہوا اور ارادہ ہوا کہ میں آپ کے سامنے اپنے ان فطری سوالات کو پیش کروں، شاید کوئی جواب مل جائے۔

ملاقات کے بعد میں نے آپ کے سامنے اپنی جستجو رکھی اور میں نے کہا کہ اس باب میں آپ میری رہنمائی فرمائیں اور ساتھ میں یہ بھی بتائیں کہ میں اس موضوع پر کس طرح تیاری کروں۔

عین اسی وقت جب میں مولانا کے سامنے اپنے سوالات رکھ رہا تھا مولانا کے ہاتھ میں سورج گرہن اور چاند گرہن کا ایک نقشہ موجود تھا، مولانا نے اس نقشے کو سامنے رکھ کر مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ یہ مختلف حجم کے اجسام ہیں۔ جب یہ تین ڈفرنٹ سائز کے ماسس ایک ہی سیدھ میں آجاتے ہیں تو سورج گرہن اور چاند گرہن جیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے مولانا زار وقطار رو رہے تھے اور بآواز بلند یہ کہہ رہے تھے کہ وہ خدا کتنی عظیم قدرت کا مالک ہوگا جو سورج، چاند اور زمین کو ایک ہی سیدھ میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ اس قسم کا واقعہ کوئی سادہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ لامحدود اسپیس میں مختلف سائز کے اجسام کا ایک سیدھ میں آجانا انتہائی حد تک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس قسم کے واقعے کا ظہور دراصل کائنات میں ایک برتر ہستی کی مداخلت کو بتا رہا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ نے اس واقعے کو ''آیۃ من آیات اللہ'' کہا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 914)۔ یعنی یہ واقعہ خدا کی عظمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

یہ میرا پہلا تجربہ تھا جب میں نے مولانا کو عظمت خداوندی کے احساس سے بہت زیادہ تھرل میں دیکھا اور میرے لیے یہ منظر بڑا ہی تعجب خیز تھا۔ کیونکہ میں ایک طویل عرصہ سے اللہ کے بارے میں درس دے رہا تھا مگر نہ تو کبھی میرے رونگٹے کھڑے ہوئے اور نہ ہی میری آنکھوں سے کبھی اشک جاری ہوئے۔

مولانا کی مجلسوں میں مسلسل شرکت کرنے کے بعد ہی مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہ عظیم کائنات اور اس میں رونما ہونے والے واقعات درحقیقت خدا کی عظمت کا عملی اظہار ہیں، مگر ہمارا کیس یہ ہے کہ ہمیں اس کا شعوری ادراک نہیں ہے۔ اس لیے ان غیر معمولی واقعات میں ہمیں خدا کی عظمت کے غیر معمولی پہلو نظر نہیں آتے۔

اگر تخلیقات میں خالق کی عظمت کا ادراک کریں تو کیفیات نصیب ہوتی ہیں، ایمان بڑھتا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے اب تک صرف مسائل عقیدہ کو اپنا موضوع بنا رکھا تھا۔

تقریباً دس سال سے مجھے مولانا کی ڈائریکٹ تربیت اور الیکٹرانک صحبت کا موقع ملا۔

میں نے جتنا زیادہ مولانا کو اللہ کا شعوری ذکر کرنے والا پایا ہے کسی اور کو نہیں پایا۔

آج بظاہر مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے مگر مولانا نے ہم کو جس زندہ ہستی سے جوڑا ہے

اور مسلسل طور پر جس سے جڑے رہنے کے لیے تخلیقی معرفت کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے، اس کے ذریعے کلمات اللہ کی دریافت کا لامحدود طریقہ مل گیا ہے۔

مولانا کے ساتھ ابتدا میں میرے جو دو ذاتی تجربے ہوئے ہیں اس سے یہی پتہ چلا کہ مولانا خدا اور آخرت کی طرف بلانے والے داعی ہیں۔ وہ کسی اور چیز کے داعی نہیں۔

اس دور کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت جو ہم کو حاصل ہوئی ہے، وہ یہ بھی ہے کہ ہمارے پاس ایک عارف باللہ کی دریافتیں اس کی تصویر اس کی آواز آڈیو اور ویڈیو کی شکل میں محفوظ ہیں۔ کتابوں کی شکل میں بھی ایک ایسا ذخیرہ محفوظ ہے جو ہماری تربیت کا اہم ذریعہ ہے۔

مولانا نے مشن کو اور اپنی ٹیم کو اس زندہ ہستی کے حوالے کر دیا جو ''الحی القیوم'' ہے۔

اب مولانا کے بعد ہم معرفت کے سفر کو اس احساس کے ساتھ آگے بڑھائیں کہ ایک دن ہم کو بھی مرنا ہے، خدا کے سامنے پیشی ہونے والی ہے اور دوسری طرف اللہ نے مولانا کے ذریعے جو مشن شروع کیا ہے اسے بغیر اختلاف کے ربانی بنیادوں پر آگے بڑھائیں۔

---

اللہ مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مولانا کی تعلیمات کا فروغ کریں۔ میری خواہش تھی کہ کم از کم ایک بار ان سے ملاقات ہوتی، جو اللہ کو منظور نہ تھی۔ (سلمان الیاس، اسلام آباد)

---

''رازِ حیات'' کے متلاشی کی تلاش اختتام شد۔ وہ زندگی کا سب سے بڑا راز پا گئے۔ خالقِ حقیقی کی تلاش بس اب اک نیند کے پرے ہے۔ خالق کا اس کانٹوں بھری بستی سے پھول چننے کا عمل جاری۔ مولانا وحید الدین خان بھی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت سے گزر گئے۔ کتاب "Life, Death and Beyond" کے مصنف زندگی دیکھ رہے تھے، موت دیکھ لی، اب یقیناً وہ دیکھ رہے ہوں گے جس کا پرچار کرتے عمر بتا دی۔ (جواد احمد، کراچی)

# جب میں نے مولانا سے پہلی بار ملاقات کی

اظہر مبارک، برہروا، جھارکھنڈ

میں سن 2004 سے ماہنامہ الرسالہ کا قاری ہوں۔ 2007 سے ماہنامہ کے علاوہ مولانا کی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔اس کے بعد میں نے مولانا کی آن لائن کلاسیز اٹینڈ کرنا شروع کیا۔ پھر میرے اندر شدید خواہش ہوئی کہ مولانا سے براہ راست ملوں۔ آخر وہ دن بھی آیا، جب کہ میں نے مولانا سے ملاقات کی۔

میری زندگی کا وہ دن بڑا ہی عجیب ہے جب مولانا کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں مولانا سے ملاقات کے لیے دہلی پہونچا اور نظام الدین میں پانچ دنوں کا قیام کیا۔ 15 جون 2012 سے 19 جون 2012 تک۔ 17 جون 2012 کو مولانا کا سنڈے لکچر تھا۔ لکچر سے پہلے میں مولانا سے پہلی براہ راست تعارفی ملاقات ہوئی۔ کیوں کہ اس سے پہلے میں نے مولانا سے ٹیلیفون پر کئی بار بات کی تھی۔ میں نے مولانا سے مختصر بات کی، جس میں مولانا نے میری ملاقات پٹنہ کے ابوالحکم دانیال صاحب سے کرائی۔ آج مولانا کا ٹاپک تھا:

Political activism or futile activism

پہلی بار اس طرح ڈائریکٹ طور پر مولانا کا لکچر سننا، زندگی کے ایک یادگار لمحے کی طرح مجھے یاد رہے گا۔ 18 جون کو نظام الدین میں میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ میں نے نظام الدین کی مسجد کلاں میں رات کو قیام کیا تھا۔ سوئے اتفاق کہ وہاں میرا موبائل چوری ہو گیا۔ سفر کے دوران یہ تجربہ میرے لیے سادہ معاملہ نہ تھا۔ میں مولانا کے پاس ان کے ساتھی مولانا ذکوان ندوی صاحب کے توسط سے پہونچا تھا۔ کسی وجہ سے مولانا نے 19 جون 2012 کو مجھے تلاش کی تو مولانا ذکوان ندوی کے ذریعے مولانا کو پتہ چلا کہ میرا موبائل چوری ہو گیا ہے۔ اس پر مولانا نے گڈ ورڈ شاپ پر میرے بارے میں یہ خبر بھجوائی کہ اگر وہ وہاں پر پہنچیں تو انہیں کہہ دیجیے گا کہ وہ آ کر مجھ سے ملاقات کریں۔ حسب حال میں جب میں 11 بجے دن کو گڈ ورڈ شاپ گیا تو خبر ملی کہ مولانا نے مجھے اپنی آفس میں

بلایا ہے۔ جب میں وہاں گیا تو دیکھا مولانا کا لکچر/نشست عمری حضرات کے ساتھ جاری ہے، جس میں مولانا اقبال، فرہاد اور دیگر علماء صاحبان موجود تھے۔ میں خاموشی کے ساتھ جا کر وہاں بیٹھ گیا۔ لکچر ختم ہونے کے بعد مولانا نے مجھے یاد کیا، اور خود سے چل کر میرے پاس آئے، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں اور چوری شدہ موبائل کے بارے میں پوچھا۔ اس وقت یہ نصیحت کی کہ مسجدیں غیر مامون ہوگئی ہیں، آئندہ غفلت نہ کریں۔ اس وقت مولانا نے حدیث میں مذکور ایک پیشین گوئی یاد دلائی، جو ان الفاظ میں ہے: مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 1763)۔ یعنی مسجدیں آباد ہوں گی، لیکن وہ ہدایت کے اعتبار سے خالی ہوں گی۔ اور پھر مولانا نے وہ کیا جو میرے لیے بہت ہی حیران کن تھا۔ یعنی چوری شدہ موبائل کی قیمت پوچھ کر اتنا پیسہ دیا۔

یہ واقعہ جب میں یاد کرتا ہوں تو مجھے عجیب خوشی طاری ہوتی ہے۔ یہ میرے لیے ایک خدائی مدد کا تجربہ تھا۔ اس میں سو فیصد غلطی میری اپنی تھی۔ میں نے موبائل کو حفاظت سے نہیں رکھا تھا۔ مولانا ایک شفیق انسان تھے۔ نہ معلوم، ان کے اس طرح کے شفقت کا معاملہ اور کتنے ہی لوگوں کے ساتھ رہا ہوگا۔ روانگی سے قبل میں نے مولانا کو اپنی ڈائری بڑھائی کہ وہ کچھ نصیحتیں لکھ دیں تو انہوں نے لکھا کہ —

زندگی ہوشیاری کا امتحان ہے ۔۔ زندگی غفلت کا کارخانہ نہیں۔

بعد میں، 2017 کو میں نے، مولانا کو ایک خط لکھا اور اس خط میں میں لکھا کہ مجھے مولانا کی تحریروں سے کیا فائدہ ہوا ہے۔ میرا یہ خط ماہنامہ الرسالہ کے شمارہ فروری 2017 میں چھپ چکا ہے۔ مولانا کی تحریروں ہی کا نتیجہ تھا کہ دعوت الی اللہ میری زندگی میں شامل ہوگیا۔ میں اپنی حد تک دعوتی کام میں لگ گیا۔ اس کی کئی رودادیں بھی ماہنامہ الرسالہ میں چھپ چکی ہیں، مثلاً مئی 2018۔

مولانا کی صحبت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آج میں یقین میں جیتا ہوں۔ جب کہ اس سے پہلے یہ حال تھا کہ میرے کوریز (queries) ختم نہیں ہوتے تھے اور بظاہر میں یہ سمجھتا تھا کہ میری زندگی اسی طرح ختم ہوجائے گی۔ کیونکہ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ میں جو پانا چاہتا تھا شاید اس کو میں خود پا نہیں سکتا تھا۔ آخر اللہ تعالی نے مولانا کے روپ میں مجھے وہ چیز دی۔

میں نے پایا ہے کہ مولانا کے سارے افکار براہ راست یا بالواسطہ طور پر قرآن سے ہیں۔ مولانا

کے افکار کا سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میں قرآن سے بالکل جڑ گیا۔ مجھ پر قرآن کے معانی کھلتے گئے اور مجھے روحانی تسکین (spiritual solace) ملتا گیا۔

اس سلسلے میں میرا ایک احساس یہ ہے کہ یہ صرف اور صرف مولانا ہی ہیں، جن کے الفاظ آج کے ماڈرن انسان کے لیے قابل قبول ہیں، ورنہ آج، پوسٹ سائنٹفک ایج میں سارے کے سارے مسلم علماء کی تحریریں غیر متعلق ہو گئی ہیں۔ خود میں بھی مولانا سے پہلے اسلام کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتا تھا۔ میں نے مختلف علما کی کتابیں پڑھیں ہیں، مگر وہ میری پیاس بجھانے کے لیے ناکافی تھے۔

سائنٹفک ایج نے پورے معاملات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب ٹریڈیشنل خطاب کا کوئی معنیٰ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ اسلام کو از سرنو ماڈرن سائنٹفک اسلوب سے لکھا جائے اور یہ کام صرف اور صرف مولانا نے انجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کا کام اتنا بڑا ہے کہ الفاظ کم پڑ جائیں گے اعتراف کے لیے! اللہ ہمیں اس مشن میں اپنا حصہ بھرپور طور پر ادا کرنے کی توفیق ادا فرمائے۔ آمین

---

## A Leading Scholar and Thinker

مولانا وحید الدین خاں صاحب (2021-2025) کے ساتھ ہی بیسویں صدی کے اکابر علما کی آخری کڑی بھی شاید اختتام کو پہنچی۔ ان کی تحریروں کی سب سے بنیادی خوبی سائنٹفک طرز فکر پر مبنی ان کے مدلل مباحث تھے۔ انھوں نے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا۔ ہم نے بچپن سے جن کو پڑھا اور متاثر ہوئے، ان میں مرحوم بھی تھے۔ ہمارے گھر متعدد رسالے اور اخبارات آتے تھے، لیکن سب سے متاثر کن ''الرسالہ'' میں مرحوم کی مختصر کالم نما فکر انگیز تحریریں تھیں۔ دہلی آنے کے بعد لال قلعہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے ملنے کی بھی خواہش تھی۔ اجتہاد ہمیشہ اختلاف کو بھی مدعو کرتا ہے، سو ان کے ساتھ بھی رہا۔ البتہ ان کی علمی شان و شکوہ سے کسی کو انکار نہیں۔ بالخصوص ان کی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' کا دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے۔ دین و مذہب اور عہد جدید کے چیلنجز اور جدید سائنس ان کے محبوب موضوعات تھے اور ان کی تفہیم وتعبیر کا منہج انھیں پر مبنی تھا۔ (پروفیسر اخلاق آہن، جے این یو، دہلی)

# ناقابلِ تلافی نقصان!

جعفر صادق باقوی، چنئی
مدیر، ماہنامہ سمانیلی سمودایم، تامل ناڈو، انڈیا

مشہور اسلامی عالم اور مفکر مولانا وحید الدین خاں صاحب 96 سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آزادی سے پہلے کے انڈیا میں پیدا ہوئے، آزاد انڈیا میں پلے بڑھے، مولانا انڈیا کے قدیم مسلم علما کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ مختلف اسلامی تنظیموں کے رہنماؤں کے معاصر رہے۔ اور علمی شخصیات کے ساتھ ان کے تعلقات بھی رہے اور ان سے خوب اختلاف بھی کیا۔ گہرا علم، عمیق سوچ، کم گفتگو، سادہ زندگی مولانا کی پہچان تھی۔ مولانا، اس صدی کے عظیم اسکالر تھے اور جنہوں نے اپنے نام ''وحید'' کے مطابق تن تنہا ایک منفرد مشن کو قائم کیا۔ تن تنہا کھڑے ہو کر اپنے تحریروں اور تقریروں سے دین کی خدمت کی۔ اسلام کے اجتہادی و فکری میدان پر دیرپا اثر چھوڑا اور آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ مولانا کے انتقال سے تین دن قبل ہی اپنی مسجد کی لائبریری میں اچانک میری نظر کتاب ''تاریخ کا سبق'' کے ملیالم ترجمے پر پڑی۔ میں نے وہ کتاب اپنے ہاتھ میں لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس وقت میرے ذہن میں ماضی کے واقعات گھومنے لگے۔ باقیات الصالحات، ویلور کے میرے اساتذہ کرام مفتی شبیر علی حضرت، مفتی صدقۃ اللہ حضرت کو ماہنامہ الرسالہ میں ہی دکان سے خرید کر پہنچایا کرتا تھا۔ ہمارے اساتذہ سفر یا حضر میں اپنے خطاب کے لیے اس سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ میں چوں کہ اردو زبان سے زیادہ واقف نہیں تھا، اس لیے میرے اساتذہ الرسالہ کے مضامین پڑھ کر ان کا خلاصہ بتایا کرتے تھے۔ ابھی میں انہیں ماضی کی یادوں کے جھروکوں ہی میں تھا کہ اچانک مولانا کے وفات کی خبر مجھ پر اچانک بجلی کی طرح آپڑی — میں نے مولانا کا انٹرویو اپنے ماہنامہ سمانیلی سمودایم (Samanilai Samudhayam) میں شائع کیا اور اسی طرح مولانا کے جو مضامین ٹائمز آف انڈیا کے اسپیکنگ ٹری میں شائع ہوتے تھے ان کا یوسف راجہ اور کلو ندیم احمد سے ترجمہ کروا کے اپنے میگزین میں شائع کرتا تھا۔ اس پر قارئین کی جانب بہت اچھے تاثرات موصول ہوتے تھے۔ بے شک مولانا کی وفات ایک عظیم خسارہ ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمت کو شرف قبولیت بخشے، اور ان کو اعلیٰ علّیین میں جگہ عطاء فرمائے، آمین۔

# میرے محسن، میرے معلم

عمران احمد اصلاحی

مولانا سے میری پہلی ملاقات فروری 1999 میں ہوئی۔ اس کے بعد میں مستقل طور پر مولانا اور ان کے مشن کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اللہ نے مجھے الرسالہ اور مولانا کی کتابوں کی کمپوزنگ کے ذریعہ الرسالہ مشن کی خدمت کا موقع دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج جب مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں، مزید ذمہ داریوں کے ساتھ میں سی پی ایس مشن سے وابستہ ہوں۔ اس طرح یہ وابستگی 22 سال سے مستقل جاری ہے۔ ابتدائی کچھ سالوں میں مولانا مجھے املا کراتے اور پھر میں اس کو ٹائپ کرنے کے بعد مولانا کو سناتا، مولانا کچھ حذف اضافہ اور تصحیح کے بعد کہتے کہ کمپیوٹر پر اس کو ٹھیک کر کے لائیے۔ یہ سلسلہ تقریباً دو ڈھائی سال چلا۔ اس کے بعد ڈی ٹی پی کی ذمہ داریاں بڑھنے کے بعد املا کے لیے ایک اور صاحب مستقل طور پر مولانا کے رفیق کار بنے۔ لیکن میں بھی وقتاً فوقتاً مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

اس طرح مولانا سے سیکھنے اور مشن کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا۔ مولانا میرے مشفق، مربی اور معلم تھے۔ میں نے جتنا مدرسہ سے سیکھا۔ اس سے کہیں زیادہ مولانا کی صحبت اور الرسالہ مشن سے وابستہ ہونے کے بعد سیکھا۔ میرے الرسالہ سے وابستگی کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے، مولانا املا کرا رہے تھے۔ اسی دوران مولانا نے کہا کہ آپ کی اردو بہت کمزور ہے۔ مجھے جیسے شاک لگا ہو۔ اس لیے کہ مدرسہ سے پڑھنے کے بعد یہ ذہن بنتا ہے کہ مدرسہ والوں کی اردو بہت اچھی ہوتی ہے۔ بہر حال اس کے بعد میں نے اردو سیکھنے پر خاص توجہ دینی شروع کی، مولانا بھی اصلاح کرتے رہتے تھے، جس سے میری اردو کافی بہتر ہوئی۔

مولانا کی محبت ہی تھی کہ فیملی، گھر کے بارے دریافت کرتے رہتے۔ ضروری مشورے دیتے۔ مولانا کے مشورے نہایت پریکٹکل اور دور رس نتائج کے حامل ہوتے۔ فروری 2001 میں میری شادی کے موقع پر مولانا نے کامیاب ازدواجی زندگی کے دو اہم فارمولے بتائے جن پر عمل کر کے

الحمد للہ ہم خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ دو فارمولے ہیں— ایک، یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں۔ دوسرا، شادی نام ہے ایڈجسٹمنٹ کا۔

مولانا کی صحبت میں رہ کر ہم نے ان اہم اسلامی تعلیمات کو عملاً سیکھا جو ہمارے علماء میں آج تقریباً مفقود ہیں۔ جیسے سادگی، صبر، شکر، اعراض اور تفکر وتدبر۔

مولانا کی پوری زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ مولانا سادہ، بغیر استری کیا ہوا کپڑا پہنتے۔ مولانا آخر عمر سے کچھ پہلے تک فرش پر ہی سوتے تھے۔ سخت سے سخت گرمی میں بھی اپنے لیے پنکھا چلانا تک پسند نہیں کرتے تھے۔ اکثر لوگ مولانا پر تنقید کرتے ہوئے کہتے تھے کہ مولانا کوٹھی میں رہ کر اور AC میں سو کر قوم کے مسائل کو کیا سمجھیں گے۔ ان کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ مولانا پنکھے تک میں سونا پسند نہیں کرتے تھے۔ میں جب بھی گرمی میں مولانا کے پاس جاتا تو کہتے کہ دیکھئے آپ کو ضرورت ہو تو آپ پنکھا چلا سکتے ہیں، مجھے پنکھے کی ضرورت نہیں۔ مولانا کھانا بھی بہت سادہ کھانا پسند کرتے تھے۔ مرغن غذا مولانا کو پسند نہیں تھی۔

میوات کے ایک سفر میں مولانا کے ساتھ کھانے سے متعلق ایک واقعہ گزرا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی کھانوں کے پسند سے متعلق احادیث کی نہایت جامع تشریح ہوتی ہے۔ اس کے بعد تمام اشکالات رفع ہوجاتے ہیں۔

اس کی مزید تشریح مولانا کی تحریر ڈائری 1985 (زیر طبع) میں موجود اس تحریر سے ہوتی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار حضرت ام ہانی کے گھر گئے۔ پوچھا کہ کچھ کھانے کے لیے ہے۔ انھوں نے کہا کہ سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا اور سرکہ ہے (كِسَرٌ يَابِسَةٌ وَخَلّ)۔ آپ نے فرمایا: جس گھر میں سرکہ ہو اس کو سالن کے معاملے میں غریب نہیں کہا جاسکتا (فَمَا أَقْفَرَ بَيْتٌ مِنْ أُدُمٍ فِيهِ خَلٌّ) سنن الترمذی، حدیث نمبر 1841۔ اس کے بعد آپ نے سرکہ اور روٹی نہایت شوق کے ساتھ کھایا۔ اسی طرح مختلف روایتوں میں مختلف کھانوں کے بارے میں آپ کی پسندیدگی کا ذکر ہے— مثلاً سرکہ، شہد، روغن زیتون، حلوہ، کدو، گوشت، ککڑی، لوکی، کھچڑی، دودھ، مکھن، کھجور، وغیرہ۔ اس سلسلے میں اہم سوال یہ ہے کہ آپ کے پسندیدہ کھانوں کی فہرست میں وہ تمام چیزیں شامل

ہیں، جو اس وقت کے مدینہ میں رائج تھیں۔ اگر اس سلسلہ کی مختلف روایتوں کو جمع کیا جائے تو رائج کھانوں میں سے کوئی بھی چیز نہیں بچے گی، جو آپ کے مرغوب کھانے کی فہرست میں شامل نہ ہو۔ پھر اگر آپ کو ہر کھانا پسند تھا تو وہ کون سا کھانا ہے جو آپ کو پسند نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پسندیدہ اور ناپسندیدہ کا معاملہ ہی نہیں۔ آپ کے اس قسم کے تمام کلمات میزبانوں کی حوصلہ افزائی کے کلمات ہیں۔ اس وقت مدینہ میں کھانے کے سامان کی کمی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جہاں آپ جاتے اس کے یہاں کوئی ایک سالن ہوتا تھا۔ میزبان شرمندگی کے ساتھ ''جو کھانا موجود ہو''، لے آتا۔ آپ شرافت کے تقاضے کے تحت فرماتے کہ یہ تو بہترین کھانا ہے، اور پھر شوق سے اس کو کھانے لگتے۔ اس طرح کے تمام کلمات میزبان کی حوصلہ افزائی کے کلمات ہیں، نہ کہ کھانے کے بارے میں اپنی پسندیدگی بتانے کے کلمات۔'' (ڈائری، 5 دسمبر 1985)

مولانا کے خلاف طعن و تشنیع کی چار سو سے بوچھار ہوتی رہتی تھی لیکن مولانا اس کا نوٹس کیے بغیر اپنے مشن میں لگے رہتے۔ بہت ضروری ہوتا تو علمی جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے۔ مولانا تدبر و تفکر پر بہت زیادہ زور دیتے۔ خود مولانا کی پوری زندگی ''التفکر والاعتبار'' کا نمونہ تھی۔ مولانا ہر ایک واقعے سے نصیحت لیتے۔ جب بھی ہم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے، مولانا سوال کرتے کہ آپ کے پاس کوئی خبر ہے۔ اگر ہم کوئی واقعہ یا خبر بتاتے تو مولانا اس سے کوئی نہ کوئی نصیحت کا آئٹم پا لیتے۔

مولانا کی پوری زندگی خدارخی زندگی تھی، وہ ہر وقت اللہ کی یاد میں جیتے تھے۔ ان کی تحریریں تمام تر خدارخی زندگی پر زور دیتی ہیں۔ اللہ کی معرفت مولانا کا گریٹسٹ کنسرن (concern) تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ الحمدللہ سی پی ایس کا ہر ممبر بہت حد تک خدا میں جینے والا بن گیا ہے۔

مولانا نے قوم کو ماڈرن تعلیم کی طرف رہنمائی کی، اور حکمت کے ساتھ اپنے سماجی اور سیاسی مسائل کو حل کرنے پر زور دیا۔ مولانا نے مسلم قوم کے تمام تر مسائل کی وجہ ان کے ماڈرن تعلیم سے دوری کو بتایا ہے۔ کئی بار جب میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے دریافت کیا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں، کیا وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں کہتا کہ جی پڑھ رہے ہیں تو فرماتے ان کو اچھے اسکول میں پڑھائیے، اور ان کے شعور کو ڈیولپ کیجیے۔ Does and don't کی زبان میں ان کو مت بتائیے۔ بلکہ زیادہ تر

معاملے میں ان کو خود فیصلہ لینے کا اختیار دیجیے۔ باشعور ہوں گے تو وہ خود بہتر فیصلہ لے سکتے ہیں۔

مولانا نے تقریباً ہر ٹاپک پر قلم اٹھایا ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔ مولانا کی تحریروں سے جو ذہن بنتا ہے وہ ایک بیدار اور حکمت سے پر ذہن بنتا ہے۔ آج اگر ہم یہ عہد کریں کہ مولانا کی کتابیں خود بھی پڑھیں گے اور کم سے کم 10 افراد تک مولانا کا لٹریچر پہنچائیں گے تو ان شاء اللہ جلد ہی ہم وہ وقت دیکھیں گے کہ دنیا میں ہر طرف امن، بھائی چارہ، برداشت اور اعتراف کا ماحول ہوگا۔

---

# میرے معلم و مربی

## عبدالصمد ابن خلیل احمد، سی پی ایس، پونا

بے شک علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا وحید الدین خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو علم نبوت سے وراثتِ علم پائی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میں حضرت مولانا وحید الدین خان صاحب سے مسلسل پچاس سال سے منسلک و مربوط رہا ہوں، اور دن بدن حضرت کی محبت بڑھتی رہی۔ مولانا مرحوم و موصوف میرے لیے ایک رہبر کامل، مربی و معلم شفیق رہے۔ ہم نے حضرت مولانا سے جو علمی و روحانی فیض حاصل کیا ہے وہ اتنا عظیم ہے کہ میرے پاس اس کو بیان کرنے کے لئے نہ الفاظ ہیں اور نہ صلاحیت و علمی قدرت۔

مختصراً عرض ہے کہ حضرت مولانا سے جو علم و جذبہ میں نے سیکھا اس سے میرے دین و دنیا سنور گئے۔ ہم نے مولانا سے صبر و استقامت سیکھی، عفو درگزر کرنا سیکھا، بحث و مباحثوں سے پرہیز و گریز کرنا سیکھا، زمانہ سے آگاہ و باخبر رہنا سیکھا، غیر مسلموں کو مدعو سمجھنا سیکھا، ورنہ تو غیر مسلموں کو ہم بھی دشمن تصور کرتے تھے۔ نیز محنت و مشقت کرنا، جد و جہد کرنا، مواقع کو استعمال کرنا سیکھا، گلے شکوے چھوڑ دیے، لینے والا بننے کے بجائے دینے والا بننا سیکھا، علم کو بڑھانا، پڑھنے لکھنے کو مشغلہ بنانا سیکھا۔

تھوڑا ہی صحیح لیکن سب کچھ اہم و ضروری علم ہم نے مولانا مرحوم و مغفور سے سیکھا، جو علم و جذبہ شاید ہم کسی اور سے نہ سیکھ پائے۔ یہ سب کچھ ہم نے حضرت مولانا سے سیکھا۔

# مولانا وحیدالدین خاں

محمد احسن تہامی، دارالتذکیر، لاہور

مولانا وحیدالدین خاں سے میرا تعارف 1983 میں الرسالہ کے ذریعے ہوا۔ یہ رسالہ یوسف خان مرحوم (جو ادارہ معارف اسلامی منصورہ میں لائبریرین تھے) نے استادگرامی جاوید احمد غامدی کو پیش کیا تھا۔ پھر 1984 میں مولانا محترم ڈاکٹر اِسرار احمد کی دعوت پر محاضرات قرآنی میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تو ان کو سننے کا موقع بھی ملا۔ پھر آہستہ آہستہ مولانا محترم کی کتب پڑھنے کا موقع ملا تو مولانا مودودی کا فکری غلبہ دھندلانے لگا۔ 1988 میں ماہنامہ تذکیر کا ڈیکلریشن حاصل ہوا تو الرسالہ کا پاکستانی ایڈیشن شائع کیا۔ 1991 میں جناب نعیم بلوچ اور دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر مولانا محترم کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ مولانا ایک ہفتے کے لیے تشریف لائے۔ ان کی رہایش کا بندوبست گارڈن ٹاون، لاہور میں جناب کرامت شیخ کے ہاں کیا گیا۔ یہاں فجر کی نماز کے بعد مولانا محترم سے استادگرامی جاوید احمد غامدی کی معیت میں خصوصی نشستیں ہوئیں۔ ان مجلسوں میں استاد نے مولانا کے تصورِ دین پر چند سوالات اٹھائے۔ ان مجالس کے دیگر شرکا میں ڈاکٹر منیر احمد، طالب محسن، رفیع مفتی اور نعیم بلوچ شامل ہیں۔

میں وہ لمحہ کبھی نہیں بھول سکتا جب مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے نکلتے وقت مولانا نے غامدی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ میری فکر پر پہلی مرتبہ آپ نے سنجیدہ علمی تنقید کی ہے۔ آپ کے نقد کی روشنی میں اپنی فکر کا اب مجھے ازسرنو مطالعہ کر کے جائزہ لینا پڑے گا۔ مگر افسوس کہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ان الفاظ میں جو دردمندی تھی، وہ دین کے صرف ایک سچے طالبِ علم کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔

1992 میں، میں نے ''دارالتذکیر'' کے نام سے مولانا محترم کی کتب شائع کرنا شروع کر دیں۔ مولانا دنیا کے اُن مصنفین میں سے ہیں جن کی کتب بے پناہ مقبول تھیں، لیکن انھوں نے دعوتی مقاصد کے لیے اس کی اشاعت کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ ہر شخص انھیں شائع کر سکتا ہے۔ وہ ان کی کوئی رائلٹی نہیں لیتے تھے۔

انڈیا میں مولانا کی نئی کتاب کی اشاعت اور الرسالہ کے تاخیر سے وصول ہونے کے حوالے سے کبھی کبھار مولانا سے فون پر رابطہ ہو جاتا۔ 1997 میں ''شتم رسول کا مسئلہ'' شائع کی تو ایک مخصوص مذہبی گروہ نے کتاب پر پابندی لگوا دی۔

2006 میں کتاب میلے میں شرکت کے لیے دہلی جانا ہوا تو دس دنوں میں سات دن صرف مولانا کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ میں صبح ناشتے کے بعد ہوٹل سے مولانا کے ہاں پہنچ جاتا اور رات عشاء کے بعد واپس لوٹتا۔ اُس وقت برادرم محمد ذکوان ندوی مولانا کے معاون کے طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے۔ مولانا کی سادگی، شفقت، محبت، اخلاص، اپنائیت اور تعلق باللہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دوسری مرتبہ 2008 میں اپنی اہلیہ کے ساتھ دہلی جانا ہوا تو دوبارہ مولانا کے ساتھ کچھ دن گزارنے کا موقع ملا۔ اُن دنوں کے چند تاثرات اور یادداشتیں ان شاءاللہ آئندہ کبھی لکھوں گا۔ (7 مئی 2021ء)

---

مولانا وحیدالدین خاں بھی رخصت ہو گئے۔ اس سے بڑا سانحہ اس دور کا نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں ریشنل تھنکنگ کی سب سے توانا آواز آج خاموش ہو گئی۔ ابتدائی مذہبی ادوار میں میرے اوپر جس شخصیت کا سب سے زیادہ اثر رہا، وہ مولانا ہی تھے۔ خاں صاحب نے عصری اسلوب میں 200 سے زائد اسلامی کتب تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے راز حیات، کتاب زندگی، اظہارِ دین، الاسلام یتحدی، ترجمہ قرآن ہر مشکل وقت کا سہارا رہی۔ (احمد ہاشمی)

---

مولانا وحیدالدین خان صاحب وفات پا گئے۔ علم کا چلتا پھرتا جیتا جاگتا اک جہان تھے۔ متشدد سوچ محدود اپروچ کے حامل لوگوں سے سے بچنے کے لیے ہم بہت سے اجتہادی فکر رکھنے والے انمول لوگوں سے مل نہیں پاتے ہیں، ان کی باتیں ہم نہیں کر پاتے، ان کے علم کے بہتے چشموں سے ہم اپنے حلقہ احباب کو سیراب نہیں کر پاتے ہیں، یہ سوچتے ہوئے کہ چھوڑیں اندھوں کی نگری میں کیا شیشہ بیچنا۔ کس عذاب اور وحشت میں ہم جی رہے ہیں۔ خیر ان شاءاللہ کوشش ہو گی اس مہینے میں ان کا فیض عام کیا جائے۔ (اے ایچ کھوکھر)

# مولانا وحیدالدین خان کی بات

مجیب الرحمن شامی، پاکستان

مولانا وحیدالدین خان ایک صدی کے لگ بھگ اِس دُنیا میں گزار کر بالآخر اپنے رَب کے پاس چلے گئے کہ جس کی رضا کا حصول ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ ان کا نام پہلی بار اُس وقت سنا جب کالج میں سیکنڈ یا تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس وقت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور جماعت اسلامی توجہ کا مرکز تھے۔ ان کی کئی کتابیں نظر سے گزر چکی تھیں۔ میں نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول پاک پتن سے پاس کیا تو ایف اے میں داخلے کے لیے بوریوالہ جانا پڑا۔ وحیدالدین خان کا نام انہی دِنوں سامنے آیا، جب کہ مولانا مودودیؒ کی فکر پر ان کی تنقیدی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' شائع ہوئی۔ پھر اس کے بعد یہ کتاب نظر سے گزری، اور مولانا وحیدالدین خان کی شخصیت نظروں میں سما کر رہ گئی۔

محترم غلام احمد پرویز سے لے کر مولانا غلام غوث ہزاروی، اور مولانا محمد عمر اچھروی تک مولانا مودودی کے خلاف جارحانہ تنقید میں پیش پیش تھے۔ ان کے خلاف آئے روز مضامین اور کتابیں شائع ہوتیں، اکثر تحریروں سے ذاتی مخاصمت کی بو آتی۔ اس ماحول میں وحیدالدین خان کے سنجیدہ لہجے میں کی گئی علمی تنقید نے سب کو چونکا دیا۔ خان صاحب کم و بیش پندرہ سال جماعت اسلامی ہند میں شامل رہے تھے۔ اس کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ مولانا کی فکر سے اختلاف کرتے کرتے ان کا راستہ الگ ہو گیا، انہوں نے جو کچھ سوچا، اور جو کچھ لکھا، اُسے جماعت اسلامی ہند کے زعماء اور مولانا مودودیؒ کی خدمت میں بھیجا۔ تحریری تبادلہ خیال کی بہت کوشش کی، لیکن مولانا نے کسی ''مناظرے'' میں الجھنے سے انکار کیا، اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ اپنے افکار کو جامہ اشاعت پہنا دیں۔ مولانا وحیدالدین خان نے بقول خود بڑے بوجھل دِل کے ساتھ اپنی تحریر کتابی شکل میں پیش کر دی۔

ان کے سنجیدہ اور مؤدبانہ لہجے نے ان کی شخصیت کا جو تاثر قائم کیا، آخر دم تک اس میں کمی نہیں آئی۔ مولانا وحیدالدین اقامتِ دین کے فریضے اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے ذریعے رضائے الٰہی کے

حصول کو ''سیاسی اسلام'' قرار دیتے اور اس سے شدید اختلاف کرتے رہے۔ تفصیل میں جانے کا یہ کالم متحمل نہیں ہوسکتا، مولانا وحید الدین نے اپنی بات کو شائستگی اور عمدگی کے ساتھ پیش کیا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ وہ اسلام کو دعوت کا دین قرار دیتے اور دعوت ہی کے ذریعے تبدیلی لانے کے آرزومند رہے، اسی نکتے کی تشریح و تعبیر میں زندگی گزار دی۔ ان کے ہاں مبارزت نہیں، اخوت ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے کشتی نہیں لڑتے، انہیں حریف قرار نہیں دیتے، ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے اور اپنے نقطہ نظر کے حق میں دلائل فراہم کرتے ہیں۔ ہندوستان میں انہیں غیر مسلم حلقوں میں بہت پذیرائی ملی، حکومت نے اُنہیں کئی اعزازات کا مستحق گردانا۔ بین الاقوامی ایوارڈ بھی پیش کئے گئے۔ ان کے ''الرسالہ'' نے دھوم مچائے رکھی وہ ہندی اور انگریزی میں بھی اسلام کی دعوت کو پھیلانے کا ذریعہ بنا رہا۔ مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات ان کے اسلوب کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار رہی۔ اسے مرعوبیت بھی قرار دیا گیا، لیکن مولانا نے اپنا راستہ نہیں بدلا، ثابت قدمی سے ان کا سفر آخری عمر تک جاری رہا۔

تین عشرے پہلے وہ پاکستان آئے تو لاہور میں ایک ہفتہ قیام کیا تھا۔ ان کے اعزاز میں کئی تقریبات منعقد ہوئیں، ان سے بات چیت کے کئی دور ہوئے۔ پاکستان اور بھارت کے مابین وہ اچھے تعلقات پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کی بہت سی باتوں سے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا تھا، لیکن اس بات کا وزن دونوں ممالک میں کم نہیں کیا جاسکتا کہ امن کا قیام دونوں کے مفاد میں ہے، بلکہ آکسیجن کی طرح ہے، لڑائیاں بہت لڑی جاچکیں، ان سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ مولانا مرحوم کا پختہ خیال تھا کہ مسلمان دعوت ہی کے ذریعے دنیا کا مقابلہ کرسکتے اور اسے تبدیل کرسکتے ہیں۔ دشمن بن کر، دشمن سمجھ کر یا دشمن بنا کر اپنی جنت تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ (بشکریہ روزنامہ دنیا)

---

ایک اور ''خدا پرست'' خدا سے جاملا۔ ان شاء اللہ جنت میں ملاقات ہوگی۔ (اگر یہ گناہگار وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا) ۔محمد حذیفہ ندیم ملتان

---

مولانا وحید الدین خان صاحب اپنے عہد کے عظیم انسان تھے اور اور اسلام کے لیے مولانا صاحب کی خدمات بلاشبہ سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ (عنصر عباس، چینوٹ)

# میرے مینٹر، میرے گائڈ

ڈاکٹر سفینہ تبسم، سہارن پور، یوپی

میں نے 2007 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی پڑھائی مکمل کی۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں مولانا کی کوئی کتاب پڑھوں۔ کیونکہ میرے گھر میں الرسالہ اور دوسری کتابیں آتی تھیں۔ میں نے ’گاڈ ارائزز‘ نام سے مولانا کی ایک کتاب پڑھی۔ ابھی وہ کتاب پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے لگا کہ مولانا نے مجھے میرے خدا سے انٹروڈیوس کرا دیا۔ میں اندھی تھی، جو اتنے سال سائنس کی اسٹوڈنٹ رہنے کے باوجود اللہ کی معرفت نہ حاصل کرسکی تھی۔ مولانا کی کتاب سے یہ معلوم ہوا کہ سائنس کے ذریعے میں خدائی حقیقتوں کو مزید بہتر طور پر پاسکتی ہوں۔ یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔

پھر میں نے الرسالہ کا مستقل مطالعہ شروع کردیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر کی پرتیں ہٹا کر الرسالہ کی آئیڈیولوجی پینیٹریٹ کر دی گئی ہے۔ سال 2010 سے میں نے ریگولر طور پر مولانا کی سنڈے کلاسوں میں جانا بھی شروع کردیا۔ اس کے بعد مولانا نے میری سوچ پوری طرح ٹرانسفارم کر دی۔ مولانا نے سب سے زیادہ مجھے سوچنا (آرٹ آف تھنکنگ) سکھایا، تدبر، تفکر اور توسم پر زور دیا، جس سے میں انجان تھی۔ نگیٹیو تھنکنگ سے نکال کر پازیٹیو تھنکنگ میں جینا سکھایا، ”کریٹیو تھنکنگ کیا ہے“ یہ بتایا۔ مائنڈ بیسڈ اسپریچولٹی کو میں مولانا ہی سے جانا۔ آج میں یہ سوچتی ہوں کہ مولانا نہ ہوتے تو میں اندھیروں میں زندگی کاٹ رہی ہوتی۔ مجھے یہ مشن نہ ملا ہوتا تو میں ’تکاثر کلچر‘ میں جی رہی ہوتی، اللہ سے کنٹیکٹ نہیں ہو پاتا، اپنے خالق سے حبِّ شدید ڈیولپ نہیں کر پاتی، اور یہ میرے لیے سب سے بڑا نقصان ہوتا۔ کیونکہ زندگی ایک بار ملتی ہے اور اگر زندگی میں انسان کو معرفت نہ ملی تو دوسرا موقع اس کو ملنے والا نہیں۔

میں نے مولانا کو ہمیشہ دو چیزوں کو کنسرن بناتے دیکھا ہے— اپنے لیے معرفت اور دوسرے کے لیے دعوت۔ یہی کلچر میں چاہتی ہوں کہ میرے اندر بھی پوری طرح سے آجائے۔ اللہ میری مدد کرے (آمین)۔

# مولانا سے یادگار ملاقات

مولانا فیاض الدین عمری، گلبرگہ، کرناٹک

28 مارچ 2008 جمعہ کا دن تھا۔ استفادہ کی غرض سے میں نے مولانا وحید الدین خاں صاحب سے فون پر ملاقات کا وقت مانگا تھا۔ مولانا نے C29 آنے کی اجازت دے دی۔ مولانا نے مجھ سے ہماری دعوتی ٹیم کی ساری سرگرمیوں کو بغور سنا۔ اور اس مجلس میں مجھ سے کہا کہ آپ داعی نہیں ہیں! میں نے حیرت سے استفسار کیا کہ وہ کیسے؟ میں تو دس سال سے مکمل دعوتی سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ کیسے آپ یہ کہتے ہیں کہ میں داعی الی اللہ نہیں ہوں۔!!؟

مولانا نے میری اسکروٹنی کی خاطر مجھ سے پوچھا کہ سچ سچ بتائیے کہ آپ کو ہندوؤں سے نفرت ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ بالکل بھی نہیں۔ مولانا نے پھر پوچھا کہ ٹھیک ہے آپ کو ہندوؤں سے نفرت نہیں ہے مگر کٹر واد ہندوؤں سے ضرور نفرت ہوگی؟ میں نے جواب دیا کہ ان سے بھی مجھے نفرت نہیں ہے! مولانا نے پھر مجھ سے پوچھا کہ بتائیے آپ یہود سے نفرت کرتے ہیں یا نہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں بالکل میں یہود سے نفرت کرتا ہوں۔ مولانا نے پوچھا کہ آپ ان سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟

میں نے کہا کہ اس لیے کہ وہ ہماری خواتین اور بچوں کو قتل کرتے ہیں! مولانا نے کہا کہ کیا یہود ہمارے مدعو نہیں ہیں!؟ رسول اللہ ان کی طرف بھی مبعوث ہیں یا نہیں!؟ میں نے کہا کہ ہاں ان کی طرف بھی رسول اللہ مبعوث ہیں۔ مولانا نے کہا کہ پھر ان سے نفرت کیسی؟!

یاد رکھیے کہ آپ ہرگز ہرگز جنت میں کسی انسان کی نفرت کے ساتھ داخل نہیں ہو سکتے، جنت میں داخلہ کی شرط نفرت سے خالی ذہن ہے۔ حدیث میں اہل جنت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ أَفْئِدَتُهُمْ مِثْلُ أَفْئِدَةِ الطَّيْرِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2840)۔ ان کے دل چڑیوں کے دل کی مانند ہوں گے۔

آپ ابھی اور اسی وقت اپنے دل سے نفرت ختم کیجیے، ورنہ آپ کا جنت میں داخلے کا معاملہ مشکل میں پڑ جائے گا۔ میں نے اسی وقت 28 مارچ 2008 کو مولانا سے وعدہ کیا کہ میں آج کے

بعد کسی بھی انسان سے شکایتوں کے باوجود نفرت کو روا نہیں رکھوں گا۔

21 اپریل 2021 کو مولانا کا نئی دہلی کے اپولو ہسپتال میں انتقال ہو گیا، مولانا نے انتقال سے کچھ دن قبل اپنے ٹیم ممبرز کو یہ وصیت کی کہ:

''اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آدمی یہاں اس طرح زندگی گزارے کہ اس کے دل میں کسی کے خلاف ذرا بھی نگیٹیو تھاٹ نہ ہو۔ وہ دنیا سے اس طرح چلا جائے کہ اس کا مائنڈ پوری طرح پازیٹیو مائنڈ ہو۔ اس دنیا کی یہی میری آخری دریافت ہے''۔ (الرسالہ جون-جولائی 2021)

---

مولانا وحیدالدین خان کی رحلت، مذہبی فکر میں توازن، متانت اور روشن فکری کے ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ وہ نئے زمانے کے مسائل وسوالات کے تناظر میں مذہبی فکر پر نظر ڈالتے تھے اور مذہب کو نئے زمانے میں بیگانہ تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ جدید ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کو گمراہ کن قرار دینے کی بجائے انھیں سمجھنے اور اسلام کی روشنی میں جواب تلاش کرتے تھے۔ وہ سادہ، منطقی ومدلل زبان میں نئی نسل کی خاص طور پر راہنمائی کرتے تھے اور ان کے دل میں باوقار انداز میں اور خدائی اصولوں کے مطابق جینے کی امنگ پیدا کرتے تھے۔ مولانا وحیدالدین خان ایک ان تھک عالم تھے اور غیر معمولی متجسس ذہن کے مالک تھے۔ ان کی ڈائریاں ان کے شب روز کا احوال بتاتی ہیں کہ کیسے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے، عام سے واقعات کی مدد سے گہری مذہبی بصیرت اخذ کرتے اور عام کرتے تھے، ''راز حیات'' تو ہر نوجوان کو پڑھنی چاہیے۔ (ناصر عباس نیرؔ، سابق ڈائریکٹر اردو سائنس بورڈ، پاکستان)

---

پوری انسانیت کے لیے رو رو کر دعائیں مانگنے والے ہونٹ آج خاموش ہو گئے۔

(عامر قریشی، کوہاٹ، پاکستان)

# وہ جو آنسوؤں پر ٹھہرا ہوا تھا

مولانا خطیب اسرار الحسن عمری، سی پی ایس (چنئی)، تامل ناڈو

21، اپریل، 2021 کی رات ماہنامہ الرسالہ جون 2021 کی پروف ریڈنگ کرکے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ صبح میں مولانا فرہاد صاحب کو ای میل کردوں گا۔ اور یہ بھی ذہن میں بات چل رہی تھی کہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کی طبیعت دن بدن بگڑتی جارہی ہے لیکن آپ کا ماہنامہ الرسالہ جون 2021 کی ترتیب حسبِ معمول وقت پر مکمل ہوچکی ہے۔ امید تھی کہ مولانا اس رسالہ کا اجرا اپنے ہاتھ سے فرمائیں گے اور ہم سے اس کا فیڈ بیک مانگیں گے۔ اور اسی کے ساتھ مولانا کے لیے مکمل صحت کی دعا کرتے ہوئے آنکھ بند کرلی۔

شب کے گیارہ بجے مولانا اقبال عمری کا فون آیا اور میں نے گھبراتے ہوئے فون ریسیو کیا تو اقبال صاحب کی مغموم آواز آئی کہ اب مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے۔ فوراً میں نے مولانا کے لیے دعا کرتے ہوئے فون بند کرکے CPS International کا آفیشیل واٹس ایپ گروپ کو چیک کیا تو اس میں مولانا کے فرزند ڈاکٹر ثانی اثنین خان صاحب کا مسیج تھا:

Inna Lillahi wa Inna Ilaihi rajiwoon.
With great sadness we want to share the passing away of Maulana Wahiduddin Khan. He has left us one big family to stay united and work for the cause of Dawah. Please do dua. (10:52 pm, 21.01.2021)

اور اس کے نیچے CPS International کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر رجت ملہوترا کا یہ پیغام تھا:

Our training is over and now we have to work together as Dr sahab has stated above as one family.

مولانا کی وفات کی خبر سننے اور یہ میسجس پڑھنے کے بعد میں بڑے بوجھل دل کے ساتھ کھڑا ہوا اور دو رکعت نماز ادا کرکے مولانا کے لیے اور آپ کے دعوتی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے خوب دعا کی۔ مگر دل بے قرار و پریشاں تھا۔

اس وقت مجھے مولانا کی ایک بات یاد آئی کہ جب کبھی آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہو تو آپ قرآن

لے کر کسی صفحے کو کھول کر دیکھیں، اس میں ضرور آپ کے لیے کوئی رہنمائی (guidance) ہوگی۔تو میں نے قرآن کھول کر دیکھا تو میری نظر سورہ یونس کی اس آیت پر پڑی: فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیكُمۡ عُمُرًا مِنۡ قَبۡلِهِ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ (10:16)۔یعنی میں اس سے پہلے تمھارے درمیان ایک عمر بسر کر چکا ہوں، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس آیت کو پڑھتے ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ گویا خدا یہ کہہ رہا ہے کہ دیکھو مولانا تمھارے درمیان 96 سال کی زندگی بسر کر چکے ہیں۔ کیا اس میں تمھارے لیے کوئی رہنمائی نہیں۔تو میرے ذہن میں اس وقت مولانا کی پوری زندگی گھومنے لگی۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک کے سارے واقعات یاد آنے لگے۔آپ کی تمام مجالس میں ایک بات جو مشترک تھی وہ یہ کہ خدا کی یاد اور روزِ قیامت کا چرچا۔

آج سے بیس سال پہلے اگست 2001 کو پہلی بار مولانا سے ملاقات کے لیے آپ کے دفتر C-29، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی میں شیخ ریاض موسی ملیباری مرحوم اور مولانا فیاض عمری کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ یہ ملاقات فیاض صاحب نے طے کروائی تھی۔ جب ہم مولانا سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو شیخ ریاض موسی صاحب نے مولانا کی خدمت میں ایک قلم اور ایک مسواک کا تحفہ دیا اور کہا کہ ہم نے آپ کی ڈائری میں پڑھا ہے کہ آپ کو یہ دونوں چیزیں پسند ہیں۔مولانا نے جواب دیا کہ ہاں، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ میں جوان تھا لیکن میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، اب میری عمر 75 سال کی ہو چکی ہے۔اب میرے قدم قبر کے قریب ہو چکے ہیں۔اور موت میرے بہت قریب ہے۔

آج کل مجھے یہ فکر رہتی ہے کہ اگر اچانک فرشتے آ کر مجھے خدا کے سامنے حاضر کر دیں تو میں خدا کے سامنے اپنا کون سا عمل پیش کر سکتا ہوں جو میری نجات کا باعث بنے۔عموماً لوگ کوئی ایک کتاب تصنیف کر کے یہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب میرے لیے وسیلۂ نجات ہوگی۔

لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں کہ خدا کے سامنے میری تصنیف کردہ ان کتابوں کی کیا حقیقت ہوگی جب کہ ایک چھوٹی سی دیا سلائی ان کو جلا کر راکھ (ashes) میں تبدیل کرنے کے لیے کافی ہے تو میں ان کو کیسے خدا کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ جب کہ خود رسول اللہ نے کہا تھا کہ میری نجات

صرف خدا کے فضل و رحمت سے ہوگی میرے عمل سے نہیں: إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللهُ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2816)۔ جب ایک نبی خود خدا کی رحمت و فضل کا محتاج ہے تو میری اور میری تصنیفات کی خدا کے سامنے کیا حقیقت ہوگی۔ مگر یہ کہ خدا مجھ پر اپنا فضل کرے۔

میں آج کل خدا سے اسی رحمت اور فضل کی دعا کرتا رہتا ہوں۔ یہ کہہ کر مولانا رو پڑے اور مسلسل آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور میں حیرانی سے پہلی بار کسی بڑے عالم کو آخرت کے ذکر پر روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

یہ مولانا کے ساتھ میری پہلی ملاقات کا حال تھا اور اس کے بعد 2001 سے 2021 تک مولانا سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر مجلس کی یہی کیفیت ہوتی تھی، یہاں تک کہ آپ اپنے خالق سے جا ملے۔

میں اور مشن کے تمام ساتھی اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کی کوئی بھی مجلس اور گفتگو خدا کے ذکر اور آخرت کی یاد سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ ہر مجلس میں آپ کو خدا کی یاد پر روتا ہوا پایا۔ گویا کہ آپ ہمیشہ انہیں آنسوؤں پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ کہا کرتے تھے کہ میرا مشن خدا کے سامنے آنسوؤں پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس لیے خدا اس مشن کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

مولانا اور حبِ الٰہی

مولانا وحید الدین خان ہمیشہ قرآن کی آیت وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (2:165) پر بہت سوچا کرتے تھے، یعنی اور جو ایمان والے ہیں، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور کہا کرتے تھے کہ اِس آیت میں خدا سے حب شدید کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر تاریخ میں حبِ شدید کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ حبِ شدید خدا سے اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہر دوسری چیز کی محبت دل میں ذرہ برابر نہ ہو۔ میں نے پہلی بار مولانا کی زندگی سے یہ جانا کہ خدا سے شدید محبت کیا ہوتی ہے۔ مولانا ہمیشہ اپنے آپ کو ہر اس چیز سے دور رکھتے تھے جس سے ان کو محبت ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جیسے لگژوریس لائف، مہنگے کپڑے اور پر لذت کھانا، حتیٰ کہ اپنی اولاد سے بھی بے جا پدرانہ محبت سے دوری بنائے رکھنا تا کہ کہیں ان سے محبت خدا کی محبت پر غالب نہ آجائے۔

ایک بار میں نظام الدین ویسٹ میں مولانا کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا درس دے رہے تھے اور اس مجلس میں زیادہ تر علماء تھے۔ درس کے بعد سوال و جواب کی نشست رہی۔ اسی دوران

مولانا کے پوتے عدنان خان مولانا کے کمرے میں اپنے کسی کام سے آئے اور کچھ دیر بعد چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مولانا نے پوچھا کہ کون صاحب تھے۔ مولانا کو بتایا گیا کہ آنے والے آپ کے پوتے عدنان تھے۔ مولانا یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہا کہ کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ ایک بوڑھے انسان کو سب سے زیادہ کس سے محبت ہوتی ہے؟ حاضرین خاموش تھے۔ خود مولانا نے جواب دیا کہ ایک بوڑھے انسان کو سب سے زیادہ محبت اپنے پوتے سے ہوتی ہے۔

مولانا نے سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ عدنان میرے پوتے ہیں پھر بھی میں نے کبھی ان کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔ جب بھی وہ میرے سامنے آتے ہیں تو میں اپنی نظریں پھیر لیتا ہوں۔ میں ایسا اس لیے کرتا ہوں تا کہ اس کی محبت خدا کی محبت پر غالب نہ آجائے۔ پھر مولانا نے روتے ہوئے کہا کہ میں خدا سے حبِ شدید کے لیے کوئی بھی قیمت دے سکتا ہوں، لیکن خدا سے حبِ شدید میں کسی طرح کی کمی کو برداشت نہیں کرسکتا، اور خدا مجھے کیسے معاف کرسکتا ہے اگر میرے دل میں اس کے لیے حبِ شدید نہ ہو۔ اور میں اس حب شدت میں کسی کو شریک کرلوں! اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کے دل میں کس قدر خدا سے حبِ شدید تھا۔ یہی وہ حبِ شدید ہے جو خدا کو بندے سے مطلوب ہے جس کو مذکورہ آیت (2:165) میں بیان کیا گیا ہے۔

خدا مولانا کو غریقِ رحمت کرے اور ہم سب کو مولانا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تا حیات خدا کی معرفت حاصل کرنے کی توفیق دے اور انسانوں کا خیر خواہ بن کر خدا کے پیغام کو ہر گھر تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

---

بے شک مولانا سے ہم نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے — معرفت الٰہی، سفر آخرت کی تیاری، عالم انسانیت سے محبت، امن عالم اور دعوت دین مبین جیسے موضوعات پر انھوں نے جس درد دل سے اپنا پر تاثیر قلم اٹھایا اور جس دلکش فطری اسلوب میں اپنا مشن صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا، اب شاید ہی اس جیسی سحر انگیز تحریر سے ہم بہرہ مند ہو سکیں۔ (پروفیسر بخت ایاز خان، کے پی کے)

# ایک تاثر

[ذیل کا تاثر مولانا وحید الدین خاں صاحب کے انتقال سے کچھ دنوں پہلے ایک نوجوان نے لکھ کر دیا تھا]

مولانا، میں نے آپ کی اکثر کتابوں کو پڑھا ہے۔ بہت کچھ سیکھا ہے اور بھی سیکھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ آپ نے پورے دل کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو ادا کیا ہے۔ اللہ کی مدد سے آپ نے الحاد (atheism) کے خلاف نہایت اہم کام کیا ہے۔ سائنسی دور میں آپ نے زمانے کو بڑا گہرا علم دیا ہے جس سے پورا عالم فیض یاب ہورہا ہے۔ بہت آسان کر دیا ہے آپ نے الحاد کو جواب دینا، سائنس کی روشنی میں بھی اور عقل کی روشنی میں بھی۔ میں آپ سے مل نہیں سکتا اس لیے خیال آیا کہ خط کے ذریعے اپنے دل کی بات آپ تک پہنچادوں۔ میں نے اکثر لوگوں کو ایک غلطی کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ جب وہ کسی کو پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں تو اس سے متاثر ہو کر صرف اس کے استدلال کی، اس کے انداز بیان کی تعریف کرتے ہیں، پھر اس کو بھول جاتے ہیں، اس سے جڑتے نہیں۔ میں نے آپ کی کتابوں کو پڑھتے وقت اس سے بندھنے کی کوشش کی ہے۔

نیک انسان اللہ کی نعمت ہیں، آپ بھی اللہ کی نعمت ہیں۔ آپ بڑھاپے کو پہنچ گئے ہیں۔ اللہ کے پیغام کی دعوت آپ اپنے لرزتے ہونٹوں سے ہم تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ سب محنت آپ کیوں کررہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے آپ کو اپنے علم وحکمت سے نوازا ہے، آپ اللہ کی تعریف کرنا چاہتے ہیں، آپ انسانوں کو اللہ تک پہنچانا چاہتے ہیں، آپ اللہ کی پہچان کرانا چاہتے ہیں۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اللہ کی تعریف، شکر، معرفت حاصل کرنے اور انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے میں خرچ کردی۔

میں سارے انسانوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپ کی والدہ کی لیے دعا کرتا ہوں کہ بڑی سنجیدگی سے انھوں نے آپ کی پرورش کی۔ آپ کے استاذوں کے لیے بھی اور ان سب لوگوں کے لیے بھی جنھوں نے آپ کا ہاتھ بٹایا۔ اللہ تعالی آپ کے والد، والدہ، آپ کی ٹیم کا بڑی خوشی کے ساتھ استقبال کریں گے اور اپنے پڑوس میں بسائیں گے۔ (عبد الصمد خان، امروہہ)

# کچھ یادیں

## مولانا فرہاد احمد، نئی دہلی

تقریباً 2014 کے نصف ثانی سے مجھے مولانا وحید الدین خاں صاحب (1925-2021) کی بطورِ معاون خدمت کرنے کا موقع ملا۔ مولانا کے آخری ایام میں آٹھ سے دس گھنٹے بھی میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ مولانا سے میری سب سے پہلی ملاقات سی پی ایس علما ٹیم کے ذریعے غالباً 2012 میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں مولانا نے میرے بارے میں کہا تھا کہ یہ آدمی فرقان کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے:

This man doesn't know the art of differentiation.

اس وقت سے میں برابر اس صلاحیت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ مولانا سے بڑی بات جو مجھے سیکھنے کو ملی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کھلے دل کے ساتھ ہر ایک سے لرننگ کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی زندگی کا فارمولا تھا، جس پر وہ مکمل طور پر عمل کرتے تھے— سمپل لِونگ، ہائی تھنکنگ۔ اس لیے اگر کوئی مولانا کے پاس آتا تھا تو وہ ان سے پوچھتے تھے کہ ”کوئی آئٹم بتائیے۔“ یعنی لرننگ کی کوئی بات۔ میں نے کئی مرتبہ مضمون لکھتے وقت مولانا کی رائے کے خلاف اپنی رائے دی، وہ ان کو معقول لگی تو اپنی رائے کو ترک کر دیا، اور میری رائے کو اختیار کیا۔ یہ معاملہ صرف میرا نہیں ہے، ہر ایک کے ساتھ مولانا کا یہی طریقہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنے خلاف تنقید کو معتدل انداز میں سنتے تھے۔ کسی کی تنقید سے وہ غصہ نہیں ہوتے تھے۔ اگر معقول تنقید ہوتی تو علمی رسپانس دیتے، ورنہ خاموش ہو جاتے، اور اس کے لیے دعا کرتے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ خدا میں جینے والے انسان تھے۔ خدا کی معرفت، گویا، ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ میرا مشاہدہ یہ تھا کہ وہ ہر ناخوشگوار واقعے میں ایک خوشگوار پہلو تلاش کر کے شکر میں جیتے تھے۔

ایک مرتبہ میں عمری ٹیم کے ساتھ مولانا کے پاس گیا۔ اس وقت وہ ایک چھوٹی سی پتی (leaf) اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے، جو درخت سے ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہا: آئیے، یہ پتی

دیکھیے۔ میں نے اس کے ذریعے ساری کائنات اور اس کے خالق کو ڈسکور کیا ہے۔ اس کو آپ سادہ طور پر ایک پتی مت سمجھیے۔ ایک پتی بنانے کے لیے یہ پوری کائنات بطور فیکٹری کام کررہی ہے۔ مثلاً سورج، گریویٹی، وغیرہ کا انتظام۔ تب جا کر یہ پتی تیار ہوتی ہے۔ اس میں اپنے مقصد کے اعتبار سے کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کا ڈیزائن پرفیکٹ ہے۔ یہ انسانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے پیدا کی گئی ہے، اس کو آسمان وزمین سے فوڈ حاصل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ پتی ایک منصوبہ ساز خالق کا تعارف کرواتی ہے۔ میں آج صبح سے اس پتی کو ہاتھ میں لے کر غور وفکر کررہا ہوں، اور معرفت کا فوڈ حاصل کررہا ہوں۔

مولانا وحیدالدین خاں صاحب کے پاس جو کچھ میں نے سیکھا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ان الفاظ کو استعمال نہیں کرتے تھے، جو اعلیٰ ذوق (اخلاق) کے خلاف ہو۔ ڈکٹیشن کے درمیان اگر میں کوئی ایسا لفظ بولتا جو نامناسب ہوتو وہ اس کو رد کردیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک جملہ آیا جس میں غالباً ''ولدالزنا'' کا لفظ بھی لکھا جاسکتا تھا۔ میری زبان سے یہی لفظ نکلا، انھوں نے کہا، جملے کے اعتبار سے یہ لفظ ٹھیک ہے، مگر یہ اعلیٰ ذوق کے خلاف ہے۔ ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا۔ اسی طرح اپنی تحریروں میں وہ ایک بات کا خاص خیال رکھتے تھے، یعنی وضوح (clarity)۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو ڈی کنڈیشنڈ مائنڈ کے ساتھ دیکھنے کا مزاج میں نے ان سے سیکھا ہے۔ میں مولانا کو ہر دن مختلف آیات اور احادیث کی تفسیر اور شروحات سنایا کرتا تھا، مگر مولانا اس کو سن کر سوچتے تھے، اگر بات واضح ہوتو لیتے تھے، ورنہ نہیں۔ دلائل کی بنیاد پر وہ باتوں کو لیا کرتے تھے، شخصیات کی بنیاد پر نہیں۔ دوسرے الفاظ میں، وہ چیزوں کو دلائل کی بنیاد پر لینے یا نہ لینے کا فیصلہ کرتے تھے، کہنے والے کی بنیاد پر نہیں۔

وہ ہر ایک سے خیرخواہی کا معاملہ کرتے تھے۔ کوئی مولانا پر تنقید کررہا ہو، تب بھی وہ افنڈ (offened) نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی ان کے پاس رہنمائی کے لیے آتا تو جی جان لگا کر اس کی رہنمائی کرتے۔ مثلاً ایک واقعہ یہ ہے کہ سی پی ایس سے وابستہ علماء کی ٹیم (جس کو مولانا عمری ٹیم کہا کرتے تھے) مولانا کے پاس استفادہ کی غرض سے آیا کرتی تھی۔ اس ٹیم میں ایک صاحب کا نام عنایت اللہ عمری (بنگلور) ہے۔ نام کی نسبت سے مولانا نے عنایت اللہ عمری صاحب کو مخاطب کرتے

ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا کہ علامہ عنایت اللہ مشرقی مرحوم آکسفورڈ یونیورسٹی سے تحصیل علم کے بعد ہندستان آگئے۔ آکسفورڈ میں ان کے استاد مشہور سائنس داں سر جیمز جینز بھی تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد انھیں کسی غرض سے آکسفورڈ (برطانیہ) جانا ہوا۔ وہاں وہ اپنے استاد سر جیمز جینز سے ملاقات کے لیے گئے۔ سر جیمز جینز نے ان سے پوچھا کہ گھر پر کیا کرتے ہو، انھوں نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دن کو کچھ کام کر لیتے ہیں، اور شام کو فیملی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ اس میں ان کی اسکالرلی مصروفیات کا کچھ خاص ذکر نہ تھا۔ اس پر سر جیمز جینز نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

Inayatullah, live the life of a scholar.

عنایت اللہ! ایک عالم کی زندگی گزارو۔ مولانا نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ دیکھیے! آپ ایک عالم (scholar) کی حیثیت سے یہاں استفادہ کرنے آتے ہیں۔ تو آپ کو گھر جا کر بھی ایک عالم کی زندگی گزارنی چاہیے۔

اسی طرح ایک خاتون کا واقعہ ہے۔ وہ گھریلو طور پر کافی پریشان تھی۔ وہ مولانا کے پاس آئی۔ اس نے اپنے تعارف میں یہ کہا کہ آپ کے فلاں سی پی ایس ممبر جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی (نئی دہلی) میں میرے کلاس میٹ تھے۔ مولانا نے اس سے گفتگو کی، اور کچھ مشورہ دیا۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ بعد میں مولانا کو اس کے تعلق سے کچھ اہم رہنمائی یاد آئی تو اس خاتون کو فون کرنا چاہا، مگر خاتون نے فون نمبر نہیں دیا تھا، تو اس کے کلاس میٹ کو فون کر کے پوچھا۔ کلاس میٹ نے بتایا کہ یہ بہت پہلے کی بات ہے، مجھے یاد نہیں ہے، میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ مولانا نے تاکید کی کہ آپ معلوم کر کے ضرور بتائیے۔ مذکورہ کلاس میٹ نے خاتون کا نمبر معلوم کیا، پھر مولانا نے اس سے بات کر کے اس کی مزید رہنمائی کی۔

مولانا کے پاس آنے والے ہر فرد کے ساتھ مولانا کا یہی معاملہ میں نے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مولانا دیگر اکابر ملت کی طرح صرف ''تبرک'' کے لیے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس سے وقت ضائع ہوتا ہے، اگر کچھ سیکھنا ہے یا خدا کی معرفت حاصل کرنی ہے تو مولانا ان سے ملنا بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔

تنقید کے معاملے میں بھی مولانا کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی پر ذاتی اعتبار سے کوئی منفی بات نہیں کہتے تھے، اس کو وہ ''تعییب'' کہا کرتے تھے۔ اس کے برعکس، وہ اس کے علمی یا عملی غلطی کو واضح کرتے

تھے، جس کو تنقید کہتے ہیں۔ مولانا کے الفاظ میں، ''تنقید دراصل علمی تجزیہ (scientific analysis) کا دوسرا نام ہے۔ تنقید حقیقۃً وہی ہے جو علمی تجزیہ کے اسلوب میں کی جائے۔ جو تنقید علمی تجزیہ سے خالی ہو، وہ بلا شبہ عیب جوئی اور الزام تراشی کے ہم معنیٰ ہے۔ اِس قسم کی تنقید علمی اعتبار سے بے بنیاد ہے، اور شرعی اعتبار سے بلاشبہ ایسی تنقید ایک سنگین گناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔'' (الرسالہ، مارچ 2016)۔ تنقید وہی چیز ہے، جس کو قرآن وحدیث میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کہا گیا ہے۔

دینی معاملے میں ایک قابلِ ذکر بات جو مولانا کے پاس دیکھنے کو ملی وہ اجتہاد کا معاملہ تھا۔ موجودہ زمانے میں جو تبدیلی آئی، اور اس بنا پر جس جرأت کے ساتھ اجتہادی عمل کی ضرورت تھی، اس میں دوسرے علماء ناکام رہے۔ اس کا ریزن شاید ان کا وہ خودساختہ مقدس ماحول تھا، جس سے باہر نکل کر وہ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر مولانا نے خودساختہ تقدس کے اس ماحول سے اوپر اٹھ کر سوچا، اور انتہائی پریکٹکل اجتہادی حل پیش کیا۔ اس کو مولانا کی کتاب، فکرِ اسلامی، اجتہادی مسائل، اظہار دین وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مولانا کا یہ اجتہادی عمل، میرے مطالعے کے مطابق، کوئی نیا عمل نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اسلام عرب سے باہر نکلا تو مسلمانوں کو نئے حالات پیش آئے۔ اس وقت صحابہ کرام نے حالات کی تبدیلی کو سمجھا اور اجتہاد کا عمل اختیار کیا تھا۔ مثلاً اصحابِ رسول حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود وغیرہ۔ پھر ان کے بعد کے فقہائے اسلام نے منظم طور پر اس کام کا آگے بڑھایا۔ مثلاً امام ابوحنیفہ اور امام مالک، وغیرہ۔ اس کی تفصیل ابن القیم کی معروف کتاب اعلام الموقعین میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کا یہ اجتہادی عمل کوئی آخری عمل نہیں تھا، جس کے بعد کوئی دوسرا اجتہاد نہ کرسکے، بلکہ وہ اجتہادی پراسس کے لیے نقشِ اول کی حیثیت رکھتا تھا۔ مولانا نے تبدیلی حالات کو سمجھ کر جو کام کیا، وہ بھی اسی اجتہادی پراسس کا حصہ ہے۔

عام طور پر لوگ مولانا کو عقلیت پسند سمجھتے ہیں۔ مگر ایک عالم کی حیثیت سے میرا ذاتی تجربہ اس کے برعکس ہے، وہ قرآن وسنت کو پورے طور پر مانتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ عمری ٹیم مولانا کے پاس استفادہ کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ مولانا نے فیصلہ کن انداز میں ان سے کہہ دیا کہ اب آپ لوگ یہاں مت آئیے گا۔ ٹیم کے ایک ممبر فیاض الدین عمری صاحب نے مولانا کو ایک حدیث سنائی جس میں ہے کہ تعلیم کے لیے آنے والوں کو نہ روکو، ان کو سکھاؤ (سَيَأْتِيكُمْ أَقْوَامٌ يَطْلُبُونَ الْعِلْمَ،

فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمْ فَقُولُوا لَهُمْ مَرْحَبًا مَرْحَبًا بِوَصِيَّةِ رَسُولِ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَاقْنُوهُمْ) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 247۔ یہ حدیث سن کر مولانا نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ میں نے کوئی بات کہی جس میں حضرت ابوبکر صدیق کے لیے حضرت عمر کے مقابلے میں کمتری کا پہلو نکلتا تھا۔ انھوں نے فوراً میری بات رد کردی، اور روتے ہوئے سختی سے کہا کہ آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ جو رسول اللہ کا ثانی اثنین ہو، اس کے بارے میں ایسا کہیں۔

میں ہر دن مولانا کے پاس دن کو ساڑھے دس بجے آتا تھا۔ جب میں پہنچتا تھا تو مولانا سب سے پہلے یہ کہتے تھے کہ فلاں آیت کی تفسیر نکالیے، یا فلاح حدیث کی شرح سنائیے۔ یعنی کسی آیت یا حدیث پر کچھ لکھوانے سے پہلے تفاسیر اور شرحیں ضرور دیکھتے تھے۔

کچھ لوگ اس بات کی تشہیر کرتے ہیں کہ مولانا نے مہدی یا مسیح ہونے دعویٰ کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ انتہائی لغو قسم کی الزام تراشی ہے۔ دعوی کرنا تو دور کی بات ہے، میں نے مولانا کی زبان سے کئی مرتبہ یہ سنا ہے کہ ایسا دعویٰ کوئی پاگل انسان ہی کرسکتا ہے، کوئی سمجھ دار انسان ایسا نہیں کرسکتا۔ اس قسم کے دعویٰ کو وہ بالکل لغو خیال کرتے تھے، اور میں خود ان کے پاس تقریباً چھ سال تک رہ چکا ہوں۔ میں نے کبھی کوئی ایسا دعویٰ ان کے منہ سے نہیں سنا۔ خدا کی معرفت میں جینا اور تمام انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں چاہتے تھے۔

مولانا کی معاونت کا موقع مجھے اس وقت ملا جب وہ جسمانی طور سے کمزور ہو گئے تھے۔ مگر اللہ سے محبت اور دین کے تعلق سے ان کی محنت قابل رشک تھی۔ رات ہو یا دن ہر وقت اسی تعلق سے تدبرو تفکر کرنا ان کا طریقہ تھا۔ غلطی خواہ کسی کی ہو، وہ پہلے معافی مانگ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے بھی معافی مانگی تھی حالانکہ معاملہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اپنے معاون کا بھی مولانا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس تعلق سے ان کی زندگی کا فارمولا تھا، اپنی ذات میں آئڈیل رہنا، لیکن دوسروں کے معاملے میں پریگمیٹک رہنا۔ یعنی اپنے آپ کو پوری طرح اصول کا پابند رکھنا، لیکن دوسروں کے معاملے میں یہ دیکھنا کہ عملاً وہ کیا کرسکتے ہیں۔

اللہ ہم سب کو یہ توفیق دے کہ ہم لوگ مولانا کے مشن کو آگے بڑھائیں، آمین۔

# مولانا وحیدالدین خاں

ڈاکٹر ذاکر فاز، سینئر کے اے ایس افسر، راجوری

وحیدالدین خاں (1921-1925) عالم اسلام کے معروف مفکر، مصنف، مقرر، مفکر، عالم دین، داعی اور ماہ نامہ الرسالہ کے مدیر تھے۔ خدا کے وجود کو منطقی انداز میں ثابت کرنے کے قائل تھے۔ ان کی بیشتر کتابوں میں مذہب کا مقدمہ عقلی بنیادوں پر بیان کیا گیا ہے۔ ان کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مغربی سائنس دانوں اور فلسفیوں کی کتابیں باریک بینی سے پرکھی تھیں۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ اکیسویں صدی کا ذہن پرانی اور دقیانوسی باتوں سے مطمئن نہیں ہوگا، اسی لیے لکھتے وقت انھوں نے جدید سائنسی معلومات کی مدد سے خدا کے وجود کے حق میں دلائل پیش کیے۔ اسی وجہ سے مولانا کی شخصیت کا یہ پہلو منفرد ہے اور کوئی عالم دین اس انداز میں دین اور دنیا کی تعبیر پیش نہیں کرسکا۔

خان صاحب، پانچ زبانیں جانتے تھے۔ ان زبانوں میں لکھتے اور بیان بھی کرتے تھے۔ دانشور طبقہ میں امن پسند مانے جاتے رہے ہیں۔ اسلام کے متعلق غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کرنا ان کی تحریر کا مقصد رہا ہے۔ منطق پہ انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کی کتاب ''مذہب اور سائنس'' کا پہلا باب 'طریق استدلال کا مسئلہ' اس ضمن میں ایک لاجواب تحریر ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی بھی چیز کو کیسے مختلف طریقوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور بعض اوقات ہم ایسی چیزوں کا وجود بھی ثابت کرسکتے ہیں جن کے بارے میں براہِ راست ثبوت موجود نہیں ہوتا۔

وہ ایک بزرگ رہنما کی طرح انسانوں کو جینے کا ڈھنگ سکھاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی کتابیں رازِ حیات، کتاب زندگی، اسباق تاریخ وغیرہ نہایت ہی اہم کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کا انداز تحریر بے حد دلچسپ ہے۔ دنیا جہان کے واقعات مولانا نے ان میں جمع کردیے ہیں۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''الرسالہ (ماہ نامہ الرسالہ 1967ء) کے اجراء کے بعد سے جو کام میں کررہا ہوں، اس کا ایک

خاص پہلو یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو یہ سبق دے رہا ہوں کہ وہ منفی سوچ سے اوپر اٹھیں اور مثبت سوچ کا طریقہ اختیار کریں‘‘۔

مولانا موصوف کی علمی اور دینی خدمات کا دائرہ کئی دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ خاصی تعداد میں ایسی مستند کتابیں تحریر فرما چکے ہیں جن کا حوالہ سند کے طور پر دیا جاتا ہے۔فکری اور دعوتی موضوعات پر مختلف زبانوں میں مولانا صاحب کی تصنیفات موجود ہیں۔ ان میں چند اہم اور مشہور کتابیں یہ ہیں — تعبیر کی غلطی، مذہب اور جدید چیلنج، الاسلام، مذہب اور سائنس، پیغمبر انقلاب، احیاء اسلام، عقلیاتِ اسلام، قرآن کا مطلوب انسان، دین کی سیاسی تعبیر، سوشلزم اور اسلام، ظہورِ اسلام، اسلامی زندگی، اسلام اور عصر حاضر، تفسیر تذکیر القرآن، عظمتِ قرآن، حقیقتِ حج، اللہ اکبر، زلزلہ قیامت، خاتونِ اسلام، رازِ حیات، تجدیدِ دین، اسلام دورِ جدید کا خالق، دینِ کامل، راہِ عمل، ہندستانی مسلمان، کتابِ زندگی، شتمِ رسول کا مسئلہ، دعوتِ اسلام، دعوتِ حق، سفرنامہ اسپین و فلسطین، فکر اسلام، مطالعہ سیرت، مطالعہ قرآن، دین و شریعت، مسائل اجتہاد، مطالعہ حدیث، کشمیر میں امن، عورت: معمارِ انسانیت، امنِ عالم، دعوت الی اللہ، حکمتِ اسلام، کتابِ معرفت، اسلام اور خدمتِ خلق، اظہارِ دین، وغیرہ۔

مولانا کی کچھ تحریریں اور نظریات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اہلِ علم ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بہت سی باتوں میں جمہور علماء اسلام سے الگ رائے رکھتے ہیں۔ جیسے اسوۂ کاملہ، جہاد، دجال، مہدی، فضیلت انبیاء کا مفہوم، ظلم کو برداشت کرنا اور جوابی کارروائی سے گریز کی تلقین، تقلید شخصی، وغیرہ۔

مولانا کی زندگی کا ایک پہلو سیاسی مدبر کا بھی تھا۔ تقسیم ہند کے وہ خلاف تھے۔ اقبال اور جناح کے نظریات کے بھی ناقد تھے۔ ہندستان کے مسلمانوں کی غربت کا ذمہ دار خود انھی کو سمجھتے تھے۔ مولانا نے ’تعبیر کی غلطی‘ میں مولانا مودودی کے سیاسی اسلام کے مقدمے کو بہت مدلل اور علمی انداز میں رد کیا ہے۔ جاوید احمد غامدی جیسے علماء کرام نے مولانا کے اس کارنامے کی تحسین کی ہے اور اسے اسلامی روایت میں ایک سنگ میل قرار دیا ہے۔ اس طرح فقہی مباحث میں انھوں نے جس خوبصورتی سے عصری و زمانی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے یہ انہی کا شعوری مرتبہ، حوصلہ وجگر تھا۔ ہندستان میں یکبارگی تین طلاقوں کے مسئلہ پر لوک سبھا سے لے کر قانونی و عوامی کٹہروں تک جو بھی مباحثے ہوئے، مولانا نے کمال فراست اور خوبصورتی سے روایت کو پورے استدلال

کے ساتھ نہ صرف راہِ اعتدال دکھائی بلکہ حقوقِ نسواں کی پاسداری بھی کی۔

مولانا صاحب کی زندگی کا اصل مشن اسلام کے پرامن دعوتی پیغام کی اشاعت رہا۔ دعوت الی اللہ کا مطلب ہے اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانا۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد اب یہ ذمہ داری امتِ محمدی پر عائد ہوتی ہے۔ مولانا وحید الدین خاں خود لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کا مشن دعوت الی اللہ ہے۔ یہی عمل اس کی دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔ اسی عمل کو انجام دینے سے وہ اس کا مستحق قرار پاتا ہے کہ خدا کے یہاں امت محمدی کی حیثیت سے اٹھایا جائے اور یہی وہ عمل ہے جو دنیا میں اس کی حفاظت و کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد مسلمان اللہ کی نظر میں اسی طرح بے حقیقت ہو جائیں گے جس طرح یہود اپنی داعیانہ حیثیت کو چھوڑنے کے بعد اللہ کی نظر میں بے حقیقت ہو گئے''۔ (ماہ نامہ الرسالہ، جولائی 1997، ص 53)

ملکی اور غیر ملکی سطح پر اسلامی دعوت کو عام کرنے کے لیے اور دعوت الی اللہ کے کام کو منظم طور پر کرنے کے لیے مولانا نے 1976ء میں نئی دہلی میں اسلامی مرکز قائم کیا۔ اور اسلامی مرکز کے ترجمان کے طور پر انھوں نے اکتوبر 1976ء میں ماہ نامہ الرسالہ جاری کیا۔ مولانا محترم نے غیر مسلموں کے تعلیم یافتہ طبقہ تک اسلام کے پُرامن دعوتی پیغام کو پہنچانے کے لیے ایک عظیم الشان دعوتی ادارہ سی پی ایس انٹرنیشنل نئی دہلی میں جنوری 2010ء میں قائم کیا۔ جیسا کہ اِس کے نام سے ظاہر ہے، اِس کا مقصد امن اور رُوحانیت کو فروغ دینا ہے۔ یہ ایک غیر سیاسی تنظیم ہے۔ اس کا اصل نشانہ فکری انقلاب لانا اور انسان کو حقیقی انسان بنانا ہے۔

فکری اور دعوتی خدمات کے اعتراف میں مولانا کو قومی اور بین اقوامی سطح پر متعدد ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ عام طور پر ان کو ایمبسڈر آف پیس کہا جاتا ہے۔ ڈیمورگس بین الاقوامی ایوارڈ سابق سوویت یونین کے صدر گورباچیف کے ہاتھوں دیا گیا۔ پدم بھوشن، قومی یکجہتی اعزاز، کمیونل ہارمنی اعزاز، قومی اتحاد اعزاز، ارونا آصف علی (بھائی چارگی ایوارڈ)۔ اس کے علاوہ بھی وہ کئی انٹرنیشنل ایوارڈز سے سرفراز ہو چکے تھے۔ رواں برس 2021ء میں حکومت ہند کی جانب سے امن و آشتی کا پیغام اور روحانیت کو فروغ دینے کے لیے پدم وبھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اسلام کے پرامن دعوتی پیغام کو عام کرنے کے لیے مولانا نے تقریر وتحریر کے علاوہ ہند وبیرونِ ہند کے متعدد اسفار کیے، جس کا سلسلہ جاری ہے۔ انھوں نے پاکستان، لیبیا، لندن، سعودی عرب، مالدیپ، باربیڈوز، امریکا، عرب امارات، ملیشیا، مراکو، بما کو، رومانیہ، سوئزرلینڈ، افغانستان، یمن، اردن، سینگال، روم، مالٹا، قاہرہ، کولمبو، اٹلی، اسپین، فلسطین، فرانس، عمان، بنگلہ دیش، سیول، قبرص، اسرائیل، پولینڈ، قطر اور ترکی وغیرہ کا سفر کیا۔ اوران اسفار کے انھوں نے سفرنامے تحریر کیے جو ماہنامہ الرسالہ کے صفحات میں شائع ہوئے۔

مولانا اپنے نظریات کی بنیاد پر کئی بار تنازعات کا بھی شکار رہے۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ مخالفین کو علمی دلائل کے ساتھ قائل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے پوری زندگی خاموشی کے ساتھ اپنے قلم کے سفر کو جاری رکھا اور دینِ اسلام کے سچے داعی بنے رہے۔ وہ ایک اعتدال پسند، متوازن اور تعمیرانہ رخ اختیار کرتے تھے۔ اپنی سادگی اور بیباکی کی وجہ سے مولانا ہر طبقہ میں مقبول رہے ہیں۔ مولانا اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

’’میری پوری زندگی پڑھنے، سوچنے اور مشاہدہ کرنے میں گزری ہے۔ شاید فطرت کا بھی اور انسانی تاریخ کا بھی۔ مجھے کوئی شخص تفکیری حیوان کہہ سکتا ہے۔ میری تفکیری زندگی کا ایک حصہ ہے جو الرسالہ یا کتب میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نسبتاً غیر منظم ڈائریوں کے صفحات پر ہے‘‘۔ (ماہ نامہ الرسالہ)

وزیر اعظم نریندر مودی نے ان کی وفات پر ٹوئٹر پر تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا:

’’انھیں علم الٰہیات اور روحانیت کے معاملات پر بصیرت سے بھرپور علم کے لیے یاد کیا جائے گا۔ مولانا سماج کی خدمت اور معاشرے کو بااختیار بنانے کے قائل تھے۔ ان کے کنبہ اور انگنت خیر خواہوں سے تعزیت‘‘۔

Twitter.com/narendramodi, 22 April, 2021

اسلامیات اور مغربیات دونوں قسم کے علوم سے بخوبی واقفیت حاصل کرنے کے بعد مولانا موصوف اِس نتیجہ پر پہنچے کہ اِس دور میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ جدید سائنسی دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جائے اور عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے اور پھر وہ

اِس مہم میں لگ گئے۔ مولانا موصوف کے مطالعہ کا خاص موضوع اسلام اور دورِ جدید ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی اسلام کی ترویج واشاعت، تبلیغ وتفہیم اوراس کی وضاحت میں صرف کردی۔ وہ پائے کے عالم دین، مفکر، ادیب، انشا پرداز تھے اور مختلف زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ مسلمانوں میں ان کا کام اور مقام سرسید، سیدعلی طنطاوی اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین جیسے بڑے مفکروں سے کم نہیں تھا۔

عالم اسلام کے معروف مفکر، صحافی، ادیب، داعی اور سینکڑوں کتابوں کے مصنف مولانا وحید الدین خاں اب اس دنیا سے چل بسے۔ ان کی آخری دریافت قابلِ ملاحظہ ہے: ''اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انسان دنیا کا سفر اس طرح کرے کہ اس کے دل میں کسی کے خلاف ذرہ برابر بھی کوئی منفی خیال نہ ہو۔ اس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں کہ انسان دنیا سے اس طرح جائے کہ اس کا ذہن پوری طرح مثبت ہو۔ اس میں سب سے بڑی اچھائی مثبت فکر ہے اور سب سے بڑی برائی منفی سوچ ہے۔ یہی میری آخری دریافت ہے''۔

---

ڈاکٹر محمد عقیل صاحب نے 15 سال قبل مولانا وحیدالدین خان صاحب کا مجھ سے تعارف کرایا تھا، فجزاک اللہُ خیرا۔ اس کے بعد میں اپنی طرف سے کوشش کرکے جہاں تک ہوسکا مستفید ہوتا رہا ہوں۔ مولانا وحیدالدین خاں صاحب دین کے خدمت کا ایک باب تھا جو اختتام کو پہنچا۔ مگر اُن کا کلام اوران کی تصنیفات وہ روشنی ہے جوانھوں نے مختلف ذرائع سے موجودہ معاشرے کے لیے اور مستقبل کے نوجوانوں کے لیے اپنی وراثت میں چھوڑی ہے۔ یہ ہمیشہ رہنمائے ہدایت رہے گی، اور معاشرہ مستفید ہوتا رہے گا اور اُن کے مشن کو جاری رکھے گا۔ ان شاء اللہ۔ اللہ تعالی ان کے کارِخیر کو جاری اور ساری رکھیں اور معاشرہ مستفید ہوتا رہے۔ آمین (عبدالرشید خان)

---

انھوں نے قرآن کو حقیقی طور پر پڑھنا سکھایا۔ اب اللہ تعالیٰ ہمیں اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (سادنہ زیب، اسلام آباد)

# امن اور مولانا وحیدالدین خان

ادار یہ، روزنامہ سالار بنگلور، 23اپریل، 2021

امن ایک نہایت مطلوب چیز ہے اور تشدد ایک قابل نفرت چیز۔ ساری دنیا امن سے محبت کرتی ہے اور تشدد کو برا جانتی ہے۔ کوئی مفکر اگر اسے اپنا مشن بنالے اور اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردے تو یقینی طور پر اسے جدید دور کی سب سے عظیم شخصیت قرار دیا جائے گا۔ اپنے ہم عصروں سے زبردست علمی اختلافات کے باوجود ہر حال میں اسلام کے امن و امان کے مشن کو عام کرنے میں ہندوستان کی عہد ساز شخصیت مولانا وحیدالدین خان کا نام سرفہرست ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس میدان میں وہ اکیلے شہسوار تھے، جو ہندوستان جیسے ملک میں عدم تشدد کو کامیابی کے حصول کا واحد طریقہ سمجھتے تھے۔ وہ دعوتی اسلوب میں اپنی بات لکھنے اور کہنے کا وہبی سلیقہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے علم وقلم کے ذریعے نئی نسل کے سامنے اسلام کا تعارف جس خوبصورت انداز سے کرایا اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کے قریب کرنے کا جو مثبت رویہ اختیار کیا، اس نے اپنی شناخت قائم کی اور ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا، ان کی فکر کے کسی گوشے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ دور حاضر کے عظیم ترین دانشوروں میں شمار ہوتے تھے، ان کی مختصر تحریریں قاری کو بہر طور متاثر کرتی تھیں۔ انھوں نے بہت منظم طریقہ پر اپنے دعوتی مشن کو مسلسل جاری رکھا، مخالف اور تیز ہواؤں کے باوجود صبر و ضبط کے ساتھ اپنے مشن کے چراغ کو جلائے رکھنے کا ہنر کوئی مولانا وحیدالدین خاں سے سیکھے ،وہ ہمیشہ سے مثبت سوچ کے حامی اور مبلغ رہے، ان سے بہت سے معاملات میں اختلاف رکھنے والے لوگ بھی ان کے علمی کمالات کے قائل رہے ہیں۔ ان کی امن سے متعلق خدمات کو بین الاقوامی سطح پر پہچان ملی تھی، انھیں جنوری 2021 میں پدم وبھوشن اور اس سے پہلے پدم بھوشن کے اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا وحیدالدین خان کو ڈیمورگس پیس انٹرنیشنل ایوارڈ، راجیو گاندھی قومی سدبھاونا ایوارڈ اور قومی شہری ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی، واشنگٹن ڈی سی کی 2009 کی 500 انتہائی با اثر مسلمان کی ایک حالیہ کتاب میں بھی ان

کا نام ’’دنیا میں اسلام کے روحانی سفیر‘‘ کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ وہ نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں میں بلکہ غیر مسلموں میں بھی مقبول رہے ہیں۔ مولانا وحید الدین خان صاحب اس دنیا سے چہارشنبہ کی شب رخصت ہو گئے، جو ملت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے۔ مولانا مرحوم اپنی سادگی، منکسر المزاجی اور ملنساری کی بدولت ہر طبقہ کے لوگوں میں مقبول تھے۔ مولانا کو تقریر وتحریر دونوں میں ملکہ حاصل تھا۔ سادگی آپ کا خاص وصف تھا۔ سر پر عمامہ، ڈھیلے ڈھالے سفید رنگ کے لباس میں ملبوس رہنے والے مولانا وحید الدین خان ایک بلند پایہ عالم دین، مقبول مفکر اور نامور صاحب قلم ہیں، انہوں نے اپنی دینی اور علمی خدمات کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ قحط الرجال کے اس دور میں صاحب علم وکمال جیسی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور عالم دین، بہترین مصنف، دانشور، اور روحانی قائد ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی پر کشش شخصیت کے مالک تھے، اس سے بڑھ کر الخلق کلھم عیال اللہ کے پاس دار تھے ان کی وفات یقیناً موت العالم موت العالم ہے۔ انہوں نے پوری زندگی احقاق حق وابطال باطل کے لیے وقف کر دی تھی، مولانا مرحوم نے اپنے انفرادی انداز سے ملک وقوم کی جو ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ بہت معقول انداز میں اپنا مدعا پیش کر کے قاری کو اسیر بنا لیتے تھے، علم جدید کا چیلنج جیسی شاہ کار تصنیف خان صاحب کے فکر وفن اور معروضیت کو سمجھنے کے لیے وافی شافی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا وحید الدین خاں کا انتقال دراصل ایک عہد کے خاتمہ کے ساتھ ملک وملت کا عظیم خسارہ ہے۔ امت مسلمہ پر واجب ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے دعوتی مشن کو آگے بڑھائے۔

---

جب جب مولانا وحید الدین خان کے قرآن کے اردو و انگلش تراجم و دیگر کتب سے استفادہ کرتے رہیں گے انہیں دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ (واصف، لاہور)

---

مولانا سے ملاقات تو نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ ہمارے دلوں میں خون کی طرح بستے رہیں گے۔ ان کی تصانیف سے اللہ سبحانہ وتعالی نے ہمیں بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ (مولانا فضل ربی، پاکستان)

# علمی روایت کا بڑا آدمی

اوریا مقبول جان، پاکستان

بھارت کے شہر اعظم گڑھ میں یکم جنوری 1925ء کو پیدا ہونے والا آفتابِ علم ''مولانا وحید الدین خان''، 21 اپریل 2021ء کو دلی میں ڈوب گیا اور میں باوجود، ارادہ، وسائل اور نیتِ شوق، بوریہ نشین علماء جیسے ملبوس زیب تن کیے اور علم کی چمک سے روشن آنکھوں والے شخص کی براہِ راست ایک جھلک دیکھنے سے بھی محروم رہا۔ آج سے تقریباً چالیس سال قبل جب مولانا وحید الدین خان کی کتاب ''رازِ حیات'' میرے ہاتھ آئی تو اس کا سحر ایسا تھا جیسے کوئی گھٹا ایک سمت سے چڑھے اور پھر پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لے، اور اس کے اندر کھڑے ہوئے ایک فرحتِ پایاں کا احساس آپ کو سرمستی کے عالم میں لے جائے۔ میں سوچتا تھا کہ کتاب کا یہ حال ہے تو صاحبِ کتاب کی صحبت کا عالم کیا ہوگا۔ میں اس سے پہلے ایک انتہائی حسین تجربے سے گزر چکا تھا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد جب میں اچھرہ میں ان کی عصر کی محفل میں پہلی دفعہ شریک ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں یک دم ان کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ چہرے سے نظریں اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا اور گفتگو کا سحر ایسا، جس کے ٹوٹنے کا خوف ہی مجھے مزید ان کی جانب متوجہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ مولانا وحید الدین خان کی ویڈیو گفتگو جب میں نے سننا شروع کی تو مجھے اپنی مجبوریوں کا احساس شدید ہوتا چلا گیا۔ میں چاہتا تھا، یہ شخص اس ٹیلی ویژن سیٹ سے باہر نکل آئے، میرے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ جائے اور میں زمین پر بیٹھ کر مبہوت ہو کر اس کی گفتگو سنوں، اس سے سوال کروں، میرے ساتھ مشتاقانِ علم کا ایک ہجوم ہو جو اسی طرح اسے سن رہا ہو، سوال کر رہا ہو۔ آج سوچتا ہوں کہ میں اگر اس کے شہر میں موجود ہوتا تو میری حالت اس طالبِ علم کی سی ہوتی جو یوں تو حسن بصری کے مدرسے کا خوشہ چیں ہوتا، لیکن چھپ کر وقت نکالتا اور معتزلہ کے امام واصل بن عطاء کی باتیں سننے چلا جاتا۔ علی گڑھ میں ڈگری کے حصول کے لیے داخل ہوتا، لیکن شام میں مولانا محمود الحسن کے دیوبند میں گزارتا اور علم کی پیاس بجھاتا۔

مولانا وحید الدین خان سے اتنی بندشوں کے باوجود بھی جو علم مجھے ملا ہے وہ اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ

میں اس کا مکمل احاطہ تک نہیں کر پاتا۔ بے شمار دفعہ ایسا ہوا کہ جدید دور کے وہ سوالات جو سائنس اور الحاد نے اسلام کے متعلق اٹھائے ہیں، ذہن سے ٹکرائے تو ایک ہی نام سامنے آتا، اور جستجو اس تک لے گئی۔۔مولانا وحید الدین۔۔ کیا خوب عنوان ہے ان کی ایک کتاب کا ''اسلام دورِ جدید کا خالق''۔ کاش ہم اسلام کے دورِ جدید کو دریافت کر سکتے۔[بشکریہ روزنامہ 92]

---

کہاں ڈھونڈے گا زمانہ اب ایسا ساقی
جو رندوں کو مئے حق کا پرستار کرتا تھا
کتنے ہی علم کے متلاشی اس کے در پر
صدا لگاتے تھے، وہ مراد کو انجام کرتا تھا
وہ شخص اس دور خود غرضی میں بھی
انساں کو انساں کا حق شناس کرتا تھا
وہ دیتا تھا انساں کو اخلاق کا شعور
پھر فکر علم کو اخلاق پر استوار کرتا تھا
وہ پیامبر تھا اس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا
وہ انساں کو خدا کا مرید کرتا تھا
وحشت و دہشت کی بے مراد وادی میں
جگنو بنتا تھا، شعورِ علم بیدار کرتا تھا
وہ الحاد کی مبہوت زدہ وادیوں میں
توحید و آگہی کی بستیاں آباد کرتا تھا
وہ دیتا تھا مسلم کو دین حق کا شعور
مشکِ قرآں سے عقیدوں کو سیراب کرتا تھا
زیدؔ اب ڈھونڈ کوئی چراغ زیبائی لے کر
وہ نہ ملے، جو امن و علم کی بات کرتا تھا
(زیدؔ ابن ریاض، پاکستان)

# مولانا وحید الدین خاں

امجد اسلام امجد، پاکستان

یہ بات تو ہم سب نے بہت دفعہ پڑھی اور سُنی ہے کہ ایک عالم کی موت پورے عالَم کی موت کی تمثیل بن جاتی ہے۔لیکن عملی طور پر اس احساس کی شدت کبھی کبھار ہی اس تاثر کو وہ رنگ دے پاتی ہے کہ آپ کو لفظ اور معانی ایک دوسرے کی ایسی بھر پور گواہی دیتے نظر آئیں، جن سے اس دعوے کی مکمل تائید ہوتی، ہو ورنہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مرحوم کی پہلی برسی سے پہلے پہلے بیشتر لوگ جانے والوں کے نام تک بھول جاتے ہیں۔ البتہ جہاں تک حال ہی میں سفرِ آخرت اختیار کرنے والے مولانا وحید الدین خان صاحب کا تعلق تو میرے خیال میں ہر اہلِ نظر اس بات کی کھل کر تائید کرے گا کہ مولانا اس وقت اسلامی دنیا بالخصوص برصغیر کے مسلمان علما میں سب سے معتبر اور توانا شخصیت تھے۔ اس عہد کے ایک اور جیّد اور بڑے عالم جاوید احمد غامدی کا اُن کے بارے میں ایک بیان آج ہی فیس بُک پر نظر سے گزرا، جس میں انھوں نے مولانا مرحوم کے علمی مقام اور مذہبی خدمات پر جس محبت اور فراخدلی سے پُر توصیف روشنی ڈالی وہ سننے کے قابل تھی۔

بلا شبہ مولانا مودودی کے بعد اپنی تصانیف کی تعداد، موضوعات اور معیار کے حوالے سے کوئی دُوسرا عالم دین ہمیں اُس رُتبے پر نظر نہیں آتا جس پر مولانا وحید الدین فائز تھے۔ جدید دور میں اسلام اور قرآن کی تفسیر اور تفہیم اور اس کے خلاف ہونے والی بین الاقوامی سازشوں کا جس مہارت، خوبی، وضاحت سے مولانا نے جواب دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

یوٹیوب کی معرفت اُن کے بہت سے وعظ، لیکچر اور گفتگوئیں سننے کا موقع ملا ہے۔لیکن آج غامدی صاحب کے احساس دلانے پر خیال آیا ہے کہ واقعی ربِ کریم نے اُن کو ایک ایسی منفرد، میٹھی، پُر اثر اور دل کو موہ لینے والی آواز عطا کی تھی کہ اُن کی آواز اپنے مطالب و معانی سے ہٹ کر بھی اپنے اندر ایک عجیب کشش رکھتی تھی کہ بہت کم مردانہ آوازیں اور وہ بھی تحت اللفظ میں اتنی خوب صورت ہوتی ہیں کہ بقول شاعر وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔ ابھی ابھی میں نے اپنی یادداشت تازہ

کرنے اور مولانا کی کچھ تصانیف کے بارے میں معلومات مرتب کرنے کی خاطر اُن کی کچھ ریکارڈنگز کو پھر سے سننے کی کوشش کر رہا تھا، یقین کیجیے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اُن کی علمیت کی داد دے یا اندازِ بیان کی یا دل میں اُترتی ہوئی اس آواز کی، جس کے ہر طرف دانش ہی دانش دامن کش ہو رہی ہوتی ہے۔

ممکن ہے اس کی وجہ بھارت میں رہتے ہوئے عوام وخواص اور پیر وجوان کے ہر طبقے سے بیک وقت رابطے کی ضرورت ہو لیکن مذہب، اخلاق، انسانی اقدار اور بعض پیچیدہ مسائل پر گفتگو کے دوران وہ عام بول چال میں انگریزی کے الفاظ ایسی کثرت لیکن ایسی خوبصورتی اور مہارت سے استعمال کرتے ہیں جو بظاہر اُن کے مولویانہ تشخص اور حلیے سے بالکل میل نہیں کھاتے۔ مگر ان کے منہ سے اس قدر اچھے لگتے ہیں کہ ابلاغ پر اُن کی گرفت اور مہارت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کس طرح Art of thinking پر بات کرتے ہوئے وہ قرآن مجید، اسلامی تعلیمات، حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کے ساتھ برٹرینڈ رسل، گاندھی جی، سچن ٹنڈولکر اور بی جے پی کے فلسفی رہنما کی مثالوں کو ایک دوسرے سے اس طرح آمیز کرتے چلے جاتے ہیں کہ مذاہب اور نظریات کا فرق اور زمان ومکان کے اُلجھے ہوئے مسائل دو اور دو چار کی طرح سمجھ میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ 1976ء میں انھوں نے ''الرسالہ'' میں ہر طرح کے مسائل سے متعلق جن عالمانہ مباحث اور مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا صرف اُن کے انتخاب پر مشتمل دو سو کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

سلمان رشدی کا معاملہ ہو یا بابری مسجد کا، صلح حدیبیہ کا پس منظر ہو یا سورۃ المدثر کی تفسیر، مخلوق کے علم کی محدودیت کی بات ہو یا خالقِ کائنات کی قدرت کی لامحدودیت، عام آدمی کے ٹوٹے پھوٹے سوال ہوں یا کسی ماہر فن کے ٹھوس استدلال ہر جگہ اور ہر موقعے پر مولانا کا میٹھا، دھیما اور عالمانہ ہوتے ہوئے عوامی لہجہ سیدھا آپ کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

حکومت ہند نے انھیں پدما وبھوشن کا اعزاز بھی دیا لیکن اُن کا اصل اعزاز دین سے متعلق فکر کو واضح کرنا ہے، سلیقے اور مہارت سے اپنی بات کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ جس کے لیے بلاشبہ وہ ہمیشہ علمائے حق کی صفِ اول میں شمار کیے جائیں گے۔ [مضمون نگار اُردو دنیا کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں، بشکریہ روزنامہ ایکسپریس]

# مولانا وحید الدین خاں: آفتابِ علم و عرفاں

افضال ریحان، پاکستان

آفتابِ علم و عرفاں، حضرت مولانا وحید الدین خاںؒ ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد دہلی سے اُس ملک عدم تشریف لے گئے ہیں جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں لوٹ سکتا۔ 21اپریل 2021، 8 رمضان المبارک بروز بدھ انڈین ٹائم کے مطابق رات پونے دس بجے کورونا کے باعث حضرت مولانا اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ مولانا سے بڑی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں لیکن یہ حسرت ہی رہی کہ دو چار ہفتے امن وسلامتی کے روحانی مرکز میں مولانا کے ساتھ گزارے جائیں کئی مرتبہ پروگرام بنا پھر رہ گیا۔

2006 میں سیفما ڈیلی گیشن کے ساتھ دہلی اور حیدرآباد دکن جانے کا موقع ملا تو دیگر سرگرمیوں کو ترک کر کے کر مولانا سے ملاقات کی تیاری کی۔ کیونکہ ناچیز کی ہند یاترا کا اصل مدعا ہی مولانا سے ملاقات تھی، اور اُنہیں اس سلسلے میں آگاہ کر رکھا تھا۔ جس وقت میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا، وہ آرام کے لیے بالائی منزل پر تشریف لے جا چکے تھے۔ اطلاع ہونے پر وہیں بلا لیا، مولانا سے یہ ملاقات زندگی کا بہترین اثاثہ ہے۔ یہ انمول لمحات کبھی بھول نہیں سکتا۔ اُن سے ملاقات کے دوران جو باتیں ہوئیں وہ اگرچہ روایتی مولویانہ اسلوب وموقف سے ہٹ کر تھیں مگر راز حیات ہی نہیں حاصل زندگی کہی جا سکتی ہیں۔ میرے لیے حضرت مولانا، سرسید ثانی کی حیثیت رکھتے تھے۔

2004 میں درویش کی پہلی کتاب اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب حریف یا حلیف؟ شائع ہوئی۔ اس کا دیباچہ لکھوانے کے لیے مسودہ حضرت مولانا کے پاس دہلی بھیجا تھا، فون پر بات ہوئی تو بولے میں نے تمام مسودہ حرف بہ حرف پڑھا ہے، اس پر دیباچے کی کتنی گنجائش ہے؟۔ عرض کی، مولانا ڈھیر ساری گنجائش ہے۔ آپ وضاحت سے لکھیے تب مولانا نے جو کچھ لکھا، وہ ان کی یادگار تحریروں میں سے ایک ہے (دیکھیے الرسالہ دسمبر 2004 بعنوان: دیباچہ، صفحہ 27-16)۔ مولانا کی تحریروں پر بات کی جائے تو وہ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، ان کی خالص الٰہیات کو ایک جانب رکھ

دیا جائے پھر بھی شعور کو جلا بخشنے والے افکار منفرد ہیں، جیسے کوئی مولانا نہیں ماہر نفسیات بول رہا ہو۔ بلاشبہ بہت سے لوگ ان سے اس بنا پر محبت کرتے ہوں گے کہ انہوں نے قرآنی تفسیر، احادیث اور بالخصوص سیرت پر بھر پور کام کیا لیکن ساتھ ہی ایسے افراد کی بھی کمی نہیں ہوگی، جو ان کی اس ساری کاوش کو غصے سے دیکھتے ہوں گے کہ انہوں نے سوچوں کے نئے دریچے کیوں وا کیے؟ اس طرح فقہی مباحث میں انہوں نے جس خوبصورتی سے عصری وزمانی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے یہ انہی کا شعوری مرتبہ، حوصلہ وجگر تھا۔ ہندوستان میں یکبارگی تین طلاقوں کے مسئلہ پر لوک سبھا سے لے کر قانونی و عوامی کٹہروں تک جو بھی مباحثے ہوئے، مولانا نے کمال فراست اور خوبصورتی سے روایت کو پورے استدلال کے ساتھ نہ صرف راہِ اعتدال دکھائی بلکہ حقوقِ نسواں کی پاسداری بھی کی۔

مذہبیت کو قائم ودائم رکھتے ہوئے آپ کیسے لبرل، سیکولر اور سوسائٹی کے لیے کارآمد انسان بن سکتے ہیں؟ اس رمز کو جس خوبصورتی سے مولانا صاحب نے کھولا ہے فی زمانہ شاید ہی کوئی دوسرا اس نوع کا کارنامہ سرانجام دے سکے۔ مولانا نے زندگی بھر منافرت و اجنبیت کی دیواریں توڑیں اور محبت واپنائیت کے پل تعمیر کئے۔ انہوں نے ہندو مسلم کے درمیان کھودی گئی گہری کھائی کو پاٹنے کی کاوش فرمائی۔ مغرب اور عالم اسلام میں موجود فکری دوئی کو مٹانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ زندگی بھر مدر ٹریسا، رسل اور ٹیگور کی مانند محبتیں بانٹتے رہے۔ درویش نے ایک مرتبہ آرٹیکل لکھا تھا دورِ حاضر کی پانچ بڑی شخصیات، مولانا ان میں سے ایک تھے۔ مسلمانوں میں ان کا کام اور مقام سرسیدؒ، سید علی طنطاوی اور ڈاکٹر طہٰ حسین جیسے بڑے مفکروں سے کم نہیں تھا۔ آج وہ گئے ہیں اور یقیناً انہوں نے جانا ہی تھا تو وہ قلبی طمانیت سے گئے ہیں اور اس قول کی مطابقت میں گئے ہیں کہ میرے سامنے کسی کی برائی نہ کروتا کہ میں دنیا سے جاؤں تو میرا دل کسی سے کھٹا نہ ہو۔ ان کی آخری دریافت قابلِ ملاحظہ ہے— اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انسان دنیا کا سفر اس طرح کرے کہ اس کے دل میں کسی کے خلاف ذرہ برابر بھی کوئی منفی خیال نہ ہو۔ اس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں کہ انسان دنیا سے اس طرح جائے کہ اس کا ذہن پوری طرح مثبت ہو۔ اس میں سب سے بڑی اچھائی مثبت فکر ہے اور سب سے بڑی برائی منفی سوچ ہے۔ یہی میری آخری دریافت ہے۔ میں مولانا کی انسان نواز فکر و سوچ کو سلام پیش کرتا ہوں۔ [بشکریہ: روزنامہ جنگ]

# عجیب شخص تھا حیران کر گیا سب کو

ڈاکٹر محمد وقار عالم، سی پی ایس (نیویارک)، امریکا

بیسویں اور اکیسویں صدی میں جب کہ سائنس اور تمدن اپنے عروج پر ہے، روایتی مدرسے کا ایک طالب علم صدیوں پیچھے جا کر خدا کو تلاش کرتا ہے اور موجودہ صدی کے طالبِ علم کے سامنے خدا کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ اس طالب علم کا نام مولانا وحید الدین خان ہے۔ آج خدا کا متلاشی صدیوں پیچھے جا کر اگر خدا کو پا بھی لے، تو اسے اپنے دور میں فٹ نہیں کر پاتا۔

دو یا تین جوڑے کپڑے، ایک عمامہ اور ایک جوتا پہن کر دنیا بھر کا سفر کیا۔ فرش پر سونے والا اور سادہ کھانا کھانے والا خلیج کے ایک شاہ کا مہمان ہونے پر شاہی بستر، کھانا اور آسائشیں برداشت نہ کر سکا اور ان نعمتوں کو چھوڑ کر گھر واپس چلا گیا۔ یہ رویہ ایک عام انسان کا نہیں ہو سکتا، یہ وہی انسان کرے گا جسے اپنا خدا مل چکا ہو۔ نیویارک میں میرے گھر میں قیام کے دوران سختی سے ہدایت کی تھی کہ جو عام دنوں میں پکتا ہے وہی پکے گا۔ یہ فقیر اور اللہ کا دوست اپنے پیچھے علم کا ایک ایسا خزانہ چھوڑ گیا جو ہر متلاشی دین اور خدا کی پیاس بجھاتا رہے گا۔

قدیم علم اور جدید فکر کو ایک ایسے سنگم پہ لا کھڑا کیا کہ آج کے طالبِ علم کو ہر سوال کا جواب مل گیا۔ مولانا محترم بیسوی صدی سے اکیسویں صدی میں جدید علم سے مسلح ہو کر داخل ہوئے تھے، جس کی گواہ اُن کی کتابیں ہیں۔ آپ نے جدید علوم کو کھنگال ڈالا اور بجائے منفی خیالات کے آپ نے اپنے کھلے ذہن سے اسے دین کے قریب پایا اور دنیا کو سمجھایا کہ سائنس خدا کو تلاش کرنے اور اسے پانے میں مدد دیتی ہے۔ درست سوچ اور سچ کو سچ سمجھ کر اس پر ڈٹ جانے والے اس شخص نے زمانے سے سمجھوتے کے بجائے اسے درست سمت میں چلنے کا طریقہ اور حوصلہ دیا، چاہے وہ اسلام کی سیاسی تعبیر کا معاملہ ہو یا بابری مسجد کا مسئلہ، مولانا نہ صرف اپنے اصولی موقف پر کھڑے رہے بلکہ عوام کے لیے انتہائی مدلل انداز میں اپنے موقف کو تحریری شکل میں پیش بھی کیا، مولانا محترم کے بہت سے عظیم کاموں میں ایک بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے غیر مسلم

معاشرے میں رہنے والے دعوتی اذہان کو ایک مدلل اور درست سمت فراہم کی۔

مولانا کا ایک منفرد انداز تھا کہ وہ عام واقعات سے سبق حاصل کرتے اور دوسروں تک اس طرح پہنچاتے کہ بڑے سے بڑے مسئلے کا حل آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔آپ یک صفحی رائٹر تھے جو ہر مسئلے کو ایک صفحے پر آسانی سے بیان کرتے اور اسی میں اس کا حل بھی موجود ہوتا تھا۔ماہانہ الرسالہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔آپ تقویٰ پرہیز گاری اور سادگی کا مجموعہ تھے۔دینی علم کی دنیا میں آپ کی تحریریں نہ صرف جامع مدلل اور مکمل ہوتی تھیں، بلکہ اردو ادب میں بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔آپ نے خدا، انسان اور آخرت کے موضوع پر اتنا کچھ تحریر کیا ہے کہ آنے والی کئی صدیوں تک لوگ اس سے استفادہ کرتے رہیں گے،مولانا محترم نے انتہائی آسان زبان اور تذکیری انداز میں قرآن کی تفسیر لکھی جسے پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ قرآن ہم سے ہی مخاطب ہے۔اَن گنت کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ لاکھوں کی تعداد میں مضامین جو ماہانامہ الرسالہ کی زینت بنے، وہ آنے والے برسوں میں اُس وقت کی تحریر لگیں گے اور لوگ ان سے مستفید ہوں گے۔

جدید علوم اور مذہبی انتشار کے سنگم پر کھڑی اس دنیا کو مولانا نے اپنی تحریروں سے ایک درست سمت دی۔آپ کی کتابیں اسلام اور عصرِ حاضر، عقلیاتِ اسلام، مذہب اور جدید چیلنج، مذہب اور سائنس، اظہارِ دین اور کتابِ معرفت اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

بے شمار بین الاقوامی ایوارڈز اور دنیاوی پذیرائی کے باوجود مولانا محترم عاجزی اور سادگی کا نمونہ تھے۔آپ کی ایک عجیب خوبی یہ تھی کہ روزانہ پیش آنے والے سبق آموز واقعہ کو ڈائری میں لکھتے تھے۔ چاہے اپنے گھر میں ہوں یا سفر میں۔ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے پوچھا:''وقار صاحب آپ کبھی مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھتے''۔میں نے کہا کہ''مولانا، مجھے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تھے اسی لیے میں آپ کے ساتھ شامل ہوا ہوں''۔تو آپ مسکرا دیے۔آپ کی تمام زندگی خدارخی زندگی تھی۔صدی کے اس عظیم مفکر، رہنما، داعی اور مجدّد کی کمی محسوس ہوگی لیکن آپ اپنی تحریروں کی شکل میں ہمیشہ ہمارے درمیان زندہ رہیں گے۔

مولانا اور میرا ساتھ صرف دس سالوں پر محیط ہے لیکن اس سفر کے دوران وہ چند لوگ جن کی تربیت بچپن سے ہی مولانا کی تحریروں نے کی ان میں ایک قابل ذکر نام شبانہ انصاری کا ہے جنہوں

نے میرے کہنے پر مولانا کی تحریروں کو اپنی خوبصورت آواز میں ریکارڈ کیا جو آج مغرب میں اردو سمجھنے والے افراد کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

اگر زندگی نے ساتھ دیا تو ان شاء اللہ مولانا کی تحریروں کو آنے والی نسلوں کے لیے صوتی کتب اور ڈیجیٹل کتب کی شکل میں محفوظ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت تک کی تمام کاوشیں یوٹیوب پر CPS USA کے چینل پر مولانا کی تقریروں اور Amazon پر eBook کی صورت میں موجود ہیں۔ جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

---

نئی دہلی: مشہور اسلامی اسکالر اور عالم اسلام کی معروف شخصیت اور 'الرسالہ' کے مدیر مولانا وحید الدین خاں کا 21 اپریل کو دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 96 سال تھی۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مولانا وحید الدین خاں کافی عرصے سے بیمار چل رہے تھے۔ کچھ دنوں قبل انھیں دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی پیدائش یکم جنوری 1925 کو اعظم گڑھ کے دور افتادہ گاؤں بڈھیریا میں ہوئی تھی۔ عربی، انگریزی، اردو اور دیگر زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اسلام پر کتابیں لکھنے کے علاوہ تفسیر بھی لکھی اور درجنوں اصلاحی کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا کے انتقال سے عالم اسلام اور دنیا ایک بہترین اسکالر سے محروم ہو گئی ہے۔ مولانا نے 'الرسالہ' نکال کر منفی سوچ سے مثبت سوچ کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ ان کی حیثیت ایک مصلح کی تھی۔ وہ ہمیشہ مثبت رخ پر چلنے کا مشورہ دیتے تھے۔ وہ کچھ عرصے تک جمعیۃ علمائے ہند کے ہفت روزہ اخبار الجمعیۃ سے بھی بہ حیثیت ایڈیٹر وابستہ رہے۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 22 اپریل 2021، ماہنامہ اردو دنیا، جون 2021، صفحہ 86)

# دل میں نفرت نہ ہو

امجد احمد، سی پی ایس (رائچور)، کرناٹک

ایک حدیث رسول ہے، جس کے راوی صحابیٔ رسول انس بن مالک ہیں ۔ اس کا مفہوم اس طرح ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بیٹے میری ایک عظیم سنت ہے ۔ جو میری اس سنت سے پیار کرے گا وہ مجھ سے پیار کرے گا جو مجھ سے پیار کرے گا وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ حضرت انس نے عرض کیا خدا کے رسول وہ کیا ہے ۔ رسول اللہ نے فرمایا، میرے بیٹے سن، کسی سے نفرت نہ کرنا، کسی سے بغض نہ رکھنا، کسی کا کھوٹ دل میں نہ رکھنا۔ یہ میری وہ عظیم سنت ہے جو اس سے پیار کرے گا وہ مجھ سے پیار کرے گا اور جو مجھ سے پیار کرے گا وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2678) ۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اس حدیث رسول کا مصداق میں نے مولانا کو پایا ہے ۔ مولانا کے لٹریچر کا مطالعہ اور شخصی ملاقاتوں نے میرے یقین کو اور بڑھا دیا۔ مولانا کے قول اور فعل میں کوئی تضاد میں نے نہیں پایا۔

مولانا کے ساتھ مسلسل ربط نے میرے ذہنی شاکلے کو بدل دیا۔ آج میں ایک بدلا ہوا انسان ہوں ۔ بقول مولانا دعوہ ایکٹوزم (dawah activism) ہمارے لیے ماسٹر اسٹروک (master stroke) اور شاہ کلید ہے اور اس کام کو کرنے کی لازمی شرط جو ہم کو ادا کرنی ہے، وہ یہی ہے کہ ہمارے اندر سارے انسانوں سے محبت اور خیر خواہی ہو کسی سے ذرہ برابر بھی دل میں نفرت نہ ہو ۔ مولانا سے سب سے بڑی بات جو میں نے سیکھی وہ یہی ہے اور یہی میری زندگی کا حاصل و نچوڑ ہے ۔

مولانا کے مسلسل مطالعہ سے میں یقین کے درجہ میں اس بات کو سمجھ گیا ہوں کہ اس دنیا اور آخرت کی کامیابی کا راز نفرت سے خالی ہونا، اور دعوہ ایکٹیوزم کو اختیار کرنا ہے ۔ مولانا کا یہ مشن عموماً سارے مسلمانوں اور خصوصا سی پی ایس کے ساتھیوں کے لیے گویا ایک ریمائنڈر کال (reminder call) ہے ۔

# میں نے مولانا وحید الدین خاں سے کیا سیکھا

مظہر جمیل رشیدی، ممبئی

میرا مولانا وحید الدین خاں سے غائبانہ تعارف ان کی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' کے ذریعہ ہوا تھا (بعد میں دو مرتبہ مجھے مولانا سے براہ راست ملاقات کا موقع بھی ملا)۔ شعوری طور پر وجود خدا کو ماننے میں مجھے تردد تھا۔ اس لیے نہیں کہ خدا کے انکار کے لیے میرے پاس کوئی اہم دلیل تھی۔ اس کی بنیادی وجہ مذہبی لوگوں کا رویہ اور کردار تھا۔ مذہب اور جدید چیلنج کو پڑھنے کے بعد شعوری طور پر میں خدا کا معترف ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے مولانا کی مزید کتابیں پڑھیں۔

''کاروان ملت'' پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مسلمان اور اسلام میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ کاروان ملت میں مولانا نے بتایا کہ مسلمانوں کو اسلام کی روشنی میں دیکھنا چاہیے، نہ کہ اسلام کو مسلمانوں کی روشنی میں۔ خدا سے بغاوت کرنے کی دو اہم وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک خدا کی ملحدانہ تعبیر اور دوسری مذہبی افراد کا کردار۔ مذہب اور جدید چیلنج پہلی وجہ کا علمی تجزیہ ہے۔ اور ''کاروان ملت'' دوسری وجہ کا تحقیقی مطالعہ۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا سے جانا کہ مسلمان داعی ہیں اور غیر مسلم مدعو۔ یہی وہ معیار ہے جس پر مسلمانوں کی دنیاوی اور اخروی کامیابیوں کا انحصار ہے۔

مگر مسلمانوں نے اپنی اس ذمہ داری کو عملاً فراموش کردیا۔ اور اپنے مسائل کی تلافی کے لیے انھوں نے مختلف قسم کے لائحہ عمل تیار کئے۔ مگر نتیجے کے اعتبار سے دیکھئے تو ہر لائحہ عمل نے مسلم مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان کو مزید نئے مسائل میں مبتلا کردیا۔ اور اس کی بنیادی وجہ تشخیص کی غلطی تھی۔ مولانا نے اپنی کتاب ''رازحیات'' میں ایک مضمون بعنوان ''بڑا کام'' کے تحت ولیم بلیک (William Blake) کے درج ذیل اقتباس کو نقل کیا ہے:

Great things are done when men and mountains meet.
This is not done by jostling in the street.

عظیم کام اس وقت ہوتے ہیں جب انسان اور پہاڑ ملتے ہیں۔ کوئی عظیم کام سڑک پر دھکم دھکا کرنے سے نہیں ہوتا۔ (ص 194)

مسلمانوں نے مختلف طریقوں سے اس ''دھکم دھکا'' پر پوری طاقت لگا کر عمل کیا ہے۔مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو وہ انسان نہیں بنایا جو پہاڑوں کو فتح کرنے کے لیے درکار ہے۔ پہاڑ پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لیے محنت، مستقل مزاجی اور ہمت کی ضرورت ہے۔اسی طرح اقوام عالم کے دلوں میں اسلامی جھنڈا لہرانے کے لیے داعی الی اللہ والی صفات محبت،صبر، اور قربانی کی ضرورت ہے۔جسمانی قربانی نہیں بلکہ جذبات، انتقام،منفی احساسات، دوسروں کی ہدایت کے لیے مادی حقوق کو قربان کرنے کی ضرورت ہے۔(ظہورِ اسلام ص 297)

مولانا نے اپنا پورا مشن ہی اسی ذمہ داری کا احساس دلانا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے وقف کردیا تھا۔اس کو دوسرے لفظوں میں احیاء اسلام کا مشن بھی کہا جاسکتا ہے۔ باقی مولانا کا تمام کنٹریبیوشن اسی احیاءِ اسلام کے اردگرد گھومتا ہے۔مولانا نے مسلمانوں سے متعلق جو باتیں محسوس کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان ابھی بھی شاعرانہ دور میں جی رہے ہیں۔ان کی تحریروں اور تقریروں میں حقیقت پسندی سے زیادہ شاعرانہ رنگ غالب ہے۔شاعری کا دوسرا صحیح نام غیر حقیقت پسندی ہے۔ اس کو مولانا غیر سائنٹفک مزاج کے نام سے موسوم کرتے تھے۔(ڈائری 21 جون 1990)

میں نے مولانا کی تقریباً تمام کتابیں پڑھی ہیں۔مگر دوسرے مصنفین کے برعکس ان کی کتابوں میں شاعری کی کوئی قابل ذکر مقدار موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شاعری سرے سے ہے ہی نہیں۔مسلمانوں کو مولانا نے یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی کہ وہ شاعری کے بجائے حقیقت پسندی میں جینا سیکھیں۔خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کو ان خوش قسمت لوگوں میں شامل کرلے جن کو خدا کے پڑوس میں رہنے کا شرف حاصل ہونے والا ہے۔

---

مولانا صاحب نے اپنا کام پوری دیانتداری سے پورا کر کے دکھادیا۔اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ ان کے عظیم مشن کو رہتی دنیا تک جاری رکھیں۔(خالد سعید، کراچی)

# آہ! اس صدی کا عظیم مفکر

محمد نظام الدین قاسمی، ناخدا مسجد زکریا اسٹریٹ،، کلکتہ

وحید الدین خان صاحب بلا مبالغہ اس دور کے بڑے داعی الی اللہ اور اللہ کے ولی تھے۔آپ نے خدا کے پیغام کو دنیا کی زبان میں پیش کیا ہے، آپ نے انڈیا سے لے کر یورپ وامریکہ تک نان مسلم اسٹیج سے اسلام کی ترجمانی اس انداز سے کی ہے کہ دنیا نے بھی اسلام کی حقانیت کا اعتراف کیا۔ آپ کی دعوت کا طریقہ انتہائی انوکھا تھا۔ نہایت پرسکون انداز میں اہل دنیا کے سامنے خدا کا پیغام ایسے اسلوب میں پیش کرتے تھے جس کو مخاطب آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔آپ کی تحریریں جو چاشنی اور مٹھاس ہے اس کا احساس وہی کرسکتا ہے جس نے آپ کی تحریروں کو پڑھا ہے، خصوصاً خدا کی معرفت اور آخرت کا تذکرہ جب آپ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنی آنکھوں سے خدا تعالی کے جاہ وجلال اور قبر وحشر کو دیکھ رہے ہیں۔ بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ زندہ ہوتے ہوئے بھی موت کی کلفتوں کا حسی طور پر اندازہ کر رہے ہیں۔آپ کے دعوتی عمل سے جہاں سیکڑوں انسانوں نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کرکے مذہب اسلام کو اپنایا وہیں لوگوں کو دنیا جینے کا طریقہ بھی آیا ہے۔ایک انسان جو خود اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا ہوا گر وہ آپ کی کتاب رازِ حیات کو پڑھے تو اس کو اپنی زندگی سے تمام شکایتیں دور کرکے آگے کا راستہ طے کرنا آجائے گا۔

مولانا وحید الدین خان صاحب کے کچھ ایسے افکار تھے جس سے علماء کا ایک طبقہ نالاں رہا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسی رائے ہرگز نہیں ہے جس کی بنیاد پر انہیں مطعون کیا جائے، بلکہ علم وتحقیق کے جس مقام پر وہ فائز تھے ایسے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کریں۔ دراصل ہم علماء کا معاملہ یہ ہے کہ ہم بہت جلد اس سے بدظن ہوجاتے ہیں جس کی رائے ہماری رائے یا ہمارے اکابر یا مسلک کے خلاف ہو۔کسی کو بذات خود پڑھے، سنے اور اس سے ملے بغیر محض سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کسی سے بدظن ہوجانا وہ بیماری ہے جو موجودہ علماء کے اندر بہت زیادہ ہے۔اس کا اخروی نقصان تو مرنے کے بعد معلوم ہوگا لیکن دنیا میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا

ہے کہ آپ علمی اور فکری اعتبار سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ خود میرا بھی ایک دور گزرا ہے کہ محض سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر میں مولانا کا بہت بڑا ناقد تھا، لیکن جب کلکتہ آیا اور چچا محترم حضرت مولا نا شفیق قاسمی صاحب امام وخطیب ناخدا مسجد، کلکتہ کی خدمت میں رہنے لگا جو مولانا مرحوم کے بڑے مداح اور عقیدت مندوں میں سے ہی نہیں بلکہ ان کے دعوتی مشن کے ایک فرد بھی ہیں۔ اس وقت قریب سے مولانا کی تحریروں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ تب میں نے سمجھا کہ یہ شخص موجودہ وقت میں اللہ کا سچا ولی ہے۔ اور پھر درجنوں کتابیں آپ کی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ بڑی تمنا تھی آپ سے ملاقات کی، لیکن شاید خدا کو منظور نہیں تھا۔ مولانا نے ایک لمبی عمر پائی اور حدیثِ رسول کے مصداق ہوئے— **خير الرجال من طال عمره وحسن عمله** (لوگوں میں سب سے اچھا وہ ہے جس نے لمبی عمر پائی اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوں) مسند احمد، حدیث نمبر 1768۔ آپ کی زندگی مذکورہ حدیث کے عین مطابق تھی۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالی آپ کی خدمات کو قبول کر کے آپ کے درجات بلند فرمائے، آمین ثم آمین (روزنامہ سہارا ایکسپریس، پٹنہ، 23 اپریل 2021)

---

مولانا سے میں نے آرٹ آف لائف سیکھا ہے، دنیا کے اعتبار سے بھی اور دین کے اعتبار سے بھی۔ مثلاً میں نے مولانا سے یہ سیکھا ہے کہ کیسے منفی تجربات کو مثبت پہلو سے دیکھا جائے۔ یہ 18 اکتوبر 2018 کی بات ہے۔ صبح ساڑھے دس بجے کا ٹائم تھا۔ میں اور ساجد انور صاحب ممبئی سے مولانا سے ملاقات کرنے کے لیے ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ مولانا سے بات چیت کر رہے تھے کہ ایک کشمیری صاحب اسی وقت مولانا کے پاس پہنچے، اور ہماری بات چیت میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا حال بہت برا ہے۔ ان کے بھائیوں نے ان کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، اور انھیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مولانا صاحب نے ان کی پوری بات خاموشی کے ساتھ سنا۔ جب ان کی بات مکمل ہو گئی تو مولانا نے کہا کہ دیکھیے مصیبت اس لیے نہیں آتی ہے کہ بندہ یہ کہے کہ ''ہائے مصیبت''، بلکہ مصیبت اس لیے آتی ہے کہ بندہ دعا کرے۔ یہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ (ڈاکٹر جنید شیخ، سی پی ایس ممبئی)

# لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے

مولانا انس ملک ندوی، سورت گجرات

خدا کی ذات بہت ہی شفیق اور مہربان ہے وہ ہر دور میں انسانوں کے لیے ہدایت کا سامان مہیا کراتا ہے۔ پہلے انبیاء کو مبعوث کرتا تھا اب وہ سلسلہ ختم ہو گیا اب جس سے چاہتا ہے اپنے دین کی تجدید کا کام لیتا ہے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا وحیدالدین انہی میں سے ایک ہیں۔ مولانا وحیدالدین ایک کمزور بدن انسان لیکن پہاڑ سے بھی زیادہ طاقتور اور اٹل جب معاملہ اصول اور دین حق کی دعوت کا ہو۔

بلاشبہ مولانا وحیدالدین خان اس امت میں اپنے عظیم الشان کام کے سبب اپنا ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا علمی کام صرف معلوماتی اضافے کا نام نہیں بلکہ دنیا کو پیش آمدہ بیشتر مسائل کے تدارک کا ذریعہ ہے۔ امت مسلمہ کے اس دور زوال میں جو گرد حقیقی اسلام پر لپٹ چکی تھی اس کی صفائی کا ذریعہ بلاشبہ مولانا خان کی ذات کو اللہ تعالی نے بنایا۔ آج اس دور میں اگر کوئی انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ دین اسلام کا حقیقی مزاج یا اس کی اصل روح کو سمجھے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مولانا کی کتابوں کا مطالعہ کرے۔ مولانا کی کتابیں اسلام کا حقیقی تعارف پیش کرتی ہیں۔ مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی کتابوں کا مطالعہ طالب علم کو بہت ساری دوسری کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ مولانا کا علمی استدلال ان کو امت میں وہ مقام دلاتا ہے جس پر امت کے چند ہی نام سامنے آتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں کمال مولانا کا نہیں بلکہ اس عظیم و برتر خدا کا ہے جو اپنا خاص فضل اپنے خاص بندوں پر کرتا ہے وہ ہدایت کو پہنچانے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیتا۔

احمد امین مصری کی کسی کتاب میں میں نے ایک عبارت پڑھی تھی جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ جب کبھی بھی اس قوم میں کوئی مصلح یا کوئی جید عالم نمودار ہوا تو اس پر کفر اور الحاد کے فتوے داغے گئے حتی کہ اس کی جان کے در پے لوگ ہو گئے مگر جب وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا تو اس کی موت کے سبب لوگوں کا حسد ٹھنڈا پڑ گیا اور دھیرے دھیرے اس کا اعتراف بڑھتا چلا گیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ

موجودہ امت مسلمہ ایک مردہ (زوال یافتہ) قوم ہے۔ زندہ لوگوں کی قدر ان کی نگاہوں میں نہیں جچتی۔

مولانا کا اگر ایک لفظ میں تعارف بیان کیا جائے تو میری رائے میں ''خیر خواہ'' سے بہتر کوئی اور لفظ نہیں ہوسکتا۔ اور خیر خواہی بھی کسی محدود معنوں میں نہیں بلکہ پوری انسانیت کا احاطہ جس میں پایا جاتا ہو۔ عام طور پر مسلم علماء کا مقام ان کی ملی اور قومی خدمات ہی متعین کرتی ہے، اور ان کا نام بھی انہی لوگوں میں متعارف مانا جاتا ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں امت کا درد، قوم کی فلاح جیسے الفاظ ہی پائے جاتے ہیں۔ انسانیت کا درد، اسے درپیش مسائل کا حل، یہ وہ موضوع ہیں جنہیں مسلم علماء یا تو جانتے نہیں یا بضد اسے مانتے نہیں۔ جب کہ مولانا کے نزدیک پورے اسلام کا خلاصہ ہی دو اجزا میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے خدا کو اپنا اصل کنسرن بنانا اور دوسرا ہے تمام انسانوں کی مکمل خیر خواہی۔

مولانا وحید الدین صاحب سے وابستگی کی میری ایک لمبی داستان ہے۔ مختصراً یہاں پر اتنا بیان کرنا چاہتا ہوں کہ طالب علمی کے زمانے میں پوری طرح معاشی تنگی اور دیگر مسائل سے دو چار تھا۔ ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا اسی زمانے میں ہمارے ایک ساتھی نے مجھے ''راز حیات'' نامی کتاب کو پڑھنے کے لیے مشورہ دیا۔ یہ کتاب ایک شاہکار کتاب ہے۔ بظاہر اس میں دینی مسائل آپ کو نظر نہیں آئیں گے لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو یہ کتاب دنیوی ہو کر بھی دینی مزاج پیدا کرنے میں بے حد مؤثر ہے۔ اپنے اندر سے منفی نفسیات کو مٹانا، حقوق طلبی کے بجائے حقوق شناسی کا مزاج پیدا کرنا، ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا کر آگے بڑھنا، زندگی کو مقصد اعلی کے لیے استعمال کرنا، حقیقت پسندی کا مزاج اپنے اندر ڈیولپ کرنا، شکوہ شکایت کرنے کے بجائے اپنے اندر نافعیت پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اس کتاب نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ زندگی کو ایک الگ زاویے سے دیکھنے لگا۔ بہر حال یہ تو مولانا کی صرف ایک کتاب کا اثر تھا دھیرے دھیرے مولانا کے رسالے جب بھی ملتے فوراً پڑھ ڈالتا۔ مجھے اب بھی یاد ہے غالباً عالیہ ثالثہ کا سال تھا گرمیوں کی چھٹی ہونے والی تھی۔ طلبہ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے میں نے گرمی کی چھٹی وہیں پر گزارنے کا ارادہ بنا لیا تھا۔ کون کون سی کتابیں پڑھنی ہے اس کی لسٹ بنانا باقی تھا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی، جو کہ سلیمانیہ ہاسٹل کی لائبریری کے ذمہ دار تھے۔ ان سے مولانا صاحب کی کتابوں کی بابت معلوم کیا انہوں نے بتایا کہ مولانا کے رسالے اب نہیں آرہے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ مولانا وحید الدین خان کی مولانا علی میاں

ندوی پر تنقید تھی۔ میرے ساتھی نے مجھ سے کہا کہ مولانا وحید الدین خان کے پرانے الرسالے ابھی تک لائبریری میں موجود ہیں، اگر تمہیں چاہیے ہو تو میں تمہیں پہنچا دوں۔ میں نے کہا کہ جتنے بھی ہیں وہ تمام کے تمام مجھے دے دو۔

اللہ کا یہ فضل رہا کہ ان چھٹیوں میں میں نے مولانا کو کو خوب پڑھا۔ جو بھی رسالے اس وقت موجود تھے وہ تمام رسالے میں نے پورے غور و اطمینان سے مکمل پڑھے۔ یہیں سے میں مولانا کی فکر کو سمجھا اور مولانا کے مشن سے قریب ہوتا چلا گیا۔ جو اشکالات تھے جو لوگوں کی سنی سنائی باتیں تھیں، جو غلط فہمیاں تھیں، وہ خود بخود مولانا کی کتابیں پڑھنے سے ختم ہوتی گئیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مدرسے سے میری فراغت ہوئی اور آج بھی میں مولانا کو پڑھ رہا ہوں اور ان سے آج بھی سیکھ رہا ہوں۔

مولانا میرے لیے خدا کی ایک عظیم بلیسنگ تھے۔ آج مولانا وحید الدین خاں موجود نہیں، لیکن مولانا کی تحریریں، ان کا لٹریچر ہمارے پاس موجود ہے۔ جو یقیناً پوری انسانیت کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ انسان اس سے اپنے خالق کی حقیقی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔ ابو یحییٰ صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کا علم صرف علم نہیں ہے، بلکہ وہ فیضان الٰہی ہے جسے اللہ نے مولانا کے قلم سے جاری فرمایا۔ مولانا کا سب سے بڑا جو کارنامہ ہے، وہ ہے بندہ کو اپنے رب سے شعور کی سطح پر متعارف کرانا۔ بلاشبہ اس میدان میں آپ کسی دوسری علمی شخصیت کو ان کا مقابل نہیں پا سکتے۔

علماء اور ان کے زیرِ اثر عوام کا مولانا کے بارے میں یہ سوچنا ہے کہ وہ مسلمانوں میں بزدلی اور پست ہمتی کو فروغ دیتے ہیں اور جرات و حوصلہ کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ جب کہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ یہ درست ہے کہ مولانا اپنی قوم کو صبر اور صلح کی تلقین کرتے ہیں۔ ہندوستان کے پیش نظر مسلمانوں کو سیاسی محاذ آرائی سے دور رہ کر تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں، اور یہی چیز مسلم قوم کے لیے سچی خیر خواہی بھی ہے۔ لیکن افسوس مسلمان اسے بزدلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب کہ یہی عین بہادری ہے، ورنہ کون ہے جو قوم کے غلط اقدام کی مذمت کرے۔ کون ہے جو خود گالیاں کھا کر بھی قوم کو روشن مستقبل کی طرف راہ دکھائے۔ کتنی سچی بات خود اللہ نے پیغمبر شعیب کے زبان سے ان کے مخاطبین کے لیے فرمائی ہے، اور وہ اس مقام پر پوری طرح صادق آتی ہے:

تم لوگ خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے (الاعراف، 7:79)۔

# مینارۂ نور

ہمایوں مجاہد تارڑ، پاکستان

علم و تحقیق کے میدان کا کھلاڑی اپنے خلوص اور جوشِ جنوں میں غلط ٹریک پر پایا جائے، تب بھی اس کے لیے سندِ قبولیت ہے؛ احترام ہی احترام ہے۔ 'حق پر ہونے' کا آخری فیصلہ اُس بادشاہ کی بارگاہ میں ہونا ہے جس کے حضور مولانا وحیدالدین خان اب پیش ہو چکے، اور جس کے ہاں فتویٰ بازی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ظاہراً دیکھا جائے تو مولانا مرحوم علم، تحقیق، اِنسپریشن اور حسنِ تحریر کا مینارۂ نور ہیں۔ آپؒ کی تعلیمات اور فکر کے بعض پہلوؤں سے ہمیں شدید اختلاف ہوسکتا ہے، مثلاً علامہ اقبالؒ کے فکر و فلسفہ پر آپؒ کی تنقید وغیرہ۔ تاہم، ایک ایسا شخص جو اپنے ہاں ایک پورا نظامِ فکر رکھتا ہو، اپنی سوچ کے حق میں اپنے تئیں علمی و فکری دلائل رکھتا ہو، غیر متشدّد ہو، دِھیمے لہجے میں کلام کرے، تو اُس کی ہر بات لائقِ سماعت و احترام ٹھہرے گی۔

مولانا مرحوم جیسی لیجنڈری اِنسپائرنگ شخصیت کے حق میں ایک دم سے منفی گوئی والی تلواریں بے نیام کر لینا خود اپنا قد کم کر لینا ہے۔ اختلافی اُمور برطرف، جو لوگ مولانا مرحوم کو زیادہ نہیں جانتے، اُن کے لیے نصیحت ہے کہ آپ مولانا کی کتاب 'رازِ حیات' اُٹھا کر کسی بھی ایک صفحہ کی رِیڈنگ کر ڈالیں۔ شرطیہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یُو وونٹ بِی ایبل ٹُو ڈراپ دِس بُک!

ایک سے ڈیڑھ صفحہ طوالت والے 251 مضامین کی حامل یہ اُن کی مقبول ترین کتب میں سے ہے۔ ایسی ہی آپ نے درجن بھر کتابیں لکھی ہیں جو انسان کی نئے سرے سے ٹیوننگ کرتی ہیں، ایک سُست الوجود بندے کو اٹھا کھڑا کرتی، زاویہ نگاہ بدل ڈالتی، گُھپ اندھیرے میں روشن چراغ کا کام دیتی ہیں۔ مثبت فکری، خلوص، علمیت و رجائیت، اور روشنی سے لدی ایک ندیا ہے آپؒ کی ہر ایسی کتاب۔

اِنسپریشن (ہیومن ڈویلپمنٹ) اور نفسیاتی اصلاح کے موضوع پر آپؒ کا کام ایسا ہے کہ اِس ایک زندگی کے لیے مولانا مرحوم کی دو عدد کتابیں ہی کافی و شافی ہو جائیں۔

دھیمے لب و لہجے والا یہ نکتہ داں اُستاد رخصت ہوا۔ اللہ ہمیں اُن کی تحاریر سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آپ اپنے نوجوان اور جوان بچوں کو اِنسپریشن/ ہیومن ڈویلپمنٹ کے موضوع پر خان صاحب مرحوم کی دو تین عدد کتابیں تو ضرور ہی دِلا دیں۔ جہلم بُک کارنر نے پبلش کر رکھی ہیں۔ قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ انمول سرمایہ ہے یہ۔ باقی باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ''وہ مسائل'' اہلِ علم کو نمٹا لینے دیں۔ کیا خیال ہے؟ (بشکریہ ماہنامہ انذار، کراچی)

---

مولانا وحید الدین خان ایک نابغہ روزگار شخصیت تھی۔ مولانا وحید الدین خان وہ شخصیت تھی جس نے میری سوچ کے ٹھہرے پانی میں ہلچل پیدا کی۔ وہ پہلی شخصیت تھی جو میرے سوچنے کے انداز پر اثر انداز ہوئی۔ مولانا کے افکار و نظریات سے شناسائی سے پہلے ہی میں اگرچہ جستجو کے سفر پر نکل پڑا تھا مگر اس سفر میں فکر کی بنیادیں تبدیل نہیں ہوئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا تھا کہ میں ایک بند گلی سے نکل کر دوسری میں جا رہا تھا۔ مولانا سے تعارف کے بعد میں ان گھٹن زدہ گلی کوچوں سے نکل کر پر فضا وسیع و عریض میدان میں آ گیا۔ جہاں میں ہر چیز کو تعصب کے بغیر دیکھنے کا اہل ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ مولانا کی باتوں کو بھی اسی نظر سے دیکھا۔ یہ تبدیلی بہت بڑی تبدیلی تھی اس سے فکر و تدبر کے دریچے وا ہوئے۔ (چودھری احسان اللہ، پاکستان)

---

مولانا خدا سے حب شدید اور خوف شدید رکھنے والی عاجز شخصیت تھی اور اس دنیا میں یہ خصوصیات لوگوں کے اندر پیدا کرنے کے لیے جو محنت کی، وہ رہتی دنیا تک ان کے لیے صدقہ جاریہ کے طور پر قائم رہے گی، ان شاء اللہ۔ جو تھوڑا بہت پڑھا وہ ان کو پڑھا اور اس سے خوب حوصلہ ملا اور جو تھوڑا بہت نیک عمل کیا وہ خدا کے اس عظیم بندے کی تذکیر القرآن اور الرسالہ کو پڑھ کر کیا۔ اے اللہ ہم تیرے انتہائی شکر گذار ہیں کہ تو نے اپنے اس عظیم بندے سے ہمیں متعارف کروایا۔ اس نے تیرے تخلیق کے مقصد کو ہم پر آشکار کیا، اس کا صلہ ان کو خوب دینا، بے شک تو بہت خوب صلہ دینا والا ہے۔ (عبد القدیر، پاکستان)

# رازِ حیات والے بابا جی

## عارف انیس، پاکستان

مولانا وحید الدین خان بھی رخصت ہوئے! انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ذہین آنکھوں اور متجسس سراپے والی دھیمی اور باوقار شخصیت کے مالک وحید الدین خان کو دیکھ کر ارطغرل والے "ابن عربی" کا خیال آتا تھا۔ وہ ان دس پہلے لوگوں کی فہرست میں شامل تھے جن سے زندگی بھر بہت کچھ سیکھا۔ جن سے ملنے کی حسرت تھی، مگر ہندوستان نہ جاسکنے کی وجہ سے پوری نہ ہوسکی۔ میں اگر ہندوستان جاتا تو ترتیب کے اعتبار سے انہیں دیکھنا، تاج محل دیکھنے سے پہلے بنتا تھا۔ وہ امن، آشتی، برداشت، انسانیت، علم اور عظمت کا تاج محل تھے۔

میرے چند ایک جو غیبی استاد اور مرشد تھے وہ ان میں پہلے نمبر پر تھے۔ جم ران، نپولین ہل، وین ڈاییر، سٹیون کووے، جیک کین فیلڈ، برائن ٹریسی، دیپک چوپڑا، ان سب دیوزاد لوگوں کو پڑھنے اور ملنے سے پہلے انہیں پڑھا اور انہیں ان سب سے اوپر ہی پایا۔ پرسنل ڈیویلپمنٹ یا خودکاری پر ان کا لکھا حرف آخر ہے۔ پندرہ برس کی عمر میں ان کی کتاب "رازِ حیات" پڑھی جس کا میرے اوپر بہت گہرا اثر ہوا۔ میرے خیال میں پورے عالم اسلام میں اپنی ذات کی تعمیر اور نشوونما پر ان سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ مگر کمال یہ تھا کہ صرف باتیں ہی نہیں کیں، پوری زندگی انہی اصولوں پر مرتب گزار دی۔ جماعت اسلامی ہند سے سفر کا آغاز کیا مگر پھر بہت آگے نکل گئے وہ اپنی مثال آپ تھے وہ دنیا میں شاید واحد شخص تھے جن سے دلائی لامہ کو بھی جھک کر ملنا پڑا ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ "رازِ حیات" تک پہنچنے کے بعد اسے انسانوں کے درمیان تقسیم کر کے گئے۔

"ایک امریکی خاتون سیاحت کی غرض سے روس گئیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ہر جگہ کمیونسٹ پارٹی کے چیف کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بات انھیں پسند نہیں آئی۔ ایک موقع پر وہ کچھ روسیوں سے اِس پر تنقید کرنے لگیں۔ خاتون کے ساتھی نے اُن کے کان میں چپکے سے کہا: میڈم آپ اِس وقت روس میں ہیں امریکہ میں نہیں ہیں۔ آدمی اپنے ملک میں اپنی مرضی کے مطابق

رہ سکتا ہے۔لیکن اگر وہ کسی غیر ملک میں جائے تو وہاں اُس کو دوسرے ملک کے نظام کی پابندی کرنی پڑے گی۔اگر وہ وہاں کے نظام کی خلاف ورزی کرے تو مجرم قرار پائے گا۔ایسا ہی کچھ معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا ہے انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے جس کو اُس نے خود نہیں بنایا ہے۔یہ مکمل طور پر خدا کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔گویا انسان یہاں اپنے ملک میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ملک میں ہے۔'' یہ تھے مولانا وحید الدین خان۔وہ ہر شعر، مذاق، اخباری واقعے سے اپنے مطلب کی بات، کوئی نصیحت نکال لیتے تھے۔

خان صاحب، تاحیات اسلام کے داعی اور مارکیٹر تھے۔سب سے کمال کی بات ان کی وہ نگاہ مردمومن تھی جس نے تقریباً گزشتہ پچاس برس میں پولیٹیکل اسلام کے حوالے سے سب سے درست درایت کی۔وہ اسلام سے تعلق رکھنے والی شاید واحد دیو قامت شخصیت تھے جو مذہب کو طاقت کے حصول کے لیے ناجائز سمجھتے تھے، سائنسی طرز فکر کے پرچارک تھے اور خواتین کے حقوق کے شدید قائل تھے ان کا خیال تھا کہ اسلامی معاشرے، سیاسی اسلام کی شکست کی وجہ سے ردعمل کی نفسیات کا شکار ہیں اور مغرب کو ایک حریف کے بجائے حلیف خیال کیا جانا چاہیے۔نوے کی دہائی میں جب ہمارے بچپن میں ہمیں مست گل اور حرکت المجاہدین کا چورن بیچا جارہا تھا، وہ 1960 سے ہی واضح تھے کہ پولیٹیکل اسلام اور اسلام کے نام پر طاقت کا حصول اسلام اور مسلمانوں دونوں کے کڑاکے نکال دے گا۔ان کی، اس ضمن میں تقریباً ساری پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔پاکستان میں گزشتہ پچاس برس میں شدت پسندی کی بڑھوتری کے حوالے سے ان کا لکھا، حرف آخر ہے۔

''جب یہاں ہر تاریکی آخر کار روشنی بننے والی ہے تو وقتی حالات سے گھبرانے کی کیا ضرورت۔ آدمی اگر یہاں کسی مشکل میں پھنس جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ صبر اور حکمت کے ساتھ اس سے نکلنے کی جدوجہد کرے، اگر بالفرض اس کے پاس جدوجہد کرنے کی طاقت نہ ہو تب بھی اس کو چاہیے کہ وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے آنے والے کل کا انتظار کرے۔اس دنیا میں جس طرح محنت ایک عمل ہے، اسی طرح انتظار بھی ایک عمل ہے۔جو شخص عمل کا ثبوت نہ دے سکے، اس کو چاہیے کہ وہ انتظار کا ثبوت دے۔اگر اس نے سچا انتظار کیا تو عین ممکن ہے کہ وہ انتظار کے ذریعہ بھی اسی چیز کو پالے جس کو دوسرے لوگ محنت کے راستے سے تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔قدرت کا نظام خود اپنے آخری

فیصلہ کو ظہور میں لانے کے لیے سرگرم ہے، بشرطیکہ آدمی مقررہ وقت تک اس کا انتظار کر سکے۔"

بے شک اپنے بابا جی سچا انتظار کرنے والوں میں سے تھے۔ اعظم گڑھ میں پیدا ہونے والے وحید الدین خان نے 96 سالہ زندگی میں 200 سے زائد کتابیں تصنیف کیں، الرسالہ نے بلا شبہ لاکھوں قندیلیں روشن کیں۔ گورباچوف ایوارڈ، مدر ٹریسا ایوارڈ، ہندوستان کا پدما بھوشن ایوارڈ اور سینکڑوں مزید ایوارڈ ملے۔ وہ اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی میں لکھنے اور بولنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ان زبانوں میں لکھتے اور بیان بھی دیتے ہیں، خان صاحب نے اپنی پوری زندگی پڑھنے، سوچنے اور مشاہدہ کرنے کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنے آپ کو "تفکیری حیوان" (the thinking animal) کہتے تھے۔ یہ نوبل انعام کی بدنصیبی ہے کہ وہ انہیں نہیں ملا۔ وہ اس حال میں اٹھے کہ ہمارے پاس ان جیسا کوئی نہیں رہا۔

ان کی روانگی کا سوچتا ہوں تو آنکھیں نم ہوتی ہیں مگر پھر رشک بھی آتا ہے کہ ڈیوٹی پوری کر گئے بابا جی۔ اور پھر سورہ الفجر کی یہ آیات کانوں میں گونجتی ہیں: يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً. فَادْخُلِي فِي عِبَادِي. وَادْخُلِي جَنَّتِي (89:27-30) ۔یعنی، اے اطمینان والی روح، تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش۔ پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میری جنت میں چلی جا۔

---

سب کو دنیا سے ایسے ہی جانا ہے لیکن خوش قسمت ہے وہ شخص جو اپنے رب کے اصولوں پر زندگی بسر کرے اور ربّ العالمین کا ساتھی بنے۔ مولانا نے ربّ کا راستہ چنا اور رمضان کے مہینے میں سفر عاقبت پر گامزن ہوئے، ہمیشہ دعا گو۔ (نبیلہ خان، اسلام آباد)

---

بے شک مولانا نے حق ادا کیا دین اور قرآن کے لیے بہت کام کیا۔ ساری زندگی انھوں نے قرآن کو دی ہے۔ بے شک مولانا اپنے کام کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے، نسلیں انھیں پڑھیں گی، ان شاء اللہ (ڈاکٹر تنویر، اسلام آباد)

# مولانا وحید الدین خان: حیات اور افکار

عزیز علی داد، پاکستان

اسکول کے زمانے میں ہم ہر شام مکتب دینیہ جاتے تھے۔ وہاں ہمیں دین و دنیا کو سمجھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اس عبادت گاہ میں ایک بڑی لائبریری موجود تھی جس میں ہم ہر روز بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے لیے اردو پڑھنا تو کجا، بولنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ زبان کے معاملے میں اس نالائقی کے دور میں ایک دن مولانا وحید الدین خان کی سرپرستی میں چھپنے والا رسالہ ''الرسالہ'' ہمارے ہاتھ لگا۔

اس دور میں جب ایک عام قاری کی معیاری کتب تک رسائی تقریباً ناممکن سمجھی جاتی تھی، یہ رسالہ متجسس اذہان کے لیے گویا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ اس رسالے کی اہم بات یہ تھی کہ یہ ہلکی پھلکی زبان میں مذہبی معاملات پر مکالماتی انداز میں روشنی ڈالتا تھا۔ مولانا سے تعارف ہوا تو ان کی مزید کتب سے استفادہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ اور یوں ان کی کتاب رازِ حیات بھی اسی دور میں پڑھ ڈالی۔ اس وقت چونکہ ہم نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، سو ہم رازِ حیات کے فلسفے کو بھی جوانی کے جوش سے دیکھ رہے تھے۔ اسی وجہ سے مولانا کی رازِ حیات کو ہم زیادہ گہرائی میں سمجھ نہیں پائے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رازِ حیات کے مباحث سے دوبارہ واسطہ پڑا۔ اور تب ہی پتہ چلا کہ زندگی ایک راز ہے اور اس کو بامعنی گزارنا ایک فن ہے جو ہم بالکل بھی نہیں جانتے تھے۔

کالج کا دور کراچی میں گزارنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ الرسالہ باقاعدگی سے مل جاتا تھا۔ کراچی کے ریگل چوک اور پی آئی بی کالونی کی ریڑھیوں اور فٹ پاتھوں پر ہم نے علم کے خزانوں کو بکھرا پایا۔ یہیں سے مولانا وحید الدین خان اور دوسرے نامور مصنفین کی کتابیں نہایت ہی سستی قیمت پر مل جاتی تھیں۔ یوں ہمارا زیادہ تر وقت ان کو سمجھنے کی کوشش میں گزر جاتا۔ مولانا صاحب کی تحریریں ہم جیسے طفلِ مکتب کے لیے ایک زود ہضم خوراک کی مانند ثابت ہوئیں۔

انھوں نے روایتی علماء کے فتویٰ ساز رویے سے انحراف کیا۔ مسلمانوں کے پاس کوئی علمی

صنعت تو ہے ہی نہیں۔ ان کے پاس سب سے بڑی صنعت فتویٰ سازی کی ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اسلام میں داخل کرنے سے زیادہ اسلام سے خارج کرنے کا رجحان غالب ہے۔ اسی کی وجہ سے آج غیر مسلم لوگ مسلمانوں کو اتنی بڑی تعداد میں غیر مسلم نہیں بنا سکے جتنا مسلمانوں نے مسلمانوں کو غیر مسلم بنایا ہے۔ مسلمانوں کو کافر بنانے کا سب سے زیادہ کام اسلام کے اسی قلعے میں ہوا جسے خداداد مملکت پاکستان کہا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری جانب مولانا وحید الدین نے فتووں کی دکان کھولنے کی بجائے اپنے زمانے کے رویوں، سوالات اور افکار کی روشنی میں اسلام کی تشریح کی۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے ایک ادارے کی بھی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کا نام مرکز برائے امن و روحانیت (The Centre for Peace and Spirituality) رکھا۔ اس ادارے کا مقصد امن کی ثقافت کو ذہنی روحانیت کے ذریعے پروان چڑھانا تھا۔

مولانا دنیا کے جس حصے کا بھی سفر کرتے، وہاں سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر آتے تھے اور اس سبق کو ڈائریوں اور سفرناموں کی صورت میں شائع کرتے اور اسے عوام الناس تک پہنچانے کی سعی کرتے۔ ویسے تو جو جیسا ہوتا ہے اسے چیزیں بھی ویسی ہی نظر آتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے لوگ ملک سے باہر چلے جائیں تو انہیں سوائے عریانی، فحاشی، بے حیائی اور شراب نوشی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

مولانا وحید الدین کی اردو اور انگریزی میں کتابیں زیادہ تر عصر حاضر کے معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام اور عصر حاضر، مذہب اور جدید چیلنج، مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے، مذہب اور سائنس، سوشلزم اور اسلام، اظہارِ دین، خدا کی دریافت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انگریزی میں ان کی کتابیں، مثلاً:

The Prophet of Peace: Teachings of the Prophet Muhammad
Indian Muslims: The Need for a Positive Outlook
Islam: Creator of the Modern Age

عصر حاضر کے مسائل پر ہی بحث کرتی ہیں۔

مولانا وحید الدین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مسلمان اس جدید دور میں اپنے عصری، علمی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں کو سمجھنے اور انہیں ترجیحی بنیادوں پر اپنانے کے اہل بن جائیں، اور اندھی تقلید کے منحوس چکر میں پڑ کر اپنی زندگیاں نہ گزاریں۔ کیونکہ اندھی تقلید ہی کی وجہ سے مسلمان اپنے خول میں

بند ہو گئے ہیں۔اس کی وجہ سے ان کو نئی چیزوں کی تفہیم نہیں ہوتی ہے۔اور جب ذہن فہم سے ہی خالی ہو تو انسان آسانی سے رائے زنی ،فتویٰ گردی اور نفرت کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کا اگر کسی نئے خیال یا چیز سے واسطہ پڑ بھی جائے تو وہ اسے دین کے لیے خطرہ اور بدعت قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔جدیدیت اور روشن خیالی کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔رد اور مسترد کا یہ رجحان بزدل معاشرہ کرتا ہے۔مسلمانوں میں یہ خوف جدیدیت کا پیدا کردہ ہے۔جب ہم باہر کی دنیا سے مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں،تو اپنے خول میں پناہ لیتے ہیں۔یوں خول سے باہر کی ہر چیز ہمیں خوفناک لگتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہر نئی چیز سے ڈر لگتا ہے۔

مولانا وحید نے اپنے تئیں کوشش کی کہ لوگوں کو جدید زمانے میں مذہب کے ساتھ پرامن زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھا سکیں۔ان کی عاجزی کی انتہا دیکھیے کہ وہ کہا کرتے ''جو اپنے آپ کو بے علم جانے وہی علم والا ہے''۔وہ ساری زندگی فتوے کی دکانوں،نفرت اور دکھاوے کی دنیا سے بہت دور رہے۔مگر افسوس کہ ہم نے ان جیسی شخصیت کو بھی نہیں بخشا اور انہیں اسلام دشمن شخصیت قرار دے دیا۔

آج ہمارے معاشرے میں جذبات کا غلبہ اور سمجھداری کی کمی دیکھ کر اس چیز کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ہم صرف جذبات کے معاملے میں ہی جوان ہیں لیکن عقلی و شعوری سطح پر اب بھی عہد طفلی میں گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔اس ناامیدی بھری فضا میں مولانا وحید الدین خاں کی وفات کے بعد مکالمہ اور فکر کی راہ اور بھی محدود ہو گئی ہے۔جب کہ دوسری طرف سطحی جذباتیت کا ایک طوفان امڈ آیا ہوا ہے جس کی آگ بڑی تیزی سے معاشرے سے عقلی فکر و عمل کو بھسم کر رہی ہے۔

مولانا وحید الدین خان کی جس خوبی نے مجھے ہمیشہ ہی ان کی کتابوں سے جوڑے رکھا وہ ان کی،زندگی سے محبت تھی۔وہ ہمیں مذہب کے ایسے پہلوؤں سے روشناس کراتے تھے جو زندگی سے محبت کرنے اور نہ صرف بامعنی بلکہ بھرپور طریقے سے زندگی گزارنے میں بھی مدد دیتی تھیں۔یہی زندگی دوست رویہ ان کی کتابوں کے ٹائٹلز سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔راز حیات،راہیں بند نہیں،تعمیر حیات،حقیقت کی تلاش اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

آج کے مذہبی علماء تو ہمیں اس دنیا اور زندگی سے اتنا ڈراتے ہیں کہ ہمیں مرنا ہی خوبصورت عمل لگتا ہے۔اور اسی خواہش مرگ نے ہماری زندگیوں سے سارے خوبصورت رنگ اور مسرتیں

چھین لی ہیں۔ اس قریب المرگ ذہنیت سے نجات زندگی سے دوبارہ تعلق پیدا کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہماری زندگی فی الحال موت اور ہیبت کے سوداگروں کے ہاتھ گروی رکھی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم زندگی جی نہیں رہے بلکہ گزار رہے ہیں۔ یاد رکھیے جیل میں عمر قید کی سزا بھگتنے والے قیدی زندگی جیتے نہیں گزارتے ہیں۔

ہماری زندگیاں بھی ان سوداگروں کے وجہ سے ایک ذہنی قید خانے میں مقید ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے اس قید خانے سے باہر نکلنے کی سزا موت ہی ہو گی۔ یا خدا جائیں تو کہاں جائیں۔ جیل کی کال کوٹھڑی میں گھٹن مار دیتی ہے اور باہر نکلنے کی کوشش کریں تو مذہب کے نام نہاد محافظ مار دیتے ہیں۔ اور بدقسمتی سے مولانا وحید الدین کی وفات کے ساتھ زندگی سے محبت کے بیانیے کا ایک چراغ بجھ گیا ہے اور ہم مزید اندھیروں کے سوداگروں کے زیر اثر آ گئے ہیں جو حیات، علم اور محنت نہیں بلکہ موت، جہالت اور نفرت بانٹتے ہیں۔ موت، تاریکی اور عقل کے دشمن کے لگائے ہوئے پہروں میں زندگی، عقل اور روشنی کی بات کرنا ایک ربانی عمل ہے جسے مولانا وحید الدین نے بخوبی سرانجام دیا۔ (بشکریہ ہم سب، پاکستان)

---

مجھے مولانا کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو ''تعبیر کی غلطی'' کے ابتدا میں درج ہیں۔ آہ، اب پڑھتا ہوں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ رقم طراز ہیں ''اس کتاب کی اشاعت میرے اوپر اتنی سخت ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے شائع ہونے کے بعد میں کسی ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں جہاں کوئی شخص مجھے نہ دیکھے، اور پھر اسی حال میں مر جاؤں''۔

اختلاف کا یہ طریقہ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے، وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی!

(دانیال طاہر، کراچی)

# مولانا وحید الدین خان، ایک عہد ساز شخصیت

لونگین یوسف زئی، پاکستان

مولانا وحید الدین خان کی پیدائش یکم جنوری 1925ء کو ہندوستان میں ریاست اُتر پردیش کے ایک علمی خطہ اعظم گڑھ میں ہوئی۔ والد فرید الدین خاں اپنے علاقے کے ایک بہت بڑے زمین دار تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے قابلِ عزت واحترام تھے، جب کہ والدہ زیب النسا گھریلو امور سنبھالنے والی ایک ذمہ دار خاتون تھیں۔

مولانا کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی مکمل پرورش والدہ نے اپنی نگرانی میں کی۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم عربی درس گاہ میں ہوئی۔ عربی اور دینی تعلیم سے فراغت کے بعد اُنھوں نے جدید علوم کے حصول پر توجہ دی اور سب سے پہلے انگریزی زبان سیکھی۔ اُس کے بعد مغربی علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ حتیٰ کہ ان علوم پر کافی دسترس حاصل کرلی۔ اسلامی اور مغربی علوم سے بخوبی واقفیت حاصل کرنے کے بعد مولانا صاحب اِس نتیجہ پر پہنچے کہ آج کل کے دور میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ جدید سائنسی دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جائے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔

مولانا کو پانچ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان میں اُردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی شامل ہیں۔ مولانا صاحب ان زبانوں میں لکھتے اور بیان بھی کرتے تھے۔ ٹی وی چینلوں پر آپ کے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔

مولانا وحید الدین خاں دراصل بے پناہ صلاحیتوں اور خصوصیات کا نام ہے، جن کی زندگی کے بے شمار باب ہیں اور ہر باب اپنے آپ میں مستقل اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم مولانا کی زندگی کا اصل مشن اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانا تھا۔ مولانا نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور قرآن کی تفسیر بھی لکھی۔ عام طور پر دانشور طبقے میں امن پسند مانے جاتے تھے۔ امن اور برابری کے اپنے فلسفے اور مستقل پیغام کی وجہ سے اپنے ناقدین میں بھی مقبول رہے۔

مولانا صاحب کا مقصد اسلام اور دیگر مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اسلام کے متعلق غیر مسلموں کی غلط فہمیاں دور کرنا، صبر کی تعلیم کو عام کرنا اور دعوتِ دین تھا۔ سال 2000ء میں بھارتی حکومت کی جانب سے مولانا کو ان کی علمی خدمات کے باعث ملک کا تیسرا بڑا شہری اعزاز ''پدم بھوشن'' دیا گیا جب کہ جنوری 2021ء میں مولانا صاحب کو ہندوستان کے دوسرے اعلیٰ شہری اعزاز ''پدم وبھوشن'' سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی مولانا صاحب کئی قومی و بین الاقوامی ایوارڈز سے سرفراز ہو چکے تھے۔

مولانا وحید الدین ایک صوفی مزاج طبیعت کے مالک، ایک روایتی شخص کی مانند تھے لیکن ان کے خیالات جدید تھے۔ انتہا پسندی اور مقدس صحیفوں کی قدامت پسند ترجمانی کے خلاف تھے۔ اپنے مذہبی اور روحانی خیالات کا مکمل اظہار کرنے کے لیے مولانا صاحب نے 1970ء میں دہلی میں اسلامک سینٹر قائم کیا۔ اس کے بعد سال 1976ء میں مولانا صاحب نے ماہانہ رسالہ ''الرسالہ'' کی اشاعت کا آغاز کیا۔ ''الرسالہ'' مولانا صاحب کے اپنے مضامین پر مشتمل تھا جو کہ اپنی اشاعت کے بعد اُردو زبان کی دنیا میں تیزی سے مقبول ہو گیا۔ مولانا صاحب کے مضامین کا مقصد لوگوں کو اسلام کا پُرامن چہرہ سمجھانے، مسلمانوں میں اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے آگاہی، مثبت سوچ اور مثبت عمل کو فروغ دینے پر مشتمل تھا۔

مولانا وحید الدین نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق تقریباً 200 کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے نظریاتی اور سیاسی خیالات سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی علمی فضیلت کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ مولانا صاحب کی لکھی ہوئی ایک کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' پانچ عرب ممالک قطر، مصر، لیبیا، سوڈان اور تیونس کی جامعات میں تعلیمی نصاب کا حصہ ہے۔ دیگر اہم تصانیف میں سے نئے عہد کے دروازہ پر، تعبیر کی غلطی، الاسلام، مذہب اور سائنس، پیغمبرِ انقلاب، عقلیاتِ اسلام، قرآن کا مطلوب انسان، سوشلزم اور اسلام، اسلام اور عصرِ حاضر، تذکیر القران، حقیقتِ حج، اللہ اکبر، زلزلۂ قیامت، خاتونِ اسلام، رازِ حیات، اسلام دورِ جدید کا خالق، سفرنامہ اسپین و فلسطین، فکرِ اسلامی، مطالعۂ سیرت، مطالعۂ قرآن، مسائلِ اجتہاد، مطالعۂ حدیث اور اظہارِ دین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی کئی اسلامی کتابیں ہیں۔

مولانا وحید الدین خاں 96 برس کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔مولانا صاحب نے پس ماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ان کے انتقال پر مسلم امت یقیناً ایک عظیم مذہبی اسکالر سے محروم ہوگئی ہے۔(nasirusafzai@gmail.com)

www.lafzuna.com/history/s-21948

---

# تاریخِ وفات منظوم مولانا وحید الدین خاں

مولانا تحمید خضر نندنوی، بہار

عالم اسلام کے شیخ کبیر
ماہنامہ الرسالہ کے مُدیر

ایک مؤرّخ، اک مُجدّد، شاہِ فن
شیخ عرفاں، شیخ دیں، شیخ زمن

عصرِ نو کے تھے خطیب انقلاب
علم وحکمت کا نرالہ آفتاب

امن کا پیغام بَر، ظلمت شکن
ہادیِ ہندوستاں، بدعت شکن

آہ! دنیا سے گئے دار السلام
زندگی کا ہوگیا قصہ تمام

تھے وحید الدین اُمت کے حکیم
پاک طینت، نیک دل، طبعِ حلیم

تیری تصنیفات ہیں، شمعِ حرم
تیری توضیحات ہیں، مُثبت حَکَم

آٹھ روزہ یومِ بدھ، ماہِ صیام
چودہ سو بیالیس میں مرگِ امام

نور کی بارش ہو بَر قبرِ وحید
ایں دعائے قلبِ مضطر، یا مُعید

اے خِضر لکھ تاریخِ موتِ وحید
یا اللہ، یا غفّار، یا حَمِید

1442

# دعوتی مزاج کے شارح

اسرار مدنی، اسلام آباد

آفتاب علم و عرفان، عصر حاضر کے سب سے بڑے نبض شناس اور اسلام کے دعوتی مزاج کے شارح مولانا وحید الدین خاں ہندوستان میں انتقال فرما گئے! انا للہ و انا الیہ رجعون!

افغان وار اور نائن الیون کے بعد برصغیر کے مسلمانوں پر شدت پسندی اور انتہا پسندی کے پروپیگنڈے کے خلاف انتہائی مؤثر کام کیا۔ اور اسلام کے مزاج کی زبردست تشریح کی، خاں صاحب مرحوم سید ابوالاعلی مودودی رحمہ اللہ اور سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے معاصر تھے۔

انہوں نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر کے پولیٹیکل اسلام پر مبنی فکر کو خیر باد کہا، اور تعبیر کی غلطی کتاب لکھ ڈالی! اس میں انہوں نے سید مودودی مرحوم کے ساتھ اپنے خط و کتابت کے کئی حوالے دیے ہیں! مولانا کے بعض تفردات کے وجہ سے ان کو علمی حلقوں میں زبردست تنقید کا سامنا رہا، مگر مجال ہے کہ انہوں نے کبھی مناظرانہ روش اختیار کی۔

علم، دعوت و اخلاق کا نمونہ تھے۔ دس بارہ ملکوں کے سفر سے اندازہ ہوا کہ اگر کہیں ائیر پورٹ، جامع مسجد یا کسی عبادت گاہ میں مسلمانوں کی نمائندگی موجود ہے تو اس میں ان کی تفسیر کو پایا۔ چھ زبانوں (عربی، انگلش، ہندی، پشتو، سندھی، تھائی) میں ان کی اردو تفسیر کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ 1976 سے وہ الرسالہ کے نام سے ماہنامہ میگزین نکالتے رہے۔ اس رسالے کے مکمل مضامین وہ خود لکھتے تھے۔ ان کا طرز تحریر انتہائی شستہ، شگفتہ اور متاثر کن تھا! مولانا نے نہ جلسے کیے، نہ گلا پھاڑ کر خطاب کیا، نہ جتھہ بنایا مگر دنیا بھر میں اسلام کے پیغام کو مؤثر انداز میں پیش کیا!

ہزاروں نوجوان ان سے متاثر ہوئے، ہزاروں لوگ ان کی وجہ سے اسلام سے قریب ہوئے، جب کہ کئی ہزار لوگوں نے الحاد کو خیر باد کہا۔ اتنے بڑے داعی کی زندگی کس قدر سادگی سے گزرتی رہی اس کا اندازہ قریبی دوست لگا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین، ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کے علمی ورثے سے زیادہ سے فائدے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

# آرے کہاں مرتے ہیں علم والے

محمد ابراہیم امین، پاکستان

نیک لوگوں کی موت بھی ایک زندگی ہوتی ہے، ان کا مرنا بھی علم کا ایک نیا باب کھول جاتا ہے، ان کا مادی وجود تو زمین کے اندر مٹی میں مل جاتا ہے، لیکن ان کی تعلیمات روحوں میں اتر جاتی ہے، ان کا مادی وجود زمین کے اندر چلا جاتا ہے، ان کا کردار باہر کے لوگوں کے لیے مثال بن جاتا ہے، وہ مادی وجود کے ساتھ اپنے گھروں میں جیتے تھے، قبر میں جا کے لوگوں کے دل و دماغ میں جینے لگتے ہیں۔ ایسے انسان موت سے پہلے کے دور حیات میں اسی طرح جیتے ہیں، جیسے وہ موت کے بعد کے دور حیات میں ہوں، اور پھر وہ موت کے بعد کے دور حیات میں اس طرح اٹھیں گے کہ ان کے چہرے روشن اور چمکدار ہوں گے، ان کے چہروں پر سکون ہوگا، جو ان کے رب کی طرف سے انہیں عطا کیا جائے گا۔ یقیناً یہی کامیاب لوگ ہیں، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں ایسے ایک انسان کا بیان ہے۔ ایک عالم دین، مفکر و مدبر، مختلف زبانوں میں سینکڑوں کتابوں کا مصنف، لاکھوں لوگوں کو زندگی کی ایک نئی امید دینے والا یہ شخص موجودہ دھرتی پر خدا کا ایک ایسا انعام تھا کہ جس کے بارے میں لکھنے کے لیے میرے پاس شاید کہ الفاظ نہیں یا پھر میں لکھ نہیں پا رہا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا، میرے دل کی دھڑکن کا تیز ہو جانا مجھے اس شخص سے محبت کا احساس دلاتا ہے، یہ ایک سچ ہے کہ قیامت تک اس شخص کی کمی محسوس ہوگی۔ یہ وہ شخص ہے جسے میں نے سب سے زیادہ پڑھا سمجھا اور اسی کی سوچ کو اپنی سوچ بنا لیا اگر مولانا کو ماہر نفسیات کہا جائے تو یہ بالکل درست بات ہوگی۔ منفی پہلو میں مثبت پہلو کے ساتھ جینے کا ڈھنگ سکھانے والا، زندگی سے مایوس لوگوں کو زندگی سے پیار کرانے والا، خدا کو رسمی عقیدہ کے طور پر ماننے کے بجائے دریافت کی سطح پر لوگوں کے شعور میں ڈالنے والا عظیم انسان اپنے عظیم رب کے پاس پہنچ گیا ہے، مولانا کو اللہ نے بڑے مقام و شرف سے نوازا،

ان کی تمام جہود وکاوشوں کو تا صبح قیامت یاد رکھا جائے گا۔ مولانا کا جانا امت مسلمہ کے لیے ایک نقصانِ عظیم ہے۔

رب کریم مولانا کی مغفرتِ کلی فرمائے، ان پر اپنی رضوان کی برکھا نازل فرما کر جنت الفردوس میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا پڑوسی بنائے۔

---

# تشکیک سے ایمان تک کا سفر

## حبیب اللہ حقانی، پشاور، پاکستان

مصر کے مشہور نابغہ روزگار شخصیت ڈاکٹر مصطفیٰ محمودؒ نے ''رحلتي من الشك الى الإيمان'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے تخلیقِ انسان، عدل، عذاب، جسد، روح، توازن وغیرہ پر جدید علوم کے مطابق عمیق انداز میں بحث کی ہے۔ اُس میں وہ مولانا وحیدالدین خانؒ کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

يقول لنا المفكر الهندي وحيد الدين خان:إذا كان الظما إلى الماء يدل على وجود الماء فكذلك الظمأ إلى العدل لابد أنه يدل على وجود العدل ... ولأنه لا عدل في الدنيا ... فهو دليل على وجود الآخرة مستقر العدل الحقيقي۔(صفحہ 35)

یعنی جب پیاس پانی کے وجود پر دلالت کرتی ہے تو اسی طرح انصاف کی پیاس (مطالبہ) بھی انصاف پر دلالت کرتی ہے۔ جب کہ دنیا میں انصاف نہیں ہے تو یہ واضح دلیل ہے کہ ''آخرت'' جو حقیقی انصاف کا ٹھکانہ ہے، موجود اور ثابت ہے۔

جدید دور کے اہم اور اس صدی کے قدآور شخصیت کو اللہ تعالیٰ مغفرت نصیب فرمائے اور مساعی جلیلہ و خدمات جمیلہ کو قبول فرمائے۔

# باہوش مجذوب

محمد سجاد نواز، ساہیوال، پاکستان

''زندگی میرے لیے اُس دن کا انتظار ہے جب رب العالمین براہِ راست طور پر اِنسان پر ظاہر ہوگا اور میں خوشی اور حیرت کے آنسوؤں کے ساتھ اُس کا اِستقبال کروں گا۔''

مولانا وحید الدین خان صاحب بظاہر ایک سادہ نظر آنے والے واقعہ کا تعلق بھی اللہ اور آخرت سے جوڑ کر دکھا دیا کرتے تھے۔ اپنی تحریروں میں اِس بات کا خاص خیال رکھتے کہ بات اِس طرح کی جائے کہ جدید ذہن کو اپیل کرے اور اُس سے سبق بھی حاصل ہو۔ اِس کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو مولانا کی شہرہ آفاق کتاب ''رازِ حیات'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مولانا کی کُتب نے زندگی کے حوالے سے کئی لوگوں کے سوچنے کا زاویہ تبدیل کیا۔

بعض اہل علم نے مولانا کی پیش کردہ تعبیرِ دین سے اختلاف بھی کیا لیکن جس بات کے کم و بیش سب ہی معترف رہے وہ اُن کا الحاد کے تناظر میں کیا گیا علمی کام ہے۔ کئی صاحب علم کی زبان سے سنا کہ وہ ایک زمانے میں الحاد و تشکیک کا شکار ہوئے اور پھر مولانا وحید الدین خان کو پڑھ کر واپس اسلام کی طرف لوٹے۔ مولانا کی ذاتی زندگی کے حوالے سے ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ ''مولانا وحید الدین خان صاحب اپنی روزمرہ زندگی میں بھی خدا کو ایسے یاد کرتے تھے جیسے اسباب کے پردے اُن کی آنکھوں سے چھٹ گئے ہوں۔ مثلاً

چائے ٹھنڈی ہوگئی تو اللہ پاک نے آج ٹھنڈی چائے پلا دی،

چائے گر گئی تو اللہ پاک نے پہلے والی چائے گرا کر نئی والی پلا دی۔

جہاز لیٹ ہوگیا تو اللہ پاک نے جہاز لیٹ کر دیا،

کسی نے پکڑ کر جہاز پہ سوار کرا دیا تو اللہ پاک نے آگے ایک بندہ بھیجا ہوا تھا جس نے پکڑ کر جہاز پہ بٹھا دیا،

راستہ بھول گئے تو اللہ پاک نے ان سڑکوں کا دو چار بار چکر لگوا دیا،

کسی نے رستہ بتا دیا تو اللہ پاک نے رستہ بتانے والا کھڑا کیا ہوا تھا۔‘‘

اہل نظر بالعموم مجذوب کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ جو فنا فی اللہ کی کیفیت سے ایسے گزریں کہ اُنہیں خدا کے سوا کچھ دکھائی نہ دے یہاں تک کہ ہوش باقی نہ رہے۔ اِس میں استثناء البتہ ایک شخص کو حاصل رہا وہ مولانا وحید الدین خان صاحب ہیں جو ’’باہوش مجذوب‘‘ تھے۔

---

# ’’آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے‘‘

قاسم رونجھا، کوئٹہ، پاکستان

مثبت سوچ، اصول اعراض، خدارخی زندگی، دعوہ ورک، وقفہ امن، تعمیر شخصیت، آرٹ آف تھنکنگ، بے فائدہ لڑائی، علانیہ واپسی، پیرانوئیا کی نفسیات اور اس قسم کی بے شمار اصطلاحیں وضع کرنے والی آواز اگرچہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی ہے۔ لیکن بلاشبہ مولانا صاحب اپنے ہی الفاظ میں وہ امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کی چند سیڑھیاں دے گیا ہے۔

مولانا قدیم جدید علوم پر گہری بصیرت رکھنے والے اعلی پائے کے مجتہد اور بہت بڑے نفسیات دان تھے۔ مسلم نفسیات کا جس طرح انھوں نے گہرا تجزیہ اور حل پیش کیا معلوم تاریخ میں ایسا کام پہلے نہیں ہوا۔

میں نے مولانا صاحب کو 2006 سے پڑھنا شروع کیا، اور تب سے آج تک اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جب بھی انھیں پڑھا علم وبصیرت اور سوچ کی نئی راہیں کھلیں۔ مولانا کے عصری اور سائنٹفک اسلوب سے کوئی آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدیم جدید علوم پر ان کی گہری نظر تھی ان کا انداز تحریر یہ ہے کہ وہ ایک مختصر عنوان قائم کرتے ہیں۔ اپنے قاری کو اعلی سطح کی معلومات پہنچاتے ہیں۔ اور آخر میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ بے شمار موضوعات پر ان کی سینکڑوں کتابیں ہیں۔ مجھے ان کی کتابوں میں سفرنامے اور ڈائریاں بہت پسند ہیں۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے اور ان کے مشن کو قائم ودائم رکھے۔

# مولانا وحیدالدین خاں: افکار وخدمات

محمد عارف ندوی (استاذ جامعۃ الہدایہ، جے پور، راجستھان)

انسانی تاریخ میں ہر زمانے میں جینیس افراد پیدا ہوتے رہے اور انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر ہر زمانہ میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے۔ مثلاً حضرات انبیاء علیہم السلام۔ اس کے بعد اصحابِ رسول کا گروہ ہے، جس کو ایک مستشرق نے ہیرووں کی نرسری کہا ہے۔ اس کے بعد بھی امت مسلمہ میں ایسے جلیل القدر ذہین، رجال کار، ارباب حل وعقد، کی آمد کا سلسلہ جاری ہے، اور تا صبحِ قیامت ان شاء اللہ یہ زریں سلسلہ جاری رہے گا۔ انہیں ذہین، مجتہد ارباب حل وعقد میں مولانا وحیدالدین خاںؒ صاحب کی عظیم شخصیت کا شمار ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ نے اعظم گڑھ کے زرخیز خطے میں اپنی آنکھیں کھولیں، اور بعد میں چل کر وہ کارنامہ انجام دیا جسے دنیا کی آنکھوں وچشم فلک نے قدردانی کی اور ۲۰۲۱ء (رمضان المبارک ۱۴۴۲ء کے عشرۂ اولی) میں یہ شمع علم ومعرفت کے میدان میں اپنی فکری وعلمی تابانیوں کو بکھیر کر زندگی کی آخری سانس لی۔

مثبت افکار کی شمع جلا کر کے جریدۂ عالم پر اپنا روشن نام ثبت کر دیا، مولاناؒ جسمانی طور پر اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن اپنے اعلیٰ افکار و مثبت کردار وامت مسلمہ کی صحیح رہنمائی کرنے والے دروس واسباق کے ایسے لازوال ودائمی نفع بخش آثار وخدمات کے موتی دے گئے جو تا ابد درخشاں رہیں گے۔ مثلاً مولانا نے اسلام کی حقانیت کے اثبات کے لیے سائنسی انداز فکر کو اپنایا اور سائنسدانوں کی تحقیقات کی روشنی میں کلمۂ اسلام ودین اسلام کی حقانیت اجاگر کی۔

قرآن عظیم کی منفرد خدمت انجام دی کہ جس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی، 30 سے زیادہ زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ شائع کروا کر دنیا میں پیغام خداوندی کو عام فرمایا۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ نہ جانے اس کی برکت سے رب ذوالجلال کی کتاب مقدس کے ذریعہ کتنے لوگوں کو اسلام کے سمجھنے کی توفیق ارزانی ہوئی اور ہزارہا ہزار لوگوں کے شکوک وشبہات وغلط فہمیوں کا ازالہ ہوا اور ہزاروں غیر مسلموں کو اسلام کے قبول کرنے کی توفیق وسعادت حاصل ہوئی۔

مولانا کے قلم گوہر بار سے سیکڑوں علمی دینی ادبی تحقیقی کتابیں و مضامین تصنیف ہوئیں جن سے مولانا کی شخصیت کو پہچانا جاسکتا ہے، آپ کی تحریروں و مثبت افکار سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوتی ہے۔ مولانا کی مشہور کتابیں ''علم جدید کا چیلنج'' یا ''اظہار دین'' نامی کتابوں سے مولانا کی فکر کو بہ خوبی پہچانا جاسکتا ہے، ایسے مضامین جن سے مثبت سوچ، اور تخریب میں تعمیر، فساد میں صلاح، شر میں خیر، کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ انھوں شر میں خیر، تخریب میں تعمیر، مکر میں ایجابی سوچ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا مرحوم کی سو سے زائد تصنیفات وتألیفات وعلمی مضامین ومقالات ہیں اور مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر نشر ہو چکے ہیں اور علماء وسائنسداں وحق کے متلاشیوں سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں اور انہیں صراط مستقیم پر چلنا نصیب ہوا ہے۔

مولانا مرحوم میں بہت سے محاسن وخوبیاں تھیں، انسانوں کے ہر ہر طبقے میں مولانا کو شرف قبولیت حاصل ہوا، بعض حضرات نے ان کے چند افکار وتخیلات کی بابت تنقید وتنقیص کا پہلو اختیار کیا ہے، یقینا انسان کے کاموں میں وہ کمال نہیں ہوسکتا جو رب ذوالجلال پھر انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ ہے، انسان غلطیوں سے پاک نہیں ہوسکتا، بقول امام مالک بن انس كُلُّ أَحَدٍ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهِ وَيُرَدُّ إِلا صَاحِبَ هَذَا الْقَبْرِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم (المقاصد الحسنۃ، اثر نمبر 815)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر ایک قول کو لیا بھی جاسکتا ہے، اور چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔ اسی کے پیش نظر یقیناً مولانا کی بہت سی رایوں سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہے، اور بہت سے ارباب تحقیق نے اس کار خیر کو انجام بھی دیا ہے۔

امت مسلمہ کا دانشور طبقہ بہ خوبی واقف ہے کہ مولانا نے مذہب اسلام کی سر بلندی وحقانیت کے اثبات کا جو کام انجام دیا ہے، وہ بسا اوقات ایک انجمن بلکہ پوری اکیڈمی کا کام تھا، جسے مولانا نے تن تنہا انجام دیا، اور ملک ہندوستان میں مسلمانوں کو درپیش چیلنج میں مثبت راہ نمائی فرمائی۔ یکساں سول کوڈ، مدارس اسلامیہ کے نصاب ونظام وطریق تعلیم کی افادیت پر یا پیغمبر اسلام کے تشخص وعظمت پر یا قرآن مجید کے ذریعہ اظہار دین پر مولانا کے قلم سے فکری، تحقیقی وعلمی، ایجابی باتیں نکلی ہیں، جنہیں پڑھ کر بہت سے نان مسلموں نے اسلام کے تئیں اپنی بے خبری کا اعتراف

کیا، اور یہ کہا کہ اگر یہی اسلام ہے تو ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہی مولانا مرحوم کی مغفرت و درجات کی بلندی کے لیے کافی ہے ان شاء اللہ۔

میں نے خود دیکھا کہ ایسے مقامات پر مولانا کے نام سے ان کی کتابیں ورسائل وفکری مضامین تقسیم کرنے کی عام اجازت ملی جہاں کسی ٹوپی وداڑھی والے کا گزر مشکل تھا۔ مثلاً جے پور لٹریچر فیسٹول، وغیرہ۔ زمانے کے اسلوب میں اسلام کی حقانیت پیش کرنے وتہذیب اسلامی کے صحیح خدّوخال اجاگر کرنے واظہار دین کا یہ گراں مایہ کارنامہ تاابد یاد رکھا جائے گا، نئی نسل کو مثبت فکر وایجابی اسلوب میں سوچنے سمجھنے ودوسروں تک اسے پیش کرنے کا عظیم کارنامہ مولانا مرحوم کا ایک عمدہ تحفہ وحسین گلدستہ ہے جس کی خوشبو سے سارا عالم معطر ہوتا رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہج دعوت وتبلیغ کی جلوہ سامانی وتابانی ہمیشہ زندہ وجاوید رہے گی۔ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی موقع نہیں چھوڑا، جہاں آپ نے دعوت پیش نہ کی ہو، آپ کبھی عکاظ کے میلے میں، کبھی ذوالمجاز وذوالمجنہ کے کافروں ومخالفوں کی جھرمٹ میں، کبھی کسی گھاٹی میں مشرکین کے ازدحام میں اسلام کا کلمہ پہنچایا اور ہر جگہ مخالفتوں ودشنام طرازیوں وخردہ گیریوں وجاں فشانیوں کے باوجود کامرانی وکامیابی کی دولت سے ہمکنار ہوئے۔ یہی معاملہ مولانا کا تھا۔ حق ہے کہ اسلامی دعوت کی تڑپ میں لیل ونہار کی گردشیں گزارنے والے دعوت وتبلیغ کے اس داعی، محی السنہ کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے۔ اے مردِ مجاہد! تیری رفعتوں کو دوام، تیری عظمتوں کو سلام، اور تیری مثبت وایجابی فکروں کو عروج حاصل ہو، اور مخلوقِ خدا کو اس سے تشنہ کامی کو دور کرنے وتاریکی کو مٹانے کی توفیق وسعادت حاصل ہو۔

---

بہت اداس ہوں۔ مولانا سے بہت متاثر ہوں۔ ایسی صالح اور پاک زندگی گزاری ہے انہوں نے کہ جس پر رشک کیا جاسکتا ہے۔ جب بھی زندگی سے مایوس ہوتا ہوں مولانا کی کوئی کتاب پڑھتا ہوں اور تازہ دم ہوجاتا ہوں۔ (شہزاد علی، اٹک، پاکستان)

# ایک پیغام

13 جون، 2021

جناب ڈاکٹر ثانی اثنین صاحب حفظکم اللہ تعالی ورعاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ مولانا وحید الدین خان صاحب ایک عبقری انسان تھے۔ زندگی بھر میں ان کے الرسالہ اوران کی دیگر کتب کا قاری تھا۔ ان کی وفات پر بڑا صدمہ ہوا، اور رمضان المبارک کی مبارک طاق رات میں اپنی جامع مسجد کوئینس کراس ڈڈلی میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی، جس میں بہت سے نمازی شریک تھے۔ اللہ کریم مولانا کو اعلی علّیین میں جگہ عنایت فرمائے، اوران کے متعلقین کو صبر جمیل بخشے، آمین! میں جامعہ دار السلام عمر آباد کا فارغ ہوں، اور زائد از بیس سال سے برطانیہ میں مقیم ہوں۔ میرا وطن حیدر آباد دکن ہے۔ مولانا جب بھی یہاں تشریف لائے ڈاکٹر شمشاد خان صاحب کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب اور محترمہ فریدہ خانم صاحبہ کی خدمات میں سلام عرض ہے۔ فقط والسلام

آپ کا مخلص ڈاکٹر عبد الرب ثاقب، برمنگھم، انگلینڈ

# 200 سے زائد کتابوں اور رسائل کے مصنف

ڈڈلی (پ ر) ڈاکٹر عبد الرب ثاقب ناظم نشر و اشاعت مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ نے معروف سکالر عالمی شہرت یافتہ مفکر مولانا وحید الدین خان کی یاد میں منعقد ایک تعزیتی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا وحید الدین خان 96 سال کی عمر میں دہلی میں دار فانی سے رحلت کر گئے انا للہ و انا الیہ راجعون! وہ ماہانہ ''الرسالہ'' کے مدیر تھے، اور تقریباً پچاس سال سے تن تنہا نکالتے رہے۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص دلچسپی اور کشش تھی، جو قارئین کو اپنا بنا لیتی تھی۔ ان کا میگزین انڈیا میں تقریباً ہر علمی ذوق رکھنے والے افراد کے یہاں موجود رہتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک

ڈائجسٹ کی تھی جس کو ہر مذہب و ہر مسلک کے لوگ شوق سے پڑھتے تھے اور ساتھ ہی انگریزی داں طبقہ کے لیے انگریزی ماہانہ بھی جاری کیا۔

مولانا نے دینی تعلیم کے بعد اپنی ذاتی کوشش سے انگریزی تعلیم حاصل کی جس کا عملی ثبوت ان کی تفسیر قرآن اردو کے ساتھ انگریزی میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ مولانا کے ایک مداح نے ایک ہزار صفحات پر ایک کتاب اوراق حیات تیار کی ہے، جس سے مولانا کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے الرسالہ کا مقصد دعوت الی اللہ قرار دیا اور اس نقطہ نظر سے انہوں نے دو سو سے زیادہ کتابیں اور رسائل تصنیف کیے۔ اللہ تعالی نے انہیں اردو عربی ہندی اور انگریزی میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ مولانا بہت ہی سیدھی سادھی زندگی بسر کرتے تھے تکلفات اور تصنعات سے بالکل بری تھے۔ جب جامعہ دارالسلام عمرآباد چند دن کے لیے تشریف لائے تاکہ جامعہ کے طلباء ان سے براہ راست استفادہ کریں تو اس وقت نائب ناظم جامعہ مولانا ظفر الحق شاکر عمری نے ان کی میزبانی کے لیے کھانوں کی تفصیل معلوم کرنا چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ جو کھانا طلباء کے لیے جامعہ میں پکتا ہے وہی کھانا میں بھی کھاؤں گا۔ اس وقت ناظم جامعہ نے سکھ کا سانس لیا، ورنہ عموماً جامعہ کے طلبا بھی بعض اوقات جب وہ کچھ پڑھ لکھ کر مکی، مدنی، ریاضی، ازہری یا ڈاکٹر انجینئر بن جاتے ہیں تو اپنی سابقہ زندگی کو بھول جاتے ہیں اور نئی ڈشز کی فرمائش کرتے ہیں۔ جب کہ مولانا اتنی بڑی انٹرنیشنل شخصیت ہونے کے باوجود کس طرح ان کی طبیعت میں انکساری اور تواضع تھا۔

مولانا ایک مجتہد تھے جو حق بات ہوتی اس کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ ابھی ایک عرصہ پہلے حکومت ہند نے مسلمانوں کے طلاق کا مسئلہ اٹھایا تو انہوں نے حنفی مکتب فکر کے خلاف اہل حدیثوں کے مطابق فتوی دیا کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینا چاہیے۔ جب کہ اس حق کا اقرار انڈیا میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے نہیں کیا۔ اس اعتبار سے مولانا اپنے مسلک کے خلاف اہلِ حدیثوں کے فتوی کا اعلان کر کے تقلید شخصی کا برملا انکار کیا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کے قلم نے جمہور علماء کے خلاف بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ مگر انہوں نے عام علماء کی طرح بھی مکھی پر مکھی نہیں ماری ہے اور ہم اہل حدیث کسی بھی امام کی جامد تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہر امام سے

غلطی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم ہر امام کا احترام کرتے ہیں، لیکن کسی بھی امام کی سو فیصد تقلید نہیں کرتے، نہ ائمہ اربعہ کی، نہ امام بخاری و مسلم کی، نہ امام ابن تیمیہ کی اور نہ ہی امام البانی کی۔ اس طرح ہم مولانا وحید الدین خان کی تقلید کی بھی دعوت نہیں دیتے ہیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ حدیث کے مطابق حکمت کی بات ایک مسلمان کا گم گشتہ خزانہ ہے وہ جہاں سے بھی ملے اسے لے لینا چاہیے (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2687)۔ سو فیصد اتباع صرف اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو، آپ کے علاوہ کسی کی بھی جائز نہیں ہے۔

مولانا وحید الدین خان ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے اللہ تعالی نے انہیں بے شمار اور ان گنت خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے، بلکہ وہ موحد تھے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ میں شرک کے علاوہ سارے گناہوں کو معاف کر دوں گا (سورہ النساء آیت 48)۔ وہ نہ قبر پرستی کے قائل تھے نہ ہی تعزیہ پرستی کے اور نہ ہی بزرگ پرستی کے قائل تھے۔ ان کی کمی دنیا میں محسوس کی جائے گی، اور ان کو سدا یاد رکھا جائے گا۔ برطانیہ میں مقیم مولانا عبد الہادی العمری، مولانا احمد حفیظ اللہ خان المدنی، مولانا شیر خان جمیل احمد عمری، ڈاکٹر صہیب حسن، مولانا عبد الحق مدنی، محمد فاروق نسیم، مولانا کنور شکیل محمد سلمان اظہر، مولانا عبد الباسط عمری، مولانا محمد ابراہیم میرپوری، حافظ حبیب الرحمن جہلمی، ڈاکٹر شمشاد احمد ڈائریکٹر آئی پی سی آئی برمنگھم، حافظ عبد الاعلی درانی، برادر خالد خان، برادر ثاقب بانی الہجرہ، ڈاکٹر عبد الرب ثاقب اور دیگر حضرات نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

---

تبلیغ والوں کے ساتھ سالانہ چلہ کے لیے نکلا ہوا تھا کہ رات بھائی نے یہ جانکاہ خبر سنائی۔ عصر حاضر میں دعوت دین کا ایک بہت بڑا ستون گرا ہے۔ مولانا سے محبت کا تقاضا یہ ہے ان کی دعوت اور پیامِ امن کو عام کیا جائے۔ (ذکاء اللہ، اسلام آباد)

# مولانا وحیدالدین خان: کچھ یادیں اور باتیں

ظہیر احمد، ایڈیٹر تحریر و تصویر (پاکستان)

1925ء کو اعظم گڑھ اتر پردیش میں پیدا ہونے والے ممتاز اسکالر مولانا وحیدالدین خان 21 اپریل 2021 کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ انہیں 12 اپریل کو کرونا کی تشخیص کے بعد ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ 96 برس کی عمر پانے والے مولانا وحیدالدین خان کو اسلام کے حوالے سے مختلف اپروچ اور طرز فکر کا بانی سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے تقریباً 200 کتابیں لکھیں۔ مولانا وحیدالدین خان کو معاشرے میں امن اور ہم آہنگی کے لیے طویل کوششوں پر بھارت کا دوسرا اعلیٰ ترین شہری اعزاز بھی "پدم وبھوشن" دیا گیا تھا۔ تاہم ان کے ناقدین بابری مسجد کے انہدام اور کچھ دیگر حوالوں سے، ان کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ مگر ان کی علمی فضیلت کو تسلیم کرنے سے انہیں بھی انکار نہیں تھا۔

مولانا وحیدالدین خان کی علمی فضیلت کا اعتراف کرنے والوں میں مسلمان ناقدین کے ساتھ دیگر مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی اور بھارتی صدر رام ناتھ نے بھی تعزیتی پیغامات میں مولانا وحیدالدین خان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انہوں نے زیادہ تر تعلیم اپنے آبائی علاقے کے ایک روایتی مدرسے سے حاصل کی تھی۔ تاہم ان کے انتقال کے بعد پاکستان کے ممتاز اسکالر جاوید احمد غامدی نے جب ٹی وی پر مولانا کے حوالے سے گفتگو کی تو پتہ چلا کہ مولانا امین احسن اصلاحی نہ صرف مولانا وحیدالدین خاں کے استاد رہے تھے بلکہ بعد کے زمانے میں ان کے شاگرد رہنے کا اعزاز جاوید احمد غامدی کو بھی حاصل ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد 1947ء میں وہ جماعت اسلامی انڈیا میں شامل ہو گئے اور 1963ء تک اس کے رکن رہے۔

مولانا وحیدالدین اس عرصے میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ لیکن نظریاتی اختلاف کے سبب، جو اسلام میں سیاست کے حوالے سے تشریح کی بابت ابھرے، وہ جماعت اسلامی سے دور ہو گئے۔ غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب پاکستان میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے مولانا امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر اسرار احمد اور کچھ دیگر اہم شخصیات کے

اختلافات طویل بحث ومباحثوں کے بعد راستوں یا اپروچ کے جدا ہونے کی آبیاری کر رہے تھے۔
مولانا وحید الدین نے 1963ء میں جماعت اسلامی سے جدا ہو کر ”تعبیر کی غلطی“ کے نام سے کتاب لکھی۔جاوید احمد غامدی نے اسے معرکۃ الآرا تصنیف قرار دیا ہے۔

محقق عرفان احمد کے مطابق پہلے انہوں نے جماعت اسلامی انڈیا کے ارکان کو بات چیت کے ذریعہ اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کیا، تو ارکان نے مولانا وحید الدین سے اسے تحریری صورت میں پیش کرنے کو کہا۔ مولانا وحید الدین نے مولانا مودودی کو بھی پاکستان میں اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا جس میں ان کے نظریے پر بھی تنقید کی گئی تھی۔

محقق عرفان احمد لکھتے ہیں، مولانا مودودی نے مولانا وحید الدین کی تنقید کا جواب نہیں دیا بلکہ جواب میں یہ لکھا: ”آپ کا مطالعہ آپ کو ایک سمت میں لے گیا ہے، اس کے برعکس، میرا مطالعہ مجھے دوسری جانب لے گیا ہے، اگر آپ اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ میں نے دین کو مکمل طور پر غلط سمجھا ہے، تو پھر آپ صحیح سمجھتے ہیں اور اس کی مثبت تشہیر کریں، لیکن آپ میری ترجمانی میں غلطیاں ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، آپ اپنی کتاب شائع کر سکتے ہیں“۔

جب مولانا وحید الدین نے مولانا مودودی کو اپنی تنقید پر زور ڈالا تو انھوں نے لکھا: ”آپ کا مکالمہ کرنے کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ جو نکتہ نظر کو قبول نہیں کرتا وہ جاہل اور غیر دانشمند ہے۔“

مولانا وحید الدین نے اعتراف کیا کہ ہوسکتا ہے ان کا انداز سخت ہو، لیکن ان کا واحد مقصد ”حق کی تلاش“ تھا۔

مولانا وحید الدین 200 کتابوں کے مصنف کے علاوہ اعلیٰ درجے کے مفسر قرآن بھی تھے۔

مولانا وحید الدین سے نظریاتی اور سیاسی خیالات سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی علمی فضیلت کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ کلکتہ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر محمد ریاض اگرچہ ان سے اختلاف رکھنے والوں میں تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک عالم تھے، بلاشبہ ایک عظیم عالم۔

سینئر صحافی محمد وجیہ الدین کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے مولانا کے فارمولے کو مسترد کر دیا، کیونکہ بعض لوگ اسے ”ہتھیار ڈالنے“ کی مانند دیکھتے تھے۔ وجیہہ الدین لکھتے ہیں: ان سے ملنا ایسا تھا جیسے ایک صوفی سے، ڈھیلا ڈھالا کرتا پاجامہ، ان کے موٹے شیشے سے جھانکتی نظریں، ان کی پگڑی

اور لمبی سفید داڑھی۔ وہ ایک روایتی شخص کی مانند تھے لیکن ان کے خیالات جدید تھے۔ وہ انتہا پسندی اور مقدس صحیفوں کی قدامت پسند ترجمانی کے خلاف تھے۔

1976ء میں انہوں نے ماہنامہ ''الرسالہ'' کا آغاز کیا۔ یہ جریدہ مکمل طور پر ان کے مضامین پر مشتمل ہوتا تھا اور اردو زبان کی دنیا میں تیزی سے مقبول ہو گیا۔

وجیہہ الدین لکھتے ہیں: مولانا وحید الدین کی موت سے انڈیا اور دنیا، سمجھداری کی بات کرنے والی ایک مضبوط آواز اور امن کا پیغام دینے والے ایک مبلغ سے محروم ہو گئے ہیں۔ امیر جماعت اسلامی ہند سید سعادت اللہ حسینی نے لکھا ہے: مولانا وحید الدین خان کی رحلت سے بہت صدمہ پہنچا۔ مولانا بلاشبہ ان مفکرین میں سے تھے جنہوں نے ہمارے زمانے پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ملک میں مختلف مذہبی فرقوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے اور ان کے درمیان مکالمہ و تبادلہ خیال کی فضا پیدا کرنے میں مولانا کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اسلام کو جدید اسلوب میں اور محکم سائنسی و منطقی دلائل کے ساتھ پیش کرنے کے لیے مولانا کی کوششیں بھی، ان شاء اللہ ان کے لیے صدقہ جاریہ بنیں گی۔

حسینی صاحب نے مولانا وحید الدین کی بعض مشہور کتابوں کا حوالہ دے کر لکھا ہے، مولانا اردو نثر کے ایک بالکل منفرد اور اور بڑے پر کشش اسلوب کے بانی ہیں۔ انتہائی سادہ زبان میں اور بڑے اختصار کے ساتھ گہرے علمی مضامین کو بیان کرنے کا جو اسلوب مولانا نے ایجاد کیا، وہ بلاشبہ ان کا غیر معمولی کمال تھا اور اس نے کئی نسلوں کے اسلوب تحریر پر اثر ڈالا ہے۔ حسینی صاحب نے مولانا کی تحریروں اور ''الرسالہ'' کے مطالعے کے علاوہ ان کے گھر پر ان سے بہت سی یادگار ملاقاتوں میں ان کی شفقت و محبت اور قدردانی سے متاثر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ (اس رپورٹ کی تیاری میں بی بی سی کے نئی دہلی میں نامہ نگار نیاز فاروقی کی رپورٹ 23 اپریل سے مدد لی گئی)۔

پاکستان میں بھی مولانا وحید الدین خاں کے سانحہ ارتحال کی خبر بہت دکھ اور افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ ممتاز صحافی اور سینئر تجزیہ کار مجیب الرحمن شامی نے نہ صرف مولانا وحید الدین کی شخصیت کے حوالے سے جو کالم سپرد قلم کیا، اُس میں انھوں نے اپنے مطالعے کے حوالے سے نہایت عمدہ طریقے پر تاریخ کو سمیٹا ہے۔ شامی صاحب کا کالم بیک وقت روزنامہ ''پاکستان'' اور روزنامہ ''دنیا'' میں چھپا۔ جب کہ ''دنیا'' ٹی وی چینل پر انھوں نے اپنے پروگرام میں جاوید احمد غامدی سے جو گفتگو نشر کی وہ بھی

بہت قابل تعریف تھی۔ مولانا وحید الدین کے حوالے سے گفتگو کے لیے غامدی صاحب سے بہتر شخص ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ''دنیا'' میں خورشید احمد ندیم نے بھی مولانا وحید الدین کے رخصت ہو جانے پر کالم لکھا ہے جب کہ دیگر اخبارات میں بھی ان کی شخصیت پر مضامین اور کالم شائع ہوئے ہیں۔

شامی صاحب سے 23 اپریل کو ٹی وی پر گفتگو میں جاوید احمد غامدی صاحب نے کہا کہ ایک بڑی غیر معمولی شخصیت رخصت ہوگئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شمع ہدایت کی مانند اور اپنے عہد کی منفرد آواز تھے۔ انسانیت کی حقیقت کیا ہے، مذہب کی حقیقت کیا ہے اور خدا کی سچی معرفت کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ یہ ان کا خاص موضوع رہا۔ ان کی ایک ایک تحریر اور ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ دنیا میں جیے تو آخرت کے لیے جیے۔ ان کی یہ خوبصورت فکری تعبیر تھی کہ ہماری زندگی کے ہر معاملے کا رخ آخرت ہونا چاہیے۔ ان کا پیغام آخری وقت تک یہی رہا کہ اپنے ذہن کو مثبت رکھو اور انسانوں کے بارے میں اس طرح سوچو، جس طرح تم اپنے بارے میں سوچتے ہو۔

الرسالہ سے ''تحریر وتصویر'' کا رابطہ کب اور کیسے ہوا

یہ 1991ء کا زمانہ تھا۔ ''تحریر وتصویر'' نے اشاعت کا آغاز اخباری سائز پر کیا تھا۔ چونکہ ''تحریر وتصویر''، فضلی سنز، اردو بازار، کراچی کی پریس میں طارق رحمن کی زیر نگرانی چھپتا تھا، جہاں کی بہت سی خاص باتوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ فضلی سنز ہی نے مولانا وحید الدین خان کی کتابوں کی اشاعت و فروخت کی ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی اور یہیں سے مولانا وحید الدین کے ''الرسالہ'' کی باقاعدگی سے اشاعت اور تقسیم کا اہتمام ہوتا تھا۔ ''تحریر وتصویر'' نے تسلسل سے ''الرسالہ'' کا بلا معاوضہ اشتہار چھاپا اور طارق رحمن بہ اہتمام مجھے ''الرسالہ'' اعزازی دیا کرتے تھے۔ اکثر حیدر آباد (پاکستان) واپسی پر ''الرسالہ'' کا انہماک سے مطالعہ شروع کرتا اور سفر کے اختتام سے قبل ہی پورا کر لیتا۔ چنانچہ میرے پاس تا حال 1990ء سے 1996ء تک کے 70 سے زائد شمارے محفوظ ہیں۔

''الرسالہ'' فروری 1991ء میں شائع ہونے والی مولانا وحید الدین کی تحریر کے ایک حصے کو میں نے ''تحریر وتصویر'' میں اپنے کالم کا موضوع بنایا اور ''جسارت'' میں 1981ء اور 1982ء کے دوران اپنے بیتے حالات کے پس منظر میں اسے ''مولانا وحید الدین کا کلمہ حق'' کے عنوان سے جولائی 1991ء کے شمارے میں شائع کیا۔ میری خوش بختی کہ ایک بار مولانا دہلی جاتے ہوئے کراچی ایر

پورٹ پر کچھ دیر ٹھہرے تو طارق رحمن نے انھیں مجھ سے اور ''تحریر وتصویر'' سے متعارف کرایا، جس کا ذکر انھوں نے غالباً ''الرسالہ'' میں کیا۔ طارق رحمن نے 2007ء میں دہلی جا کر مولانا سے ملاقات کی تصویر بھی ان کے انتقال پُر ملال کی خبر کے ساتھ بھیجی ہے۔''تحریر وتصویر'' جولائی 1991ء کے شمارے سے میرے کالم کا ابتدائی حصہ از سرِنو کمپوزنگ میں ملاحظہ ہو:

ممتاز عالم دین، مفسر قرآن اور ''الرسالہ'' دہلی کے مدیر مولانا وحید الدین خان نے ''الرسالہ'' فروری 1991 کے شمارے میں اپنے دورہ روس کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

سوویت روس کی موجودہ حکومت کا میرے جیسے ایک ''مخالف'' کو اپنے ملک میں بُلانا کوئی سادہ واقعہ نہیں، یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید سیکولرزم کی وہ کون سی خصوصیت ہے، جو اس کو سارے عالم پر غالب کیے ہوئے ہے۔ وہ یہی فراخ دلی اور برداشت ہے۔ مغربی جمہوریت جس کو اب روس اختیار کر رہا ہے وہ موافق اور مخالف کی اصطلاحوں سے اوپر اُٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک مخالف کی پذیرائی کے لیے بھی تیار رہتی ہے۔

اس کی اس صفت نے اس کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔ موجودہ زمانے کے اسلامی اداروں کا حال اس معاملہ میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف اپنے موافق کے لیے جگہ ہے، جس شخص کو وہ اپنا مخالف سمجھ لیں، اس کے سایہ سے بھی وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص اگر کسی اسلامی ادارہ کے ''اکابر'' پر تنقید کر دے تو اس کی تنقید خواہ کتنی ہی علمی اور مدلل کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ شخص اس ادارہ کی نظر میں اتنا مبغوض ہو جائے گا کہ وہ معقول انداز میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتے، کُجا کہ اس کو اپنے ادارہ کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے بُلائیں۔ موجودہ اسلامی اداروں کی یہی کمزوری ہے جس نے ان کو آج کی دنیا میں بالکل بے قیمت بنا دیا ہے۔

اس کا مزید نقصان یہ ہے کہ یہ ادارے سطحی انسانوں کی سرائے بن کر رہ گئے ہیں۔ کم از کم پچھلے پچاس سال کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جس کی آج کی دنیا میں اہمیت ہو۔ زندہ اور اعلیٰ انسان وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کھلی تنقید اور آزادانہ اختلاف رائے کا ماحول ہو۔ ان اداروں میں یہ ماحول سرے سے موجود ہی نہیں پھر وہاں اعلیٰ درجے کے انسان کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

# مولانا وحید الدین خاں

مولانا محمد شمشاد ندوی، جے پور

مولانا وحید الدین خاں کئی روز علیل رہنے کے بعد اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی رحلت کی خبر عام ہوتے ہوتے تعزیتی بیانات آنے شروع ہوئے۔ مولانا اپنے مضامین، تصنیفات اور اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے ہر طبقہ میں متعارف تھے اور برادرانِ وطن میں بھی مقبول تھے۔ ان کا 'الرسالہ' وقت پر پابندی کے ساتھ شائع ہوتا اور اس کے قارئین بے صبری سے اس رسالہ کا انتظار کرتے۔ ان کی تصنیفات میں 'علم جدید کا چیلنج'، 'خاتونِ اسلام' اور ''پیغمبرِ اسلام' وغیرہ اپنے موضوعات پر منفرد اور جامع کتب ہیں جو کئی زبانوں میں شائع ہو کر مشہور و متداول ہو چکی ہیں۔ اسی طرح 'الرسالہ' کے بہت سے مضامین و مقالات نہایت قیمتی ہیں۔ مولانا موصوف اپنی آخری عمر تک اپنے مشن کے لیے وفادار اور یکسو رہے اور ہر کام کو وقت اور پابندی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

مولانا کے منفرد و اچھوتے انداز نے ان کی تحریروں کو پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے ملی نظریات سے اختلاف کے باوجود ان کے کچھ مضامین اور منتخب کتابوں کا مطالعہ وقت کی ضرورت ہے۔

مولانا وحید الدین خان یکم جنوری 1925ء کو بڈھریا، ضلع اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوئے اور یہاں سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد تحریری میدان میں قدم رکھا۔ آپ کی ایک کتاب 'علم جدید کا چیلنج' بہت مشہور ہوئی۔ جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان 'الجمعیۃ' دہلی میں مدیر رہتے ہوئے قیمتی مضامین لکھے۔ دھیرے دھیرے پورے ہندستان میں متعارف ہو گئے اور آپ کے مضامین شوق و دلچسپی سے پڑھے جانے لگے۔ 1976ء میں ماہنامہ 'الرسالہ' جاری کیا جس کو وہ پابندی کے ساتھ شائع کرتے رہے۔ یہ رسالہ بہت شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ مولانا کی تقریباً دو سو کتابیں ہیں جو اردو، عربی، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوئیں۔ مولانا کا ترجمہ قرآن کئی زبانوں میں شائع ہو کر بڑے پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ ان کی کتابیں برائے استفادہ بلا قیمت دی گئیں۔ جے پور لٹریچر فیسٹیول میں بھی ان کی

کتابوں کا اسٹال لگایا جاتا ہے۔ ان کی ایک کتاب 'الاسلام یتحدی' عرب کی یونیورسٹی میں شاملِ نصاب ہے۔ 12 مئی 1989ء میں حکومتِ پاکستان نے ان کی کتاب ''پیغمبرِ انقلاب' (انگریزی) پر پہلا بین الاقوامی انعام دیا۔ حکومتِ ہند کی جانب سے ان کو کئی اعزازات 'پدم بھوشن ایوارڈ'، 'قومی یکجہتی ایوارڈ'، 'قومی اتحاد ایوارڈ'، اور 'قومی شہری اعزاز' دیے گئے۔ اسی طرح 'ڈیمورگس' بین الاقوامی اعزاز'، اردو اکیڈمی اعزاز'، دہلی اعزاز' (دہلی حکومت) سے بھی نوازے گئے۔

مولانا وحید الدین خان کا ترجمہ قرآن اور ان کی کتابیں ان حلقوں میں پہنچ جاتی ہیں جہاں ہمارے علماء و مصنفین کی کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ سخت گیر ہندو تنظیموں و جماعتوں کے اسٹیج پر مولانا مخاطب ہوتے تھے۔ مولانا کا نظریہ تھا کہ ہم نرمی اختیار کر کے ہندستان میں دعوتی کاموں کے لیے سرگرم ہو جائیں اور برادرانِ وطن میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں ہیں ان کا ازالہ کریں۔ اگر ہندستان میں ہندو اور مسلم میں دوریاں بڑھیں گی اور آپسی غلط فہمیاں بڑھیں گی تو ہم دعوتی کام آسانی سے نہیں کرسکیں گے اور مسلمانوں کے لیے حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے۔

مولانا ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد میں حائل رکاوٹیں ختم ہوں۔ ملی مسائل کو صبر و تحمل کے ساتھ حل کرنا چاہتے تھے وہ امن و اتحاد کے ایسے داعی اور مبلغ تھے جو برادرانِ وطن سے خوشگوار و بہتر تعلقات کے لیے ہر سمجھوتہ کو بہتر سمجھتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے نظریات وخیالات کے خلاف مضامین اور کتابیں لکھی گئیں اور مراسلے وتبصرے شائع کیے گئے۔ بہت سے لوگوں نے ہندستان کی تاریخ، ماحول اور حالات میں ان کی اعلانیہ تائید کی۔

---

مولانا وحید الدین خان کی رحلت اہل علم اور اہل خرد کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ کوئی بات تو ہے کہ مسلمان، غیر مسلم، غیر مذہبی سب غم کا اظہار کر رہے ہیں۔ علمائے اسلام کو اس بات پر غور کرنا چاہیے۔ ان کے جیسا بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ (عمیر سالار، پاکستان)

---

تاریخ کو پڑھنے کا نقطۂ نظر یعنی تاریخ کا مطالعہ برائے اپنی اصلاح ان سے سیکھا ہے، اور بھی بہت کچھ ان سے سیکھا ہے۔ (عاطف شہزاد)

# مولانا وحید الدین خاں سے ایک غیر رسمی ملاقات

سہیل ارشد، انڈیا

عظیم اسلامی مفکر مولانا وحید الدین خاں سے ملاقات کی میری دیرینہ خواہش جولائی 2016ء میں پوری ہوئی۔ میں نے ان کے نظام الدین دلّی کے مکان میں ان سے ملاقات کی۔ وہ بالکنی میں میرے ساتھ بیٹھے۔ میرا ارادہ ان سے انٹرویو لینے یا ان سے علمی گفتگو کرنے کا نہیں تھا۔ بلکہ صاف گوئی کا تقاضا یہ ہے کہ میں ان سے علمی گفتگو کا خود متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میرا ارادہ صرف ان جیسی عہد ساز شخصیت سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کا تھا۔

میں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کا رسالہ الرسالہ پڑھا تھا اور دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی طرح ان کے عصری اسلوب سے بہت متاثر تھا۔ لہٰذا قیام دہلی کے دوران میں نے ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے دورانِ گفتگو اپنی ذاتی زندگی سے متعلق تھوڑی بہت گفتگو کی اور مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی مسائل سے متعلق بھی اپنی آراء ظاہر کیں۔ انھوں نے بچوں کی پرورش سے متعلق اپنا طرزِ فکر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے بچوں کو کبھی بے جا لاڈ پیار سے نہیں بگاڑا اور ان کی کبھی ناز برداری نہیں کی۔ ہمیشہ انھیں یہ احساس دلایا کہ انھیں اپنی زندگی اور کیریئر کو بنانے کے لیے خود ہی محنت کرنی ہوگی۔

اکثر مشہور عوامی شخصیات کے بچے اپنے والدین کی مدد اور اثر ورسوخ پر منحصر رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اپنی شہرت اور اثر ورسوخ کی بنا پر ان کا کیرئر بنا دیں یا ان کے مسائل حل کردیں۔ اس وجہ سے ان کے بچے نفسیاتی طور پر کمزور اور اپنے ہر مسئلے کے حل کے لیے اپنے والدین پر منحصر ہوتے ہیں۔ مولانا وحید الدین خاں نے اپنے بچوں کو شروع ہی سے حالات سے خود ہی لڑنے اور اپنی زندگی اور کیرئر کی تعمیر خود ہی کرنے کی نفسیاتی ترغیب دی۔ انھوں نے کہا کہ جب میرا بیٹا بالکل چھوٹا تھا تو کبھی کبھی رات کو بغیر کھائے سو جاتا تھا۔ میری بیوی اس کو جگانے کی کوشش کرتی تھی تاکہ اسے کھلا سکے تو میں ان سے کہتا تھا کہ اسے چھوڑ دو، سونے دو، وہ نہیں کھائے گا تو مر نہیں جائے گا۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں اکثر دنیا کے مختلف ملکوں کا سفر کرتا ہوں۔ اکثر لوگ جب غیر ممالک سے لوٹتے ہیں تو اپنے بچوں کے لیے وہاں سے تحفے لے کر آتے ہیں۔ میں نے کبھی غیر ممالک سے اپنے بچوں کو کچھ لاکر نہیں دیا۔ اس طرزِ عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ آج میرے بیٹے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں اور انھوں نے اپنا کیرئر خود بنایا ہے۔

چونکہ مولانا وحید الدین خاں نے اپنا علمی سفر اردو صحافت سے شروع کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اردو صحافت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اردو صحافت کے معیار سے نالاں تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات مسلمانوں کا جذباتی استحصال کرتے ہیں اور ان کی سماجی اور سیاسی ترقی میں کوئی تعمیری کردار ادا نہیں کرتے۔ اس طرح اردو صحافت زرد صحافت کے زمرے میں آتی ہے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ پوری اردو صحافت ہی زرد صحافت ہے۔ ان کی اس رائے سے ہوسکتا ہے کہ کافی لوگوں کو ناگواری ہو مگر ان کی یہ رائے ان کے ذاتی مشاہدے پر مبنی تھی۔

دورانِ گفتگو اسلامی مدارس کا بھی ذکر آیا۔ وہ ہندستانی مسلمانوں کی ترقی میں مدارس کے کردار سے خوش اور مطمئن نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مدارس ہندستانی مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی میں قابل ذکر کردار ادا کرسکتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ انھوں نے الرسالہ کے ایک شمارے میں مدارس سے متعلق اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کیا تھا۔ (بہ شکریہ اخبارِ مشرق، کولکاتا، 6 جون 2021، صفحہ 6)

---

مولانا کی وفات کی خبر سُن کر ایک شعر یاد آ گیا جو مولانا کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے:

جس کے لیے جیے تھے اُسی سے ہیں جا ملے　　　لاریب ہر وفا کا صلہ پاچکے ہیں ہم!

مولانا وحید الدین ایک ایسے عالم تھے جنھوں نے پوری زندگی امن اور محبت کا پیغام دیا، اور مسلمانوں کے لیے ایک مصلح قوم اور مجدد کا کام کیا (سعید شاہد، کراچی)

---

مولانا نے ساری زندگی امت کے لوگوں کو بڑی بڑی غلطیوں اور فتنوں سے خبردار کرایا اور ہمیشہ حقیقت پسندی کا درس دیا۔ (اسفندیار، اسلام آباد)

# میرے علمی استاد اور رہبر

فاروق عادل، پاکستان

مشہور عالم دین، مذہبی اسکالر، خطے میں امن کے داعی، برصغیر کے عہد ساز مصنف اور دو سو سے زائد کتابوں کے خالق مولانا وحید الدین خان (1925-2021) اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مولانا وحید الدین میرے علمی استاد اور رہبر رہے ہیں، آپ سے عشق کی انتہا تھی، سچ پوچھیے تو جب بھی زندگی سے دل اکتا جاتا تو مولانا صاحب کی کتابیں بہترین معالج ثابت ہوتیں، آپ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر میرے احساسات کی ترجمانی کے لیے مولانا پر 2019 کی ایک پرانی تحریر پیش خدمت ہے۔

(اماں! وہ کتابیں آپ کی امانت ٹھہریں)

یوں تو پچھلے دس سالوں سے میرے گھر میں کتابوں کا آنا ایک معمول بن چکا ہے۔ بسا اوقات کتابوں کی کثرت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ گھر میں اِدھر اُدھر بکھری پڑی نظر آتی تھیں جس سے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ رہائشی گھر نہیں بلکہ لائبریری ہے۔ یہ بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی تھی۔ رات کے پہلے پہر میں کتاب ہاتھ میں تھامے با آواز بلند پڑھ کر امی کو سنا رہا تھا، اور امی بلا کسی نقل وحرکت کے خاموشی سے سن رہی تھیں۔

میں تقریباً ہر کتاب سے باری باری پیراگراف پڑھ کر سنا رہا تھا۔ بالآخر جب میں نے کتاب کو بند کر کے پرے رکھ دیا تب امی نہایت ہی شائستگی سے مجھے یہ تاکید کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ میں یہ انمول کتابیں کہیں پر دینے کے بجائے یہیں گھر ہی میں رکھ دوں۔ امی کی یہ بات سن کر میں کافی حیرت زدہ رہ گیا۔ کیوں کہ آج تک امی نے مجھے کوئی بھی چیز دینے سے منع نہیں کیا تھا اور مگر یہ میں پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔ اسی لیے میں نے بلا توقف یہ بات امی کو بول ہی دیا کہ تعجب ہے آپ آج منع فرما رہے ہیں وہ بھی کتب دینے سے۔ میری بات سن کر جواب میں امی نے مسکراتے ہوئے کہا ہاں یہ کتب یہیں رہنے دو اگر ہو سکے تو انہیں کہیں شفٹ مت کرنا کیوں کہ ان میں کافی زیادہ حکمت اور سبق آموز کلمات درج ہیں۔ امی کے اصرار پر کتابوں کے حوالے سے میں نے اُس گھڑی کوئی حتمی فیصلہ تو نہیں کیا البتہ کتابیں کچھ دن اور گھر میں رکھنے کی ضرور ٹھان لی۔

دراصل یہ کتابیں نامور مذہبی اسکالر اور عصر حاضر کے معروف حقیقت نگار مولانا وحید الدین خان کی تھیں، جنہوں نے اپنے جدید اور روشن خیال طرز اسلوب سے دین اسلام اور زندگی کے ان گنت موضوعات پر 200 سے زائد کتب تحریر کیے ہیں۔علاوہ ازیں علم وفکر کی ترویج و آبیاری کے لیے سن 1976 یعنی 43 سالوں سے ماہنامہ میگزین الرسالہ کا اجراء بھی کررہے ہیں۔آپ کی عمر قریباً 94 سال ہے اوراس وقت انڈیا کی راجدھانی دہلی میں مقیم ہیں۔راقم الحروف نے چند سال قبل مولانا صاحب کے کتب وتخلیقات کا مطالعہ شروع کیا،جس کے بعد سے مولانا صاحب کے فکر وافکار، انداز بیاں اورطرز تحریر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔دوران مطالعہ میں نے مولانا صاحب کو نہ صرف بطورایک مذہبی اسکالر پایا بلکہ ایک مورخ، ایک تحقیق نگار، ایک موٹیویشنل قلم کار، پرسنالٹی ڈیویلپمنٹ،مثبت کردار ساز اور روشن خیال رائٹر کے روپ میں بھی مولانا صاحب مجھ پر آشکار ہوئے۔

مولانا صاحب کی اس بصیرت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا کہ مولانا صاحب کے کتب اگر بنستان پبلک لائبری میں موجود ہوں تو اس سے نہ صرف مطالعے کے شوقین نوجوان بلکہ گورنمنٹ ہائی اسکول بنستان میں زیر تعلیم نوآموز طلباء بھی بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مستفید رہ سکتے ہیں۔اس سوچ اور نظریے کے تحت میں نے مولانا صاحب کی اشاعتی ٹیم سے بذریعہ خطوط رابطہ کر کے بنستان پبلک لائبریری کے لیے کتب عطیہ کرنے کی درخواست کی۔ چند دن گزرنے کے بعد خط کا جواب موصول ہوا جس میں کتابیں عطیہ کرنے کی رضامندی ظاہر کی گئی تھی اور ساتھ ہی میرا پوسٹل ایڈریس بھی طلب کیا گیا تھا۔کچھ عرصے بعد ڈاک خانے سے مجھے کال موصول ہوئی کہ آپ کے نام پارسل آیا ہے جب میں وصولی کے لیے پہنچا تو دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ مولانا صاحب کی کتابوں کا ایک بڑا اور وزنی پارسل موجود تھا،جس میں مولانا صاحب کی کل 34 کتابیں شامل تھیں،جن کی کل قیمت مجموعی طور پر 14700 روپے تھی۔

کتابیں موصول ہونے کے بعد میں نے تحریری طور پر مولانا صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اس امید کے ساتھ کتابیں گھر میں رکھ دیں کہ موقع ملتے ہی انہیں بنستان پبلک لائبریری کے حوالے کردوں گا۔دوسری جانب جب میں نے اپنی والدہ محترمہ کو ان کتابوں کے بارے میں بتایا تو وہ بے حد خوش ہوئیں کیونکہ یہ کتابیں فکشن وادب سے ہٹ کر حکمت و دانائی اور سبق آموزی پر مشتمل تھیں۔

امی کے اس شوق و تجسس کو دیکھتے ہوئے میں یہ کتابیں پڑھ کر امی کو سناتا تھا اور امی سن کر یہ فرمائے بغیر نہ رہتیں کہ یہ انمول کتابیں کہیں پر دینے کے بجائے یہیں گھر ہی میں رکھ دوں۔ امی کی یہ بات سن کر میں کسی نتیجے پر تو نہیں پہنچتا البتہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ ضرور کرتا کہ کتابوں کی ترسیل کچھ دن اور ٹال دوں۔ یہ تسلسل جاری ہی تھا کہ کچھ دن بعد میری اماں اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

اماں کے گزرنے کے بعد جہاں دیگر ان گنت مسئلے سر اٹھائے کھڑے تھے، وہیں ایک مسئلہ ان کتابوں کا بھی تھا جو کچھ دن پہلے میری اور اماں کی صحبت میں رہی تھیں۔ ایک طرف ان کو گھر میں رکھنے کی اماں کی خواہش بے چین کرتی تو دوسری جانب انہیں لائبریری میں جمع کرانے کا وعدہ آڑے آتا۔ ان دو راستوں سے ایک کا انتخاب کرنا کٹھن فیصلہ تھا۔ اس لیے کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا صاحب کی ٹیم کو صورت حال سے مطلع کیا جائے۔ بعد ازاں جو فیصلہ ان کی طرف سے آئے گا وہی حتمی اور قابل قبول مانا جائے گا۔

چنانچہ مولانا صاحب کی ٹیم سے میں رابطہ کیا، اور اپنی صورتِ حال ان کے سامنے بیان کی۔ میری بات سننے کے بعد ٹیم نے اماں کے بلند درجات کے لیے بے شمار دعائیں دی اور یہ فیصلہ صادر کیا کہ کتابیں اماں ہی کے خواہش کی مناسبت سے گھر میں رکھی جائیں۔ مشاورت آنے کے بعد بوجھ کافی ہلکا ہوا وعدہ خلافی بھی نہ ہوئی اور اماں کی خواہش بھی پوری ہوگئی۔ ایک اور کام جو بیچ راہ ادھورا رہ گیا تھا وہ بھی اب پہلے کی طرح جاری وساری ہے۔ یعنی اماں کو یہی کتابیں پڑھ کر سنانا اس مناسبت سے اب تک کم سے کم تین چار کتابیں اماں کو پڑھ کر سنا چکا ہوں اور بقیہ کتابیں بھی پڑھ کر اماں کے گوش گزار کرنے کا مقروض ہوں اور ساتھ ہی یہ عہد کرتا ہوں کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند کرے، اور ان کا پھیلایا ہوا علم ان کے لیے صدقہ جاریہ بنے، آمین۔

---

عظیم مبلغ اسلام، عالم، مصلح اور مصنف مولانا وحید الدین خاں کے سانحۂ ارتحال پر نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے گورنر پنجاب نے کہا کہ اشاعت و تبلیغِ دین کے لیے مولانا کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انھوں نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک عالم کی موت پورے عالم کی موت ہے۔ (@teamSarwar)

# اعظم گڑھ سے نظام الدین ویسٹ براستہ پٹھان کوٹ

عبداللہ طارق سہیل

اسلام کے بے مثال مفسر اور شارح مولانا وحید الدین خان ساڑھے 96 سال کی عمر میں بزم دنیا سے رخصت ہوئے۔ اعظم گڑھ سے شروع ہونے والا سفر براستہ پٹھان کوٹ دہلی کی کالونی نظام الدین ویسٹ میں ختم ہوا۔ ان کی زندگی اور فکر الٰہی تین مقامات کے گرد محور گردش رہی، جغرافی نہیں، روحانی اور عقلی طور پر۔

مولانا کا الرسالہ مشن دنیا کے ہر ملک میں ہے اور ان کا ماہانہ جریدہ الرسالہ اردو اور انگریزی زبانوں میں دنیا کے ہر گوشے میں پڑھا جاتا ہے۔ حلقے کے لوگ اپنے طور پر اس کے تراجم دیگر زبانوں میں بھی کرتے ہیں۔ ہندوستان سے نکلنے والا اور کوئی بھی رسالہ یا ضمیمہ اتنا بڑا دائرہ اشاعت نہیں رکھتا۔ مولانا نے دین کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھوں نے قرآن کا مطالعہ معتقدین کی قیود سے آزاد ہو کر کیا اور دین کی حقیقی تعبیر کے لیے بہت برس جانکاہی کی۔ اسی سفر کے دوران انہوں نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی کہ ان کے خیال میں جماعت ''تعبیر کی غلطی'' کی مرتکب ہوئی تھی۔ وہ اسلامی لحاظ سے ٹھیک نہیں تھی۔ اس ناطے چھپنے والی ان کی کتاب نے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دن بدن مولانا کے حامیوں کی تعداد بڑھی اور خود جماعت کے اندر بھی نظر ثانی کی سوچ پیدا ہوئی لیکن سیاست کے ارتقائی سفر میں واپسی کی راہ نہیں تھی۔

مولانا کی حیرت انگیز کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' ہے۔ ایسے وقت میں جب جدید اسلامی تحریکوں کا طوطی پورے عالم اسلام میں بول رہا تھا اور مراکش سے لے کر جکارتہ تک نئے طالب علم مولانا مودودی، سید قطب اور بدیع الزمان نورسی کی فکر کے اسیر ہو رہے تھے، وحید الدین خان نے اپنے گہرے مطالعہ اور اچھوتی تحریروں سے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

اخوان المسلمون نے مصر میں جو راستہ اختیار کیا، اس سے انھیں یہ موقع نہیں مل پایا کہ وہ نیا راستہ تلاش کر سکے۔ بھارت کی جماعت اسلامی مانے نہ مانے لیکن وہ مولانا مودودی اور

مولانا وحید الدین کے بتائے گئے رستوں پر بیک وقت چل رہی ہے۔

مولانا وحید الدین خان نے امریکہ سے لے کر جاپان تک پورے کرہ ارض میں غیر مسلموں کی سوچ کو بھی متاثر کیا۔ خود بھارت میں ہندو دانشوروں کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے بارے میں اپنا طرز عمل بدلنے پر مجبور ہوئی۔ بھارتی میڈیا بھی ان سے متاثر ہے۔ تجربات نے بتایا ہے کہ جہاں جہاں ان کی حکمت عملی پر عمل کیا گیا، وہاں وہاں ہندو مسلم فسادات میں کمی آئی۔

عشرہ بھر پہلے کی بات ہے، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی جہادی فلسفے کے سحر کا اسیر تھا۔ امریکہ نے آنکھیں بدلیں اور اس کے سرکاری غیر سرکاری راز، دستاویزات اور کتابوں کی شکل میں پے در پے سامنے آنے لگے تو جہاد افغانستان سے لے کر جہاد کشمیر تک سب کی حقیقت کھل گئی۔ پچھتاوے سے زیادہ یہ احساس تکلیف دہ رہا کہ کس طرح ہمیں ''بے وقوف'' بنایا جاتا رہا۔

انہی دنوں مولانا وحید الدین مرحوم کے بعض اینٹی جہاد (بقول ہمارے) مضامین پر اپنے کالم میں سخت تنقید کی اور ایسی تنقید کہ اس میں بے ادبی بھی شامل ہو گئی۔ بہت بار ارادہ کیا کہ ان سے معافی مانگ لوں لیکن تیز رفتار واقعات کے دھارے نے ٹھہر کر سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اب ناگزیر موقع ہے، تو ان کی روح سے معافی کا خواستگار ہوں۔ وہ لامحالہ صحیح تھے اور ہم تو محض بے وقوف بنائے گئے تھے۔ ہم اسے جو سودا bargain سمجھے، یہ وہ نہیں تھا، یہ تو کوئی اور ہی سودا stuff نکلا۔

مولانا وحید الدین نہیں رہے، جاوید غامدی پاکستان چھوڑ گئے۔ پردیس میں ہیں اور عمر بھی اپنے تقاضے لاگو کرتی ہے۔ پہلے جیسا کام شاید اب نہیں کر سکتے۔ ان کی فکر کے ایک وارث صاحب علم ہیں۔ بہت قیمتی کالم لکھتے ہیں۔ وقتی موضوعات پر بھی ان کی تحریریں مستقل قدر رکھتی ہیں، لیکن ان کے حلقے کو زیادہ ضرورت ''الرسالہ'' کی دعوت اور ریسرچ کو آگے بڑھانے کی ہے۔ خدا مولانا وحید الدین کے درجات بلند فرمائے۔ (ڈیلی اردو، پاکستان)

# مولانا وحیدالدین خان انتقال فرما گئے!

ایم ایم ادیب، پاکستان

دو چار یا دس برس کی نہیں یہ برسوں پرانی بات ہے،سن اور سال بھی مجھے یاد نہیں،بس دن یاد ہے کہ اتوار تھا اور میں ایک بہت ہی قریبی دوست کے یہاں بیٹھا گھنٹوں مایوسی کی باتیں کرتا رہا۔اس مونس وغم خوار نے بھی مجھ رنجور کے سارے شکوے، نالے اور فریادیں بھر پور حوصلے اور صبر کے ساتھ سنیں۔ چار پانچ گھنٹوں کی نوحہ گری کے بعد جب میں اٹھا تو اس نے ایک موٹے سے خاکی لفافے میں بند ایک کتاب میرے حوالے کرتے ہوئے کہا''گھر جا کر کھولنا''۔

میں کتاب بغل میں دبائے گھر کی اور روانہ ہوا تو عجیب سا احساس بھی دل و دماغ میں گردش کر رہا تھا کہ آخر کون سی کتاب میرے دوست نے آج مجھے دی ہے کہ جسے اپنے یہاں کھولنے کا یارا بھی نہ دیا۔خیالات کا ایک ہجوم تھا جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا،شاید کوئی عمدہ ناول، یا پھر کہانیوں یا شاعری کا مجموعہ،تاریخ کی کوئی کتاب یا نفسیات پر دھماکہ خیز مواد پر مشتمل کوئی انمول کتاب کیونکہ یہی میری اور اس کی دلچسپی کے موضوعات تھے۔

میں نے چلنے کی رفتار تیز کی اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا گھر پہنچا، بِنا تاخیر لفافہ چاک کیا تو اس میں ایک کتاب تھی''رازِ حیات''از مولانا وحیدالدین خان۔ یہ کیا کتاب ہوئی میں نے بے دلی کے ساتھ حسب عادت دیباچہ پڑھنا شروع کیا۔

''الفرڈ ایڈلر(۱۸۷۰۔۱۹۳۷) موجودہ زمانے کا مشہور نفسیاتی عالم ہے ۔اس کا مخصوص موضوع شخصی نفسیات(Individual Psychology) تھا۔اس کے بارے میں ایک مبصر نے لکھا ہے:

After spending a lifetime studying people and their hidden reserves of power, the great psychologist, Alferd Adler ,declared that one of the wonder-filled characteristcs of human beings is "their power to turn a minus into a plus".

پوری عمر انسان کا اور انسان کی چھپی ہوئی محفوظ قوتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد، عظیم نفسیات

دان الفریڈ اڈلر نے اعلان کیا کہ انسانی شخصیت کی خصوصیات میں سے ایک حیرتناک خصوصیت اس کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک ''نہیں'' کو ایک ''ہے'' میں تبدیل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک انتہائی غیر معمولی صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مذکورہ اقتباس ایک نفسیات کے عالم کی زبان سے اسی کا اعتراف ہے۔ اس کی صلاحیت کی آخری حد یہ ہے کہ انسان تاریکی میں بھی روشنی کا پہلو دیکھ لیتا ہے۔ وہ ناموافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کرسکتا ہے۔ جب اس کی بازی کھوئی گئی ہو اس وقت وہ دوبارہ اپنے لیے نیا میدان تلاش کرلیتا ہے جس میں جدوجہد کرکے ازسرِ نو اپنی منزل پر پہنچ جائے''۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک دینی اسکالر کا ایسا ویژن ہوسکتا ہے کہ وہ زندگی کو ایک نفسیات دان کی آنکھ سے دیکھنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہو اور وہ بھی الفرڈ ایڈلر۔

یہ مولانا وحیدالدینؒ کی کتاب تھی جس نے میرے دل میں دینی اسکالرز کے لیے شرح صدر پیدا کیا، پھر میں نے مولانا وحیدالدین خان کو ہی نہیں، ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ، مولانا مودودیؒ، مولانا اصلاحیؒ، حسن البناؒ، سید قطب شہیدؒ، ڈاکٹر اسرار احمدؒ، علی میاں ندویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور متعدد دینی اسکالرز کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے اسلامک سکالرز ڈاکٹر محمود غازیؒ، مولانا تقی عثمانی، مصباح الدین شکیل، ڈاکٹر خالد علوی، پیر محمد کرم شاہؒ، نعیم صدیقی اور کسی حد تک جاوید غامدی کی کتب کا مطالعہ کیا۔ تاہم اس اظہاریئے یا کالم میں مولانا وحیدالدین خان کا ذکر مطلوب ہے جو 21 اپریل 2021 کو اِس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

مسلم امت کے بہت سارے اسلامی دینی اسکالرز ان کی بہت ساری باتوں سے اختلاف رکھتے ہیں، بہت سارے مسائل ہیں جن کے بارے میں علمائے امت کے تحفظات ہیں۔ مگر یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ انہوں نے تین نسلوں کو اسلامی عقائد و نظریات سے بجا طور پر متاثر کیا۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں نے ان کی تعلیمات سے استفادہ کیا۔ مولاناؒ سائنٹفک سوچ رکھنے والے اسلامک دانشور تھے۔ وہ جتنے زود نویس تھے شاید ہی بیسویں یا اکیسویں صدی کا کوئی اسلامک دانشور ہو جس نے اتنا لکھا ہو۔ ان کی تحریر میں جدت ہی نہیں فکر و نظر کی جولانی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر معنی کا ایک سمندر لیے ہوتے ہیں۔ ان کے ماہانہ جریدے

''الرسالہ'' کے ہر ٹائٹل پر چند الفاظ پر مشتمل ایک جملہ ہوتا ہے، جو اصلاح احوال کی کنجی کی حیثیت رکھتا۔ ان کے انہی جملوں کو یکجا کر دیا جائے تو اقوالِ زریں کی ایک دبیز جلد مرتب ہو جائے گی۔ مارچ 2021ء کے شمارے پر یہ جملہ درج ہے ''اختلافات کے مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے ایک کی پیروی اور سب کا احترام''۔ اسی طرح اپریل کے شمارے کی زینت جو جملہ ہے وہ یہ ہے ''پہلا موقع ملے تو اس کو ضرور استعمال کیجیے، کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ دوسرا موقع اس کو ملے گا یا نہیں''۔

مولانا وحید الدین کا وصف یہ تھا کہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کی سائنسی بنیادوں تک گئے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اسلامی مسئلے کی سائنٹفک بنیادیں تلاش کرتے اور دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے۔ ان کی رائے سے اختلاف کی جراءت کوئی عام نوعیت کا اسکالر نہیں کرسکتا تھا کہ وہ جدید سائنسی نظریات کو اچھی طرح سمجھتے اور ان کی مبادیات کی پرکھ کر کے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔

مولاناؒ کے جہان فانی سے رخصت ہو جانے سے عالم اسلام کا ایک ایسا قلعہ مسمار ہو گیا جہاں سے بے دینی اور الحاد کی یلغار کو پورے جوش وجذبے سے روکا جاتا تھا۔ ان کے ہفتہ وار لکچرز کا سلسلہ تمام ہوا، مگر انہوں نے اسلامی موضوعات پر اتنا وقیع کام کیا جسے یک جا کرنے کے لیے ان کے جتنی عمر چاہیے۔ انڈیا میں ان کی فکر کی وارث ان کی ہونہار بیٹی اور بہت سارے اور لوگ ہیں تو پاکستان میں بھی طارق بدر، سیف اللہ اور بہت سارے اور لوگ ہیں جو اُن کے فکر ونظر کی اشاعت کا کام سالہا سال سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان سب کو لمبی زندگیوں سے نوازے کہ ایک بڑے کام کے لیے بڑی عمر کی ضرورت ہے۔ آمین (ڈیلی اوصاف، پاکستان)

---

جو لوگ جاننا چاہتے ہیں، کہ بغیر کسی پارٹی، جماعت، گروپ، احتجاج یا اجتماع کے کام کس طرح ممکن ہے۔ وہ مولانا وحید الدین صاحب کی زندگی کو دیکھ لیں۔ خاموش سا انسان، صرف قلم و بیان اور محدود وسائل میں آج دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں کو متاثر کر چکے ہیں۔ ان کے فلسفہ عدم تشدد کا آج ہر شخص قائل ہے۔ (حفیظ الرحمٰن، لاہور)

# آہ! مولانا وحید الدّین

نواز خالد عاربی، پاکستان

دس سال قبل پاک پٹن میں تعیناتی کے دوران وہاں مقیم ایک اسکالر، پروفیسر محمد یعقوب بھٹی صاحب سے مسجد میں اتفاقاً ملاقات ہوئی۔ پروفیسر صاحب کی عالمانہ گفتگو سے متاثر ہوکر میں اُنہیں اپنے ساتھ دفتر لے آیا۔ اُن سے مختلف دینی معاملات پر تبادلہ خیال ہوا۔ اگلے دن وہ دوبارہ تشریف لائے اور مجھے ماہنامہ ''تذکیر'' کا ایک شمارہ پڑھنے کو عنایت کیا۔ چوالیس صفحات پر مشتمل شمارہ میں 23 مختلف موضوعات پر بات کی گئی تھی۔ اختصار کے باوجود ہر موضوع سے انصاف کیا گیا تھا۔ میں جوں جوں مطالعہ کرتا گیا، پڑھنے کی خواہش بڑھتی گئی۔ میں نے اس کا اظہار، اگلی ملاقات پر، پروفیسر صاحب سے کیا تو وہ مجھے اُردو اور انگریزی دونوں، زبانوں میں، چند پُرانے رسائل اور کچھ کتابیں مطالعہ کے لیے عنایت کر گئے۔ دو ماہ کے مطالعہ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اسلامی تعلیمات اور ہماری معاشرتی سوچ اور زندگی کو کتنا جدا جدا کر کے دیکھا جاتا ہے۔ میری تو جیسے کایا ہی پلٹ گئی اور سوچ کا زاویہ یکسر بدل گیا۔ معاملہ فہمی آسان ہوگئی۔ میں جو بات بات پر جھگڑ پڑتا تھا یا غصّہ میں آجاتا تھا۔ اب صلح پسندی اور نرم گفتاری کی طرف مائل ہو گیا۔ پہلے دوسرے کو شکست دینے کو فتح سمجھتا تھا، اب دوسرے کی شکست کو اپنی شکست سمجھنے لگا۔ تاہم ایک دُکھ بھی تھا کہ اتنی مثبت تبدیلی کا سامان بہت تاخیر سے ہوا۔

متذکرہ کتابیں اور رسالے مولانا وحید الدّینؒ کی تصانیف و تالیف تھیں۔ مولانا وحید الدّینؒ 1925ء میں ضلع اعظم گڑھ، بھارت میں پیدا ہوئے اور 21 اپریل 2021 کو کورونا کا شکار ہو کر رحلت فرما گئے۔ اپنی چھیانوے برس کی مطالعاتی، تحقیقی، تالیفی و تصنیفی مشقت سے لبریز زندگی میں جو کارہائے نمایاں انہوں نے سرانجام دیے، تاریخ اسلام میں ایک مثال رہے گی۔ آپ نے ''الرسالہ'' کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کیا، جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی فکری اصلاح تھی۔ دیگر اقدامات کے علاوہ اس تحریک کے تحت اُردو اور انگریزی میں الگ الگ ماہوار رسالوں کا اجرا

کیا، جن کے مستقل قارئین کی تعداد کسی بھی مذہبی رسالے کے قارئین سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ نے کل 253 کتب تصنیف کیں، جن میں سے 92 انگریزی میں، 142 اُردو میں اور 19 ہندی زبان میں شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں پوری دنیا میں بین المذہبی اجتماعات میں اسلام کی بھرپور نمائندگی کی۔ پندرہ سال جماعتِ اسلامی سے وابستہ رہے۔ تاہم بانئ جماعت کے ساتھ کچھ فکری پہلوؤں کی تعبیر میں اختلاف پر 1962ء میں علیحدگی اختیار کرلی۔ آپ کے علمی اور فکری مقام سے ہر مذہب کے پیروکار معترف ہیں۔ آپ کی دو جلدوں پر مشتمل تفسیر ''تذکیر القرآن'' قرآن فہمی کی تڑپ رکھنے والوں کے لیے بہت بڑا خزینہ ہے۔

مولانا وحید الدّینؒ کے نزدیک مسلمانوں کے دگرگوں حالات کی وجہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر مبارزتی روّیہ ہے۔ وہ ہر مشکل صورت حال کو چیلنج کے طور پر لینے کی بجائے مسئلہ کے طور پر لیتے ہیں۔ اِس لیے مناسب حل کی طرف رخ نہیں کر پاتے۔ آپ نے صلح حدیبیہ کو مسلمانوں کے لیے آگے بڑھنے کی تقلیدی بنیاد قرار دیا ہے۔ جہاں نبی اکرم نے مبارزت کا راستہ چھوڑ کر حکمت عملی کے تحت اپنے ذرائع اور اپنے رُفقاء کی زندگیوں کو آگ میں جھونکنے سے بچالیا اور اپنی خاطر جمع کر کے فتح مکہ تک رسائی حاصل کی۔ رسولِ پاکؐ اگر صحابہ کرام کی جذباتیت کا احترام کر جاتے تو شاید حالات مختلف ہوتے، مگر آپؐ نے اُمت مسلمہ کے لیے صبر و برداشت سے منزل تک پہنچنے کا درس چھوڑا۔

مولانا وحید الدّینؒ فرماتے ہیں کہ جاپان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس پر تاریخِ انسانی میں سب سے بڑا ظلم ہوا، جنگِ عظیم دوئم کے دوران، 1945ء میں، امریکہ نے جاپان پر دو ایٹم بم گرائے اور جاپان کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا، جس کے اثرات ہیروشیما اور ناگاساکی کے باسیوں پر آج بھی دِکھائی دیتے ہیں، مگر جاپان نے اس تباہی کو ایک ''مسئلہ'' کے طور پر لینے کی بجائے، چیلنج کے طور پر لیا اور اپنے تعلمی اداروں کی اصلاح کر کے ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی وہ تمام منازل طے کیں جو تکنیکی اور مقابلہ جاتی دنیا میں باعزت وجود کے لیے لازم تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج جاپان سرمائے کے لحاظ سے دنیا کی تیسری بڑی طاقت ہے اور جی ڈی پی کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اگر جاپان کی جگہ کوئی اور مسلمان ملک ہوتا تو اس کے باسی امریکہ کی طرف منہ کر کے غُلیلوں سے پتھر پھینک رہے ہوتے۔ مولانا وحید الدّینؒ کے بقول چونکہ جاپان نے صلح حدیبیہ کی روح سے

استفادہ کیا ہے، لہٰذا آج دشمن کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہے، جو اُس سے معاشی میدان میں رعایتیں مانگ رہا ہے۔

مولانا وحید الدینؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کا پہلا سبق اقرأ، یعنی حصولِ تعلیم کے گرد گھومتا ہے۔ قرآن پاک میں اسی لیے جا بجا تعلیم اور فکر کی دعوت دی گئی ہے، مگر صد افسوس کہ آج مسلمان تعلیم کے مقام میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جس وقت ''اقرأ'' کی وحی نازل ہوئی، اُس وقت عرب کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات ناگفتہ بہ تھے۔ لوٹ مار، غارت گری اور ہر معاملے میں مبارزت کا دور دورہ تھا، لیکن رَب العزّت نے ''اقرأ'' کا حکم دے کر باور کرایا کہ تعلیم سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جنگِ بدر میں فتح کی صُورت میں جو دشمن جنگی قیدی بنائے گئے، اُنہیں رسولِ پاکؐ نے مسئلہ کے طور پر نہیں لیا، بلکہ موقع کے طور پر لیا اور ہر قیدی کو اپنی آزادی کے عوض دس دس مسلمانوں کو تعلیم دینے پر مامور کیا (مسند احمد، حدیث نمبر 2216)۔ یہاں یہ بات توجّہ طلب ہے کہ اُن دشمنوں نے صحابہ کرام کو دین نہیں سکھانا تھا، بلکہ زبان دانی اور کسبِ ہُنر کی تعلیم دینی تھی۔ مولانا وحید الدّین کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ اجتہاد جو دین کی روح تھا، عنقا ہو گیا ہے۔ تمام مسلمان رہنماؤں نے انتہائی نادانی کے تحت مسلمانوں کے جذبات کو تخریب کی طرف موڑ دیا ہے۔ لوگ قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہے ہیں مگر قرآن سے بے خبر ہیں۔ لوگ اپنے جلسوں کا آغاز تو قرآن سے کرتے ہیں مگر وہ صرف رسمی تبرّک کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ اس سے رہنمائی لینے کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک کے چرچا کے باوجود قرآن پاک کا فائدہ لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ مولانا وحید الدین خاں کا وصال امن کے سفیر کا وصال ہے۔ (dailypakistan.com.pk)

---

لاہور (نمائندہ خصوصی): وزیر اعلیٰ پنجاب سردار عثمان بزدار نے معروف اسلامی اسکالر، مصنف، قرآن مجید کے مترجم مولانا وحید الدین خان کے انتقال پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وزیر اعلی عثمان بزدار نے سوگوار خاندان سے دلی ہمدردی و اظہار تعزیت کیا ہے۔ وزیر اعلی عثمان بزدار نے کہا کہ مولانا وحید الدین خان مرحوم کی دینی خدمات کو تا دیر یاد رکھا جائے گا۔ (ڈیلی پاکستان، 23 اپریل 2021)

# دبستانِ شبلی کی ایک اہم شخصیت

گل رحمان ہمدرد، باچا خان یونیورسٹی، کے پی کے، پاکستان

ابھی ابھی یہ افسوس ناک خبر ملی کہ ہندوستان کے نامور دینی اسکالر مولانا وحیدالدین خاں انتقال کر گئے ہیں۔ وحیدالدین خاں یکم جنوری، 1925ء کو اعظم گڑھ، اتر پردیش بھارت میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ میں علم کی تحصیل کی جہاں پر وہ مولانا امین احسن اصلاحی سے براہ راست فیضیاب ہوئے۔ بعد میں وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے اور ایک عرصہ تک اس جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے۔ 1960 کے لگ بھگ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ مولانا مودودی کی فکر میں خوفناک خلا موجود ہے جو اسلام کے مستقبل کے لیے تباہ کن ہے۔ چنانچہ انہوں نے ''تعبیر کی غلطی'' کے نام سے وہ مشہور کتاب لکھی جس میں فکر مودودی کی بنیادی غلطی انتہائی محکم دلائل سے واضح کی۔ اہل علم کے نزدیک یہی کتاب ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی دیگر کتابیں حقیقت میں اسی کتاب کی شرح ہیں۔

آپ کی تحریریں بلاتفریق مذہب و نسل مطالعہ کی جاتی رہیں۔ مولانا وحیدالدین خاں تشدد کے بجائے امن کے داعی تھے۔ مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اسلام کے متعلق غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کرنا، مسلمانوں میں مدعو قوم (غیر مسلموں) کی ایذا وتکلیف پر یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی تعلیم کو عام کرنا، ان کا مشن رہا۔

بیسویں صدی کے جذباتی اور جہادی ماحول میں ان کی فکر کو خاص پذیرائی نہ مل سکی تھی۔ لیکن جوں ہی اکیسویں صدی نے اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا اور مسلمان اپنی انتہا پسندانہ طرزِ عمل کی وجہ سے دنیا بھر میں مشکلات کا شکار ہوئے تو دھیرے دھیرے مسلمانوں کے اہل دانش وحیدالدین خان کے منہج اور فکر کے قائل ہوتے چلے گئے۔ اس کے بعد وہ بلا مبالغہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ عام طالب علموں کے ساتھ ساتھ غامدی، خضر یاسین اور راشد شاز جیسے اعلیٰ پائے کے دینی اسکالرز کی فکر پر بھی ان کی فکر نے اثرات ڈالے۔

خان کی فکر اپنے باطن میں تصوف کے عناصر رکھتی تھی۔اس لیے میرے لیے ہمیشہ ان کی فکر میں کشش رہی۔ کچھ عرصہ قبل ایک اسکالر دوست نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا وحیدالدین خان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔میں نے کہا کہ وحیدالدین خان کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ وہ مزاجاً تصوف کا آدمی تھا۔اس طرح کے گہرے غوروفکر کا آدمی اگر تصوف میں ہوتا تو علی ابن عثمان ہجویری، خواجہ نظام الدین اولیاء اور خواجہ معین الدین اجمیری کے برابر کا مقام پاتا۔خان کی دعوت کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ عرفانِ نفس و باطن کی تحریک ہے۔طریق کار بھی صوفیوں کا ہی ہے یعنی امن، محبت اور دعوت و مکالمہ۔

ابوالکلام آزاد کے بعد وحیدالدین خان ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی فکری مسیحا تھے۔ہر موقع پر انھوں نے مسلمانوں کی درست رہنمائی کی اور جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کی تلقین کی۔وہ جلال الدین رومی کے اس فلسفہ پر کامل یقین رکھتے تھے کہ دلیل کی تلوار لوہے کی تلوار سے زیادہ کارگر ہے۔مسلمانوں کو اب بھی ان کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔ان کی وفات مسلمانانِ عالم کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

---

میں مولانا کی کتاب اللہ اکبر پڑھ رہا ہوں رمضان میں..... مجھے اب پتہ چلا کہ اللہ سے محبت اور عقیدت کیسے ہوتی ہے۔(نجم الدین، اسلام آباد)

---

بلاشبہ مولانا صاحب اپنے حصے کا کام پوری دیانت داری اور محنت سے سرانجام دیتے رہے۔ان کی فکر آخرت کے لیے تھی اور معرفت خدا کے لیے تھی۔یہ مسلسل مشق ہے جو جاری رہنا چاہیے۔کیوں کہ یہ وہ سفر ہے جو قیامت کے دن تک جاری رہے گا۔
(چودھری سلمان، پاکستان)

# رازِ حیات کے مصنف

ساجد بھٹو، سندھ

کل رات بہت دکھ ہوا اور آنسو آ گئے جب معلوم ہوا کہ اکیسویں صدی کے ایک عظیم اسکالر، کروڑوں لوگوں کی زندگی بدلنے والی مشہور زمانہ کتاب ''رازِ حیات'' سمیت دو سو سے زائد کتب کے مصنف، کروڑوں لوگوں کے آئیڈیل انسان، مذہب کا صحیح معنوں میں پرچار کرنے والے اور انسانیت کا درد رکھنے والے جید عالم مولانا وحید الدین صاحب دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔

میں مولانا صاحب کی مثبت اور فراخ سوچ سے متاثر تھا جو اپنی کتب میں مغرب کی مثالیں دے کر ساتھ قرآن وحدیث کا حوالہ دے کر بات واضح کرتے تھے۔ ان میں کوئی مذہبی تعصب نہیں تھا۔ دو سال پہلے مجھے مولانا صاحب کے آفس کا واٹس ایپ نمبر ملا تو میں نے کہا یا تو میری بات کروا دیں یا میرا ایک وائس میسج مولانا تک پہنچا دیں تو میں نے وائس میسج میں بتایا کہ میرے مذہبی نظریات ایسے ہیں وغیرہ تو میرے لیے دعا کریں اور ایک وائس میسج لازمی کریں۔

خیر میری خوش قسمتی کہ مجھے ایک ماہ کے اندر ہی اس حافظ صاحب کا میسج ملا کہ یہ مولانا صاحب کا وائس میسج جو صرف آپ کے لیے ہے۔ وہ وائس میسج میں نے مختلف گروپس میں بھی شیئر کیا تھا جس میں اپنی مخصوص آواز سے دنیا و آخرت کے لیے دعائیں تھیں کہ بیٹا آپ کا میسج ملا تھا اور شکریہ بھی کیا۔ اور علم میں اضافہ کی دعا بھی دی۔

تب مجھے ایسے لگا جیسے کوئی قیمتی خزانہ مل گیا ہو لیکن مولانا صاحب کی وفات کا سنا تو بہت شدید دکھ ہوا۔ مجھے کم وبیش دو سال جب تک میرا موبائل ٹھیک رہا ان کا رسالہ ملتا رہا اور مولانا صاحب کی ویڈیوز بھی مسلسل آتی رہیں۔ عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جن کا مشن انسانیت کی بھلائی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جن کی وجہ سے دنیا روشن ہوتی ہے۔

سچ ہے کہ آج یا کل ہم سب کو اس دنیا سے رخصت ہو کر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا صاحب کے درجات بلند کرے آمین۔

# بزم ہستی کو سوگوار کر گئے

## ڈاکٹر سید طفیل ہاشمی، اسلام آباد، پاکستان

مولانا سے پہلا تعارف 1973 میں ہوا، جب ایم اے علوم اسلامیہ کے دوران ان کی تالیف علم جدید کا چیلنج پڑھی، جو بعد میں مختلف نام اور تدوین جدید سے شائع ہوتی رہی۔ اس کے بعد شاید جماعت اسلامی کے کسی دوست نے یہ دیکھ کر کہا کہ میں نے مولانا مودودی کو بالاستیعاب پڑھ رکھا ہے، ان کی دوسری کتاب ''تعبیر کی غلطی'' سے متعارف کرایا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک بڑے اسکالر کے اندر امام شاطبی کی طرح ایک بے لچک مولوی بھی چھپا بیٹھا ہے۔ تاہم میں نے مولانا مودودی اور خان صاحب کے اختلاف کو ہمیشہ دو مختلف مما لک کے حالات اور سماج کے تناظر میں اسلام کی قابل عمل تعبیر سمجھا۔ یہ حق و باطل کا اختلاف نہیں تھا، بلکہ ابن قیم کی تعبیر کے مطابق تغیر الاحکام بتغیر الزمان کا نمونہ تھا۔ مولانا کی ''کتاب معرفت'' اس وقت بھی میرے سائیڈ ٹیبل پر موجود ہے اور تازہ تالیف ''خدا کی دریافت'' ٹیبلٹ کے ڈراپ باکس میں۔

برصغیر کی روایتی فکر سے مولانا نے علمی اور عقلی دلائل کی بنیاد پر کئی مسائل میں اختلاف کیا لیکن میرے خیال میں روایتی فکر کا تعلق فکری ارتقا کے تاریخی مراحل سے ہے جب کہ مولانا اسلام کے آفاقی پیغام کو اس کے وسیع تناظر میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچانے اور ان کے لیے قابل فہم بنانے کے داعی تھے۔ ان کی فکر کا بنیادی نکتہ ''دعوت الی اللہ'' تھا۔ ان کے خیال میں ساری انسانیت رسول اکرم کی امت دعوت ہے اور مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دعوت دین کے لیے وقف کر دیں۔

طالبانِ علم کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی بڑے صاحبِ علم کے تفردات کی وجہ سے اس کے افکار، تخلیقیت اور مناہج سے خود کو محروم رکھیں۔ عالم اسلام ایک بڑے داعی سے محروم ہو گیا۔

---

سب کو دنیا سے ایسے ہی جانا ہے لیکن خوش قسمت ہے وہ شخص جو اپنے رب کے اصولوں پر زندگی بسر کرے اور ربّ العالمین کا ساتھی بنے۔ (سعید الرحمن، فیصل آباد)

# مولانا وحید الدین خاں: تین ملاقاتیں اور کچھ باتیں

آصف تنویر تیمی

مولانا وحید الدین بین الاقوامی شہرت کے حامل عالم دین تھے۔ مولانا پر لکھنا یا ان کو سمجھنا بہت آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی علمی اور دعوتی سرگرمیاں پورے سو سال پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ چند صفحات یا چند سطروں میں لکھ کر ان کا حق ادا کر دے گا تو میرے خیال میں یہ خام خیالی ہے۔ خود مولانا کی زندگی میں ان سے تعلق اور عقیدت رکھنے والے شاہ عمران حسن نے اوراق حیات کے نام سے جو کتاب لکھی وہ نو سو تراسی (۹۸۳) صفحات پر مشتمل ہے۔

شاہ عمران آغاز کلام میں لکھتے ہیں: مولانا وحید الدین خان کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو ہندوستان کے ایک علمی شہر اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم عربی درس گاہ میں ہوئی۔ عربی اور دینی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے علوم جدیدہ کی طرف توجہ دی۔ اولاً ذاتی مطالعہ کے ذریعہ انھوں نے انگریزی زبان سیکھی۔ اس کے بعد سائنسی علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ حتی کہ ان میں پوری دست گاہ حاصل کرلی۔ اسلامیات اور مغربیات دونوں قسم کے علوم سے بخوبی واقفیت حاصل کرنے کے بعد مولانا اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس دور میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ جدید سائنسی دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جائے اور عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ اور پھر وہ اس مہم میں لگ گئے۔ یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مولانا موصوف کے مطالعہ کا خاص موضوع اسلام اور دور جدید ہے۔ (اوراقِ حیات، صفحہ 15)

مولانا موصوف خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں: میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں۔ میری بیشتر زندگی تنہائی میں گزری ہے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے میرا تعلق اس نسل سے ہے جس کو ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندوستان کو سن شعور میں دیکھنے کا موقع ملا۔ جب میں نے مولانا حسین احمد مدنی، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں کی تقریریں اس وقت سنیں، جب کہ ہندوستان کی آزادی ابھی بہت دور دکھائی دے رہی تھی، جس نے ۱۹۳۶ء کے پہلے الیکشن کو براہ راست دیکھا، جس نے

1947ء سے پہلے بابری مسجد (ایودھیا) میں داخل ہوکر وہاں نماز پڑھی — براہ راست اور بالواسطہ مشاہدہ کی یہ مدت تقریباً ۱۰۰ سال کے دائرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس طویل مدت میں، میں نے جو کچھ دیکھا اور پڑھا اور جانا وہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' (اوراق حیات، ص ۳۵)

مولانا زمین دار اور پڑھے لکھے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام فریدالدین خان تھا۔ ان کا انتقال اس وقت ہوا جب مولانا موصوف کی عمر پانچ (5) سال کے قریب تھی۔ والد کے انتقال کے بعد جب مولانا کے گھر کے حالات بدل گئے۔ ان کے جد امجد حسن خان ریاست سوات (جواب پاکستان کا حصہ ہے) سے ہجرت کر کے اعظم گڑھ آئے تھے۔ مولانا کے خاندان میں علماء تو نہیں مگر ادباء ضرور تھے، بالخصوص اقبال احمد خان سہیل، جو مولانا کے چچا زاد بھائی اور ممتاز شاعر، وکیل اور سیاست دان کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ مولانا نے مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں اس وقت کے ماہرین علم وفن سے کسب فیض کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی کا نام قابل ذکر ہے۔ آپ نے عربی میں مہارت کے لیے مولانا حمیدالدین فراہی اور اردو میں کمال کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں پڑھیں۔ مگر ان دونوں کے سیاسی سوچ سے آپ کبھی مطمئن نہ ہوئے۔

اس میں دورائے نہیں کہ ملک و بیرون ملک میں آپ کو شہرت آپ کے قلم ومنفرد اسلوب کی وجہ سے ملی۔ مختلف اداروں سے منسلک ہوکر کام کرنے کی کوشش کی مگر بہت دنوں تک آپ کا مزاج ساتھ نہ دیا جس کی وجہ سے اپنی راہ خود متعین کی اور خود ادارہ بن گئے۔

نئی دلی کے نظام الدین ویسٹ کالونی کو مستقل رہائش گاہ بنایا۔ ملت اسلامیہ کی بھی خدمات یہیں نظام الدین سے انجام دینی شروع کیں۔ لوگوں کی دینی وفکری رہنمائی، تالیف وترجمہ، اردو اور انگریزی زبان میں الرسالہ کی نشر واشاعت اور ملک و بیرون ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی مولانا کی زندگی کے چند نمایاں پہلو تھے۔

مولانا وحیدالدین خان نے تقریباً ایک صدی تک کسی نہ کسی طرح اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ ان کے کچھ خاص دینی وسیاسی افکار ونظریات کی وجہ سے علماء نے ان کی گرفت بھی کی۔ ان کو مورد الزامات بھی ٹھہرایا۔ مگر وہ کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنی راہ چلتے رہے۔ انھوں نے اپنے افکار و

خیالات کا مخاطب ہمیشہ پڑھے لکھے برادرانِ وطن کو سمجھا جن کی بڑی تعداد ان کے دروس اور محاضرات میں شامل ہوتی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ ہم اکثریت سے لڑجھگڑ کر انھیں اپنے دین کی طرف نہیں لاسکتے، ان کو دین سے جوڑنے اور ان کے دل کو اسلام کے لیے نرم کرنے کا واحد ذریعہ انسانی اخوت وبھائی چارہ اور مثبت فکر وخیال ہے۔ اور اسی اصول پر وہ پوری زندگی ڈٹے رہے اور غیر مسلموں کی ایک بڑی جماعت کو اسلام کی تعلیمات سے متعارف کیا۔

میں نے سب سے پہلے مولانا کو ان کی کتابوں اور تحریروں کی وجہ سے جانا۔ جامعہ امام ابن تیمیہ کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو بلا کسی تعصب اور تنگ نظری کے ہر ذی علم سے استفادے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ میری طالب علمی کے زمانے میں طلبہ کی لائبریری میں بہت سارے مشاہیر اہل علم کی اردو کتابیں لائی گئیں۔ جن میں درجنوں کتابیں مولانا مرحوم کی بھی تھیں۔ مطالعے کا شوق تھا۔ چنانچہ میں نے اسی زمانے میں مولانا کی موجودہ تمام کتابوں کا مطالعہ کیا۔ حالانکہ میرے بعض مخلص اساتذہ نے چھوٹی کلاس میں ان کی بعض کتابوں کے پڑھنے سے روکا بھی، مگر زبان وبیان کی سلاست کی وجہ سے بلا کسی کی سنے پڑھتا گیا۔ اور جہاں ضروری سمجھا اگرچہ کتابیں اپنی نہ تھیں مگر نشانات ضرور لگائے کہ میں مولانا کی اس بات سے اتفاق نہیں رکھتا۔ آج بھی میری مطالعہ کردہ کتابیں ان باتوں کی گواہ ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے متعدد بار براہ راست مولانا سے ملنے ملانے کا موقع دیا۔

مولانا صاحب سے میری ملاقات تین دفعہ ہوئی۔ پہلی دفعہ جامعہ امام ابن تیمیہ میں جب وہ بہار کا دورہ کرتے کرتے شام میں جامعہ پہنچے۔ جامعہ میں بعد نمازِ مغرب ان کا خطاب ہوا۔ بڑے صاف ستھرے انداز میں انھوں نے منہج سلف پر گفتگو کی۔ اپنے کو بھی پاسبان سلف میں شمار کیا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی علمی وعملی زندگی کی بڑی ستائش کی۔ طلبہ، اساتذہ اور دیگر حاضرین نے ان کے خطاب سے بھرپور استفادہ کیا۔ میری دوسری اور تیسری ملاقات ان سے ان کی رہائش گاہ نظام الدین ویسٹ، دہلی میں ایک عرب مہمان شیخ بدر العیدان کے ہمراہ ہوئی۔ شیخ بدر کی شدید خواہش تھی کہ وہ مولانا صاحب سے ملیں۔ مرکزی جمعیت کے ذمہ داران نے شیخ بدر کو میرے ساتھ لگا دیا کہ میں انھیں مولانا سے ملا دوں۔ نظام الدین تو میں جانتا تھا مگر نظام الدین میں مولانا کا گھر کہاں ہے

اس سے میں بالکل واقف نہ تھا۔ خیر تلاش بسیار کے بعد ہم دونوں مولانا کے گھر پہنچ گئے۔ گھر کے اندر آنے کی اجازت بھی ملی۔

مولانا صاحب اپنے گھر کی پہلی منزل پر لائبریری میں تشریف فرما تھے۔ کشادہ گھر، چاروں طرف سے الماریوں میں کتابیں تھیں۔ شیخ بدر نے مولانا موصوف سے مختلف علمی، عالمی اور سیاسی سوالات کیے، مولانا نے سب کا جواب دیا۔ ساتھ ہی مولانا نے اپنی عربی وار دو کتابوں کا تعارف بھی مہمان سے کرایا۔ یہ غالباً ۲۰۰۷ء کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر اسی کے پار تھی۔ پھر بھی لکھنے پڑھنے اور بولنے میں کسی قسم کی ان کو کوئی پریشانی نہ تھی۔ اللہ نے مولانا کو لمبی عمر کے ساتھ صحت وتندرستی سے بھی نوازا تھا۔ مولانا نے چائے وغیرہ سے ہم لوگوں کی ضیافت کی۔ شاید ظہر یا عصر کی نماز کا وقت بھی ان ہی کے گھر میں ہو گیا۔ اسی لائبریری میں ہم لوگوں نے باجماعت نماز ادا کی۔ مَردوں کے ساتھ ان کے گھر کی خواتین نے بھی ہم لوگوں کے پیچھے نماز باجماعت ادا کی۔ اور اس طرح چند ساعات ملنے ملانے کے بعد ہم دونوں رخصت ہو گئے۔ جب سیڑھی سے اترے تو دیکھا کہ ٹیلی ویژن والے نیچے مولانا کا انٹرویو لینے کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔ دوسری ملاقات بھی چند دنوں کے بعد شیخ بدر ہی کے ساتھ ان کے گھر نظام الدین میں ہوئی۔ اس دفعہ ہم نے ان کے مکتبہ گڈ ورڈ سے چھ کتابیں بھی خریدیں۔

تینوں ملاقات میں میں نے یہ اندازہ لگایا کہ آپ ایک درویش صفت انسان ہیں۔ آپ کی زندگی کا خلاصہ دعوت وتبلیغ اور تالیف وتصنیف ہے۔ تمام تر دنیاوی مال وجاہ اور سیاسی اثر ورسوخ کے باوجود آپ نہایت سادگی پسند ہیں۔ آپ کے پاس چند جوڑے کرتے پاجامے تھے۔ جو وہیں لائبریری کے ایک کونے میں پڑے رہتے تھے۔ کپڑے تو صاف ہوتے تھے مگر کبھی ان کپڑوں پر استری نہیں پڑتی تھی۔ آج ہمارے علماء میں یہ سادگی مفقود ہے۔ سارا زور ظاہری خوبصورتی پر ہوتا ہے۔ علمی یا عملی خوبصورتی ہو یا نہ ہو۔ ہم مولانا سے فکری ونظری اختلاف کے باوجود ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا انکار نہیں کر سکتے۔ آپ کی اردو، ہندی، انگریزی اور عربی تصنیفات کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ان میں درجنوں کتابیں ہیں جنھیں کچھ احتیاط کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

https://thefreelancer.co.in/?p=9676

# وحیدالدین خان کا احسان

فاروق عادل، پاکستان

مولانا وحیدالدین خان کو ہماری نسل نے تب جانا جب ان کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ مولانا وحید الدین خاں سے میرا تعارف ان کے ماہنامہ 'الرسالہ' کے ذریعے ہوا۔ ہلکے رنگوں کے سرورق اور پینتیس چالیس صفحات کا یہ پرچہ کوئی الگ ہی چیز تھی۔ ایک ایک، پونے پونے یا آدھے آدھے صفحے کی تحریریں ہوتیں، کچھ ایسی بے ساختگی سے شروع ہوتیں جیسے ہم سانس لیتے ہیں، یا بہت سی میٹھی اور ذرا سی نمکین شکنجبین کا ایک فرحت بخش گھونٹ جو روح میں تازگی پیدا کردے اور انسان سوچے کہ وہ اپنے رب کی کس کس نعمت کا شکر ادا کر پائے گا؟ یہ پرچہ بھی اللہ کی ایک ایسی ہی نعمت تھا۔

ہماری نسل کئی اعتبار سے خوش قسمت رہی ہے۔ اس خوش قسمتی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں نے اقبالؒ جیسے دیو قامت فلسفی، ابوالکلام جیسے مشکل پسند مصنف اور ابوالاعلیٰ جیسے سنجیدہ اور مشنری بزرگوں کے سامنے آنکھیں کھولی ہیں۔ ان بزرگوں کی کئی خوبیاں تھیں تو ایک مشکل بھی تھی۔ یہ مشکل کیا تھی، اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جنھوں نے اپنے کلاس میں اس قسم کے ایک شعر کا مطلب نہ بتانے کی وجہ سے مار کھائی ہو:

مگس کو باغ میں نہ جانے دیجیو    ناحق خون پروانے کا ہوگا

وہ نسل جس نے ایسے پیچیدہ اشعار کی وجہ سے استاد کی چھڑی سے اپنے ہاتھ لال کروا رکھے ہوں گے، انھیں یہ رسالہ کیوں نعمت نہ لگتا۔ اس رسالے کی ہر تحریر ایک ہی مصنف یعنی وحیدالدین خان کی لکھی ہوتی۔ تحریریں کیا ہوتیں، کہانیوں کی مانند آسانی سے سمجھ میں آجانے والی باتیں ہوتیں۔ ہم یہ کہانیاں پڑھتے اور سوچتے کہ بار الٰہ! اس شخص کی قوت مشاہدہ کتنی تیز ہے جس کوچے سے بھی گزر جاتا ہے، سبق آموز واقعات سمیٹ کر زنبیل میں ڈال لیتا ہے اور کچھ ایسے اسلوب میں بیان کرتا ہے، جی چاہتا ہے کہ بات ختم ہی نہ ہو، ہزار داستان بن جائے۔ سچ جانئے تو وحیدالدین خان بھی ہمارے عہد کے ''شہرزاد'' تھے جنھوں نے آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے ہمارے بلند قامت بزرگوں کی

موجودگی میں لکھنے کی الگ راہ نکالی اور دیکھتے ہی دیکھتے، اپنے عہد پر چھا گئے۔

مولانا وحیدالدین خان نے دعوت و انذار جیسے موضوع میں چاشنی بھر کر اسے ایک نئی شکل اور ایک نیا اسلوب دے دیا جس کی جتنی تفہیم معمولی پڑھے لکھے لوگوں یا ابتدائی جماعتوں کے بچوں کے لیے آسان تھی، اتنی ہی بھاری بھرکم اور جناتی لٹریچر پڑھنے والوں کے لیے بھی خوش گوار تھی۔ ان تحریروں کے مصنف نے اپنی ان کہانیوں سے اخلاق کا درس دیا، دین کی حکمت بتائی اور مذہبی منافرت کے گھٹن والے ماحول میں کشادگی سے سانس لینے کی آسانی فراہم کی۔

ان کی تحریروں سے ہی معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا شمار کبھی مولانا مودودی کے ساتھیوں اور جماعت اسلامی کے راہ نماؤں میں ہوا کرتا تھا۔ یہ واقعہ کب ہوا ہوگا، اس کی تو ہمیں خبر نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ ہماری نسل کے اس دنیا میں آنے سے پہلے پیش آچکا ہو۔ اِن کی تحریروں میں ایک سبق یہ بھی ملتا تھا کہ انسان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، وہ کمزوری جس سے وہ کنڈیشنڈ ہو چکا ہو، اِس سے نجات کے لیے بڑا ریاض چاہیے۔

کمزوری کے تذکرے کا بھی اپنا ایک پس منظر ہے جسے سمجھے بغیر اس عہد کے مسلمانوں کی نفسیات کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس کے بارے میں ان کے ناقدین کا خیال تھا کہ وہ عیسائیت کے اُس تصور کے اسیر ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ وحیدالدین خان کے بارے میں یہ تاثر بہت پختہ ہے لیکن اصل بات کچھ اور ہے۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ جو ہم ہر وقت بطل حریت بن کر ساری دنیا کو ایک ہی وقت میں دشمن بنا کر اپنے اور غیر سب کو مشکل میں ڈال دیتے ہیں، یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔ وہ کچھ مثالیں پیش کیا کرتے اور بتاتے کہ ہمارے لوگوں نے اپنے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ساتھ کے گھر میں بسنے والے کسی ہندو، کسی عیسائی یا احمدی، قادیانی وغیرہ سے دعا سلام کے رشتے ہی توڑ ڈالے ہیں۔ اگر دین کا مزاج یہی ہوتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی ایسا ہی ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ صرف تیرہ برس کی قلیل مدت میں پورے عرب میں انقلاب آجاتا؟

یہ پند و نصیحت کرتے کرتے وہ ایک بار ''شہرزاد'' بن جاتے اور ہمارے آپ کے جانے

پہنچانے گلی کوچوں سے چن کر کوئی ایسی حقیقی مثال پیش کر دیتے جسے سن کر لگتا کہ ارے، ایسا تو ہم نے بھی دیکھ رکھا ہے لیکن یہ جو ہم نے دیکھ رکھا ہوتا تھا، اس کی اہمیت تبھی سمجھ میں آتی جب وہ خان صاحب کے اشہب قلم سے نکل کر ہمارے سامنے آتی۔ یہ ان کی ایسی ہی دل نشیں حکایات کی دَین ہے کہ تین چار دہائیوں تک جنگ وجدل کی تباہ کاریوں کے ہاتھوں خوار وزبوں ہو کر ہم آج اپنی دکھی دنیا میں محبت کے رنگ بھرنے اور کچھ نئے میثاق کرنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ کاش یہ نصیحت ہماری سمجھ میں کچھ پہلے آجاتی۔

حضرت داتا صاحب، شیخ سعدی شیرازی اور مرشدوں کے مرشد مولانا روم، یہ سب ہمارے ایسے بزرگ ہیں جن کے ملفوظات اور ان کی حکایات آج بھی ہمارے رگ وپے میں خون کی طرح دوڑتی ہیں اور ہم سوچتے ہیں، ایسی کمال کی باتیں تاریخ کی امانت ہیں، ہمارا عہد ان سے خالی ہے لیکن خان صاحب کو پڑھ کر محرومی کا یہ احساس دور ہو جاتا ہے۔ (ہم سب، پاکستان)

---

مولانا وحید الدین خان صاحب کی کتابوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا، مجھے دورِ حاضر میں جدید دانشوروں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کا حوصلہ ملا، ان کی ''رازِ حیات'' نے میری زندگی میں رحمتیں بکھیر دیں۔ ان کی ''مذہب اور جدید دور کا چیلنج'' نے میرے سامنے علم الکلام جدید کا ایک دروازہ کھول دیا۔ جب میں نے ''مذہب اور جدید دور کا چیلنج'' کا مطالعہ کیا تو مجھے علم کا دریا بہتا ہوا نظر آیا۔ عصرِ حاضر کے اسلامی اسکالر مولانا وحید الدین خان صاحب ہم میں نہیں رہے۔ (حمیر اعوان، پاکستان)

---

مولانا اس کا ادراک رکھتے تھے کہ وہ مکمل طور پر سیلف میڈ اور یونیک (unique) شخصیت تھے۔ اور بے شک جتنی باریک بینی سے بھی کوئی اس دعوے کو پرکھے وہ اس پر انہیں پورا اترتا ہوا پائے گا۔ یہ self-realization تھا، تعلّی نہیں۔ ان کے جانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اپنے کسی سگے بزرگ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہو۔ (حمزہ ہاشمی، کراچی)

# سائنٹفک نظریات کے علمبردار عالم

عبدالحئی خان

مولانا وحید الدین خان کو سمجھنے کے لیے ان کی کتابوں اور ان کی تحریروں کو پڑھنا ہوگا۔ وہ ایک اعتدال پسند اسلامک اسکالر اور عالم دین ہیں، جب ٹی وی یا اخباروں میں کوئی مذہبی بحث ہوتی تو مولانا کو تلاش کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بہت ہی متوازن اور تعمیرانہ رخ اختیار کرتے تھے۔ ان کو کسی تحریر یا مضمون سے نہیں سمجھا جاسکتا، کیونکہ کچھ لوگ اگر ان کے مخالف ہیں تو بعض ان کے نظریہ کے سخت حامی بھی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اپنی سادگی اور بیباکی کی وجہ سے مولانا ہر طبقہ میں مقبول رہے ہیں۔

پیدائش: مولانا 1925ء میں اتر پردیش کے مردم خیز علاقہ اعظم گڑھ کے بڈھریا قصبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسہ الاصلاح اعظم گڑھ میں انہوں نے عالمیت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسلامی مرکز نئی دہلی کے سربراہ رہے اور وہاں سے مقرر، مصنف اور مفکر کی خدمات انجام دیتے رہے اور اپنے مرکز کے رسالہ الرسالہ کے مدیر رہے۔ مولانا ہفت روزہ الجمعیۃ میں 1967ء سے 1974ء تک ایڈیٹر بھی رہے۔ انہیں اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی پر یکساں عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریروں کو ہر طبقہ، جن میں دانشوروں کی تعداد زیادہ ہے، بہت ہی دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ برادران وطن میں اسلام سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں، انہیں حتی الامکان دور کیا جاسکے۔ ان کے نزدیک دعوت دین کے لیے یہ ایک بنیادی اصول ہے۔

انفرادی نظریہ کے علمبردار: مولانا منفرد نظریات اور خیالات کے حامل تھے۔ مولانا اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''میری پوری زندگی پڑھنے، سوچنے اور مشاہدہ کرنے میں گزری ہے۔ شاید فطرت کا بھی اور انسانی تاریخ کا بھی۔ مجھے کوئی شخص تفکیری حیوان کہہ سکتا ہے۔ میری تفکیری زندگی کا ایک حصہ ہے جو الرسالہ یا کتب میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نسبتاً غیر منظم ڈائریوں کے صفحات پر ہے''۔ ان سب کے باوجود مولانا کے انفرادی نظریات کے

سبب بعض اہل علم اور نقاد صاحبان ان سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔

مولانا کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے۔ انھوں نے کل ملا کر دو سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں اور ان کی علمی قابلیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا نے اہم اسلامی موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی اکثر کتابوں کے ترجمے انگریزی اور عربی وغیرہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مولانا کی عظمت اور علمی بلندی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی کتاب الاسلام یتحدیٰ، مذہب اور جدید چیلنج، قطر، قاہرہ، طرابلس، خرطوم اور تیونس کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہ چکی ہیں۔

قومی اور بین الاقوامی اعزازات: ڈیمورگس بین الاقوامی ایوارڈ سابق سویت یونین کے صدر گورباچیف کے ہاتھوں دیا گیا۔ پدم بھوشن، قومی یکجہتی اعزاز، کمیونل ہارمنی اعزاز، قومی اتحاد اعزاز، ارونا آصف علی (بھائی چارگی ایوارڈ)، بین الاقوامی اعزاز۔ مولانا کی خدمات کے صلہ میں 1989ء میں حکومت پاکستان نے مولانا کی کتاب پیغمبر انقلاب پر پہلا بین الاقوامی انعام دیا۔ اِدھر انھوں نے ٹی وی، ریڈیو اور سمیناروں میں کمزوریٔ صحت کی وجہ سے جانا بند کر دیا تھا، لیکن اپنی آخری سانس تک دعوت وتصنیف کا کام کرتے رہے۔ لیکن جس طرح لوگ ان کی زندگی میں ان کے علم سے استفادہ کرتے رہے ہیں، امید ہے کہ اب ان کی عدم موجودگی میں بھی لوگ ان کے صالح تعمیری اور سائنٹفک نظریات سے فائدہ حاصل کرتے رہیں گے۔ (دی وائس ڈاٹ اِن)

---

عظیم نقصان۔۔ یہ فقرہ ہزاروں بار سنا کہ فلاں شخص کا خلا کوئی پر نہیں کرسکتا لیکن سہی معنوں میں یہ فقرہ مولانا کے لیے کہا جاسکتا۔۔۔ کیونکہ ان کی جیسی مثبت سوچ کے علماء بہت بہت کم ہیں۔۔۔ شاید کوئی اکا دکا۔۔۔ مسلم امہ اس وقت جس ذہنی پستی اور تنگ نظری میں مبتلا۔۔۔ مولانا اس میں ایک امید تھے۔۔۔ کاش مولانا کی سوچ آگے چلتی رہے۔۔۔ ورنہ راہ بہت تاریک ہے۔ (لقمان ظفر، کراچی)

# بصائر و عبر کے ایک عہد کا خاتمہ

ناظم اشرف مصباحی، مغربی بنگال، انڈیا

ہمارے ہاں تعزیتی کلمات میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں کے جانے سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، اکثر اوقات یہ لغو اور بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کل مولانا وحید الدین خان صاحب کے انتقال پر جب یہی الفاظ دیکھا تو لگا جیسے آج ان کلمات کو صحیح مقام مل گیا۔ واقعی مولانا کے ساتھ ایک عہد بصیرت، ایک عہد اسلوب، ایک عہد فکر و تدبیر کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا انتقال امت کے لیے کسی بڑے سانحہ سے کم نہیں، بلکہ 2021 کو سب سے زیادہ اس سانحہ کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔

21 ستمبر 2017 کی شام کو جب سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کی بارگاہ میں حاضری ہوئی تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے مولانا کے گھر بھی پہنچا، سی پی ایس کے متحرک ممبر جناب یعقوب عمری صاحب اور دیگر حضرات نے استقبال کیا اور مولانا سے ملاقات ہوئی اور مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا، مولانا نے مجھے امامت کے لیے آگے بڑھا دیا، اس کے بعد بھی طویل گفتگو رہی، بالآخر عشا سے کچھ دیر پہلے رخصتی کی اجازت لی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی کی ملاقات ہے۔ ان کی خوش اخلاقی بھی یاد ہے اور تمکنت بھی۔ اندازہ ہوا کہ مولانا جیسا لکھتے تھے ویسا بولتے بھی تھے، ان کی زبان و تحریر میں مجھے فرق نظر نہیں آیا، وہی الفاظ، وہی چھوٹے جملے، وہی تعبیرات۔

ڈاکٹر ذیشان صاحب نے انہیں ''بیسویں صدی کی مسلم بصیرت'' کہا ہے، جو سو فیصد درست کہا ہے۔ تمام تر اختلافات کے باوجود مولانا وحید الدین خان صاحب کا طرز تحریر اور اسلوب ہر ایک کے نزدیک مسلم ہے۔ انہوں نے اپنی خدماتی زندگی کی شروعات عام دھارے سے کی، لیکن اپنی فکری جولانی اور اجتہادی شان کی وجہ سے الگ راہ بنائی اور تا حیات اسی پر چلتے رہے۔ ایک نئے لکھاری طالب علم کے لیے ان کی ذات ہمیشہ مشعل راہ بنی رہے گی کہ انہوں نے کثرت سے لکھا، ہر مہینے لکھا، ہر ہفتے لکھا، ہر دن لکھا، بلکہ وہ پوری زندگی لکھتے ہی رہے، اخیر عمر میں لکھنے کے ساتھ بولنا بھی شروع

کیا۔ ایک طویل مدت تک الرسالہ کوتن تنہا لکھا، وہ اپنے رسالے کے خود ہی مدیر، خود ہی مرتب اور خود ہی لکھاری تھے۔ اِدھر ہم جیسے ہزاروں لکھاریوں کا پورا مہینہ یہ سوچنے میں گزر جاتا کہ کس ٹاپک پر لکھیں، ادھر مولانا کا ایک مکمل رسالہ چھپ کر آجاتا۔

انہوں نے ماہنامے لکھے جو اسلام کے فکری انقلاب کی دعوت دیتے تھے، انہوں نے ڈائریاں لکھیں جو مکمل دستاویز ہوا کرتی تھیں، انہوں نے کتابیں لکھیں جو فکر و بصیرت کے دریچے کھولتی تھیں۔ پہلے عام موضوعات پر لکھا، پھر مذہبی سیاسیات پر لکھا، پھر فکریات پر آئے، پھر دعوت کو موضوع سخن بنایا، اس کے بعد اخیر عمر تک روحانیت پر لکھتے رہے۔ ان کی تحریروں کے مواد سے اختلاف تو ہوسکتا ہے، لیکن ان کے مسلسل لکھنے، اچھا لکھنے، بغیر دل دکھائے تنقید لکھنے کی ادا سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ مولانا کے جانے سے دل اداس ہے، من مضطرب ہے، قدم بوجھل ہیں اور آنکھیں نم ہیں۔

---

# ایک عہد ساز شخصیت کی دنیا سے رخصتی

میرے لڑکپن کی محبت سید مودودی اور ان کی تعبیر دین تھی، تمام دنیا پر اسلام کا غلبہ ہمیشہ مطمح نظر رہا۔ لڑکپن کی اس محبت میں دراڑ ڈالنے والی ہستی مولانا وحید الدین خان مرحوم کی تھی، ان کی کتاب ’تعبیر کی غلطی‘ نے سب کچھ اُلٹ پُلٹ کر رکھ دیا۔ سید صاحب کی فکر سے دامن چھڑانا اتنا آسان تو نہ تھا لیکن کچھ مدت کے بعد احساس ہو گیا کہ مولانا وحید الدین کی بات درست ہے۔ الحمدللہ، حق کی محبت سید مودودی کی محبت پر غالب آ گئی۔ اللہ کی محبت میں سرشار مولانا وحید الدین خان ایک سچے داعی تھے، بلاشبہ اپنے رب سے شدید محبت کرنے والے۔ اللہ کا ذکر کرتے ہوئے جو وارفتگی کی کیفیت ان کے ہاں محسوس ہوتی شاید بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ ان کی عظیم شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن تحریر لمبی ہو جائے گی۔ ایک عہد ساز شخصیت سے ہم محروم ہو گئے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانیت ایک عظیم نقصان سے دوچار ہوئی ہے۔ (عامر ندیم، پاکستان)

# روشن دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے

سالم فاروق ندوی، مظفر نگر، یوپی

مولانا وحید الدین خان جو مختلف زبانوں میں متعدد کتابوں کے مصنف اور موجودہ دور میں تحقیقی دنیا کے ایک بڑے امام سمجھے جاتے ہیں، 21 اپریل 2021 کو اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے ہیں، اِناللہ و اِنا الیہ راجعون۔ آپ کی ولادت یکم جنوری، 1925ء کو بڈھریا اعظم گڑھ میں ہوئی، اور مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ میں آپ نے تعلیم حاصل کر کے فراغت حاصل کی۔

مولانا مرحوم ہندوستان کے لیے عزت کا تاج اور عالم اسلامی کے دانشور طبقہ کے لیے ایک بہترین راہنما اور کامیاب مفکر تھے۔ آپ کی زندگی سیرت وسنت اور احیائے امت کے لیے گویا وقف رہی، آپ کی اکثر کتابیں فکری وشعوری انقلاب پیدا کرنے والی تحریروں اور تقاریر پر مشتمل ہیں، آپ کے اکثر پروگرامز بھی احیائے اسلام اور حقانیت اسلام کے ہی تحت ہوتے تھے، آپ کی زندگی کا ایک بڑا مقصد دعوت وتبلیغ رہا، بالخصوص برادران وطن میں آپ کے دعوتی جذبات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے قابل ہیں، آپ کا مشن مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا تھا، نیز اسلام کے تعلق سے برادران وطن کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں اور غلط تصویریں ہیں ان کا ازالہ کرنا تو آپ کا اولین مقصد رہا ہے، اسی کے تحت آپ نے ''عظمت اسلام''، ''دعوت اسلام''، ''دینِ انسانیت'' اور ''دین کامل'' کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔

آپ کے کارہائے نمایاں میں سب سے بڑا کارنامہ دین کی سیاسی تعبیر پر معتدلانہ اور منصفانہ تنقید ہے جس میں مصنف کی علمی عبقریت کو سلامت رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ نے اس کی علمی سطح پر گرفت کی ہے، اور نہ صرف یہ کہ تنقید پر بس کیا بلکہ اس کا بدل پیش کیا اور اس موضوع پر مستقل ایک محققانہ کتاب ''تعبیر کی غلطی'' بھی تصنیف فرمائی ہے۔

اردو زبان میں مذہبیات کو ایک عصری اسلوب دیا۔ مثلاً مذہبیات کو روزمرہ کی آسان زبان میں بیان کرتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں پر دین کی حقیقت واضح کی جائے، معرفت الٰہی سے ان کو

روشناس کرایا جائے اور سیاسی رو سے جو مسلمانوں میں منفی پہلو ہیں ان کی اصلاح کی جائے ،مولانا نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہیں اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور آخرت میں حساب دینا ہے، وہیں پر اگر مولانا کی پوری تحریروں کا تجزیہ کیا جائے تو مذکورہ بالا نتیجہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلے گا کہ مولانا نے مسلمانوں کو یہ بھی سمجھایا کہ تمھارا مشن کیا ہے؟اس دنیا میں تمہارا وجود کس لیے ہوا ہے؟تمہیں ردعمل کی نفسیات سے نکل کر برادران وطن کے ساتھ مثبت اور تعمیری سوچ اور معتدل رویہ اختیار کرنا چاہیے اور پوری دنیا کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے، منفی نظر سے نہیں۔اس طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی ساری تحریروں کا مرکزی خاکہ معرفتِ الٰہی اور دعوت و تبلیغ ہوتا تھا۔

آپ نے بہت ہی سلیس اور آسان فہم انداز میں قرآن کا انگلش ترجمہ کیا جو انگلش زبان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے بے حد مفید اور دعوتی راہ میں نہایت کارآمد ثابت ہوگا۔اب تک اسلامی مرکز نئی دہلی کے چیئرمین اور ماہ نامہ ''الرسالہ'' کے مدیر بھی رہے ہیں۔آپ کی زندگی مفکرانہ، قلم ادیبانہ اور انداز خطابت نہایت عالمانہ تھا ،آپ تمام مذاہب کی تقریبات میں شرکت کرتے تھے، ہندوستان آپ کی ملی و وطنی خدمات کا ہمیشہ معترف اور مرہون منت رہے گا۔

حکومت ہند نے آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حال ہی میں 25 جنوری 2021 کو ہندوستان کے دوسرے بڑے شہری ایوارڈ ''پدم وبھوشن ایوارڈ'' سے نوازا تھا۔اس کے علاوہ بھی ہندوستان اور بیرون ممالک سے آپ کو بہت سے ایوارڈز دئے جا چکے ہیں۔مثلاً 12 مئی 1989ء میں حکومت پاکستان نے آپ کی ایک کتاب، ''پیغمبر انقلاب'' (انگریزی) پر پہلا بین الاقوامی انعام دیا تھا، ڈیمورگس بین الاقوامی اعزاز، یہ آپ کو گورباچیف کے ہاتھوں دیا گیا تھا۔غرض یہ کہ مولانا کی شخصیت ایک عظیم شخصیت رہی ہے، وہ اپنے آپ میں خود ایک انجمن تھے، ہر موضوع پر گفتگو کرتے اور لکھتے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جتنا انھوں نے لکھا ہے شاید ہی کسی اور نے لکھا ہو، عالم اسلامی میں آپ کا وجود تمام لوگوں کے لیے ایک افتخار تھا اور آپ کی جدائی تحقیقی دنیا میں شاید حال کا سب سے بڑا خسارہ ہو، ماضی کے علماء اور ان کے علوم پر آپ کی نادر تنقیحات ہوتی تھیں۔

اپنی سیرت و کردار اپنے اخلاص وللّٰہیت اور ہمدردی و خیر خواہی اور معرفتِ الٰہی کے ایک سچے طالب کے اعتبار سے نمونہ تھے، اپنی عمر کے 96 سال اس دنیا میں گزار کر آج بتاریخ 21 اپریل

2021ء بمطابق 8 رمضان 1442ھ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالیٰ امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

روش دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے..!  یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک مرا افسانہ ہے..!

---

# مولانا وحید الدین خاں صاحب کے اوصاف

جاوید اقبال، پرنسپل اینگلو عربک اسکول، ترکمان گیٹ، دہلی

وحید الدین خاں صاحب مرحوم ہمیشہ اپنے ساتھ ایک ڈائری رکھتے تھے۔ جو نیا خیال ان کے ذہن میں آتا اس کو فوراً ڈائری میں نوٹ کر لیتے۔ جب موصوف کی کسی سے ملاقات ہوتی تو اس شخص کی گفتگو بڑی توجہ سے سنتے۔ خود کم بولتے، مخاطب کو بولنے کا موقع دیتے۔ اس کی گفتگو میں کوئی سبق آموز اور بامقصد بات ہوتی تو اسے ذہن میں رکھتے اور بعد میں ڈائری میں نوٹ کر لیتے۔

اسی طرح جب کوئی کتاب پڑھتے تو اس سے حاصل شدہ معلومات کو نوٹ کرتے۔ موصوف عوام اور خواص سے ملنے جلنے میں تکلف نہیں کرتے تھے۔ ان سے ملاقات بہت آسان تھی۔

تعلیم یافتہ لوگوں سے جب ملتے تو دو سوال ضرور پوچھتے۔ پہلا سوال: آج کل کون سی کتاب زیر مطالعہ ہے؟ دوسرا سوال: دوران مطالعہ یا دوران غور و فکر آپ کی کوئی یافت ہو تو بتائیں۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کے ایک قریبی ساتھی نے بتایا کہ انھوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد کم سے کم دس سال تک ان کے مضامین 'الرسالہ' میں شائع ہوتے رہیں گے۔

ان کے زیادہ تر مضامین ایک صفحہ کے ہوتے ہیں، یعنی چار سو سے کم الفاظ پر مشتمل۔ وہ نکات جو وہ اپنی ڈائری میں لکھتے، انہیں مضمون کی شکل میں مرتب کر لیتے۔

# مولانا وحید الدین خان نے کیا کیا؟

مالک اشتر، نئی دہلی

دلی کی بستی نظام الدین کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ یہ علاقہ نرالی شان والا ہے۔ ایک طرف حضرت محبوب الٰہی کا آستانہ ہے تو ان کے پائنتی میں امیر خسرو آرام کر رہے ہیں۔ چند گز کے فاصلے پر غالب کی مرقد ہے اور اس سے چند سو میٹر دور رحیم کا مدفن ہے۔ ایسا لگتا ہے، کچھ گز زمین کے دائرے میں کئی عہد پیوند خاک ہوں۔ کہنے والے کی بات سولہ آنے سچ ہے البتہ اس علاقے کی ایک فضیلت اور بھی ہے۔ اسی محلے سے لگ کر وہ کالونی واقع ہے جہاں ہمارے عہد کا ایک عظیم اسکالر مرتے دم تک علم کا چراغ روشن کیے رہا۔ مولانا وحید الدین خان نے عمر بھی یہیں گذاری اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اسی علاقے کے پنج پیران قبرستان میں سپرد لحد کیے گئے۔

اس گنہ گار کو مولانا وحید الدین خان سے ملاقات کی سعادت کئی بار نصیب ہوئی۔ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ بڑھاپے کے باوجود وہ کتنے فعال اور متحرک ہیں۔ جب کبھی انہیں انٹرویو کیا مخصوص گھن گرج والی آواز کے ساتھ علم کا دریا بہتا پایا۔ نہیں معلوم کہ اب جب کہ مولانا دنیا سے اٹھ گئے تو مجھ جیسے لوگ سوالوں سے خشک حلق لے کر کس چوکھٹ پر جایا کریں گے جہاں سے جوابوں کا پانی مل سکے۔

مولانا وحید الدین خان ہمارے عہد کی کتنی مقبول شخصیت تھے یہ بات اور زیادہ تب کھلی جب ان کی وفات کی خبر آئی۔ کہاں کا مسلک اور کیسا مذہب؟ اس رات سوشل میڈیا پر سب ان کے غم میں نوحہ گر نظر آئے۔ البتہ کچھ لوگوں نے دبے لفظوں میں مولانا کی ''نظریاتی گمراہیوں'' کو یاد دلانا شروع کر دیا۔ دن نکلتے نکلتے وہ جماعت بھی فیس بک کی گلیوں میں نکل آئی جس کی دانست میں مولانا کا بخشا جانا مشکل تھا۔ میں مولانا کی مغفرت کے ساتھ ان دوستوں کی ہدایت کی دعا بھی کرتا رہا۔

مولانا سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کو شاید یہ سوال کچوکے لگا رہا ہو کہ مرنے والے میں آخر ایسا کیا تھا جو ایک عالم اداس نظر آ رہا ہے۔ مولانا و علامہ تو اور بھی ہیں، کتابیں تو دوسروں نے بھی کم نہیں لکھیں، شاگرد و مرید تو بہت سے علما کے ہوتے ہیں، پھر مولانا وحید الدین میں کیا خاص تھا؟۔

آئیے ان سوالوں سے پریشان ہو رہے بھائیوں کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے عہد میں مذہبی گھرانوں میں آنکھ کھولنے والے اکثر لوگوں کو ان کا ماحول مذہب سے خود بخود قریب کر دیتا ہے۔ گھر میں جو مکتب فکر رائج چلا آرہا ہے اس کی بنیادی باتیں پرورش کے دوران ہی منتقل کر دی جاتی ہیں۔ آگے چل کر ان میں سے بہت سے لوگ اپنے ذوق کے مطابق مذہب کو کم یا زیادہ گہرائی سے سمجھ کر اس پر راسخ بھی ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک تو کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن جھنجھٹ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان میں سے کچھ لوگوں کو ہر لحظہ بدلتی اس دنیا کے تقاضوں اور اقدار کے ساتھ اپنے مذہبی نظریات کو ہم آہنگ کرنے میں دشواری پیش آنے لگتی ہے۔ ان لوگوں کی کشمکش یہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ اس مذہب کو چھوڑنا چاہتے ہیں جس کی سچائی کو ان کا دل بچپن سے قبول کر چکا ہے اور نہ ہی وہ اس دنیا سے کنارہ کر سکتے ہیں جس میں انہیں بہر حال involve ہونا ہے۔

لوگوں کی زندگیوں میں جب یہ منزل آتی ہے تو وہ ایک فکری تذبذب کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ کوئی ایک راستہ پکڑ لیتے ہیں۔ کچھ دنیا پر لاحول پڑھ کر خالص مذہب کے ہو جاتے ہیں تو کچھ مذہب کو سلام کر کے دنیا سے بغل گیر ہو رہتے ہیں۔ جو ان دونوں میں سے کسی کا بھی حوصلہ نہیں کر پاتے وہ باری باری سے دونوں طرف نظر ڈالتے ہیں اور پھر ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔

لوگوں کی اس مشکل کو مذہب کے کچھ جانکاروں نے سمجھا اور کوئی حل کھوجنے میں لگ گئے۔ بہت سوچ بچار کر کے ان اصحاب نے مذہبی فکر کی بذریعہ اجتہاد تطبیقِ نو کرنے کی ٹھانی تاکہ مذہب اور تمدن کے زینے پھلانگتی دنیا کے درمیان حائل رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔ یہی وہ سوراخ ہے جس سے مذہب میں تجدد پسندی کی روایت کا چشمہ پھوٹا۔ اس روایت سے نکلے کچھ افکار تو اس انتہا تک چلے گئے کہ ان میں مذہب کی اصولی روح ہی غائب نظر آئی۔ جب کہ کچھ ایسے نظریات سامنے آئے جنھوں نے تذبذب کے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر کے مذہب اور جدید دنیا کے درمیان ہم آہنگی کی رہ گزر تیار کی۔

مذہب میں تجدد پسندی کی اس روایت کو رائج خطوط پر چلنے والے حلقوں نے نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ ان کی گمراہی کا فتویٰ بھی صادر فرمایا۔ کچھ حلقوں نے تجدد پسندی کے پیچھے مذہب دشمن طاقتوں کا ہاتھ بھی دیکھ لیا۔ ان حلقوں نے اپنے نوجوانوں کو نصیحت کی کہ بھول کر بھی اس نئی روایت کی طرف نہ

جائیں کہ وہاں نقصان ہی نقصان ہے۔ بہت سے لوگ تو اس ہدایت پر سچے دل سے عمل پیرا رہے لیکن ان حلقوں میں ہی کچھ ایسے بھی تھے جو کہتے تو کچھ نہ تھے لیکن ان کے بھی دلوں میں تذبذب کی وہی آگ جل رہی تھی۔ ایسے افراد بھی خاموشی سے نئی روایت کی طرف بڑھ گئے۔

مولانا وحید الدین خان سے لے کر جاوید احمد غامدی تک مذہبی فکر کی تشکیل نو کرنے والے تمام اسکالروں کو آپ جتنا چاہیں برا بھلا کہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ جانے کتنے افراد کو تذبذب کے عذاب سے نکالنے میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کا یہ کارنامہ بہت بڑا ہے کہ انھوں نے ایک خلقت کو یہ باور کرا دیا کہ دنیا کیسی ہی ترقی کر لے تب بھی مذہب کی معنویت باقی رہتی ہے۔

میرے مشاہدے میں مولانا وحید الدین خان اور جاوید غامدی جیسے افراد کی مذہبی فکر بہت سے لوگوں کے لیے ان ستونوں کی طرح ہیں جنہیں ہٹا دیا جائے تو رائج مذہبی بیانیہ سے متعلق شبہات کی چھت مکینوں کے سروں پر آ پڑے گی۔ اس لیے ان ستونوں کی بناوٹ میں کوتاہیوں کے امکان کے باوجود ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا وحید الدین خان کی مذہبی تعبیرات کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں مذہب کی اصولی حیثیت بہر حال نمایاں ہے۔ مذہب کی تفہیم کرتے وقت وہ دین کے دائرے میں کھڑے ہو کر استدلال کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ جدید دنیا سے ہم آہنگی کی راہیں بھی ہموار کرتے ہیں اور اس راہ میں ہر سنگ میل پر یہ یاد دہانی بھی لکھتے جاتے ہیں کہ انسان کی حتمی منزل کچھ اور ہے۔

مولانا کے سیاسی نظریات پر تنقید کا سب کو حق ہے لیکن ان کو بنیاد بنا کر مولانا کی پوری ریاضت کو ٹکے ٹوکری کر دینا انصاف نہیں۔ نظریاتی اختلاف تو بہت جگہوں پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی فکری شکم سے نکلی دو تنظیمیں سیکولرزم کے بارے میں دو بالکل مختلف نظریے رکھتی ہیں۔ ہماری طرف والی تنظیم کو سیکولرزم بہت عزیز ہے جب کہ سرحد پار والی کو سیکولرزم سخت نقصاندہ لگتا ہے۔ جس طرح ان نظریاتی اختلافات کو بنیاد بنا کر یہاں یا وہاں والی تنظیم کی گمراہی کا حکم لگانا زیادتی ہے، ویسے ہی مولانا کے سیاسی نظریات کو وجہ بتا کر ان کی تمام کارگزاریوں کی تکذیب بھی ایمانداری کے خلاف ہے۔

# خاکسارانہ خودداری کا رول ماڈل

صہیب سلیم رومی، ضلع لوئر دیر تیمر گرہ

علم ہو اور ساتھ میں خاکسارانہ بے نیازی تو تینوں کی مجسم شکل مولانا وحید الدین خان ہوتے ہیں۔ مولانا کی علمیت اور تفضّل کی شاہد ان کی کتابیں، اقوال، رسائل، خطوط اور ڈائریز تو ہیں ہی، ان کی خاکساری اور بے نیازی ملاقات کا شرف حاصل کرنے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے والوں کے نقل کردہ واقعات سے عیاں ہے۔

دنیا جہان کے لوگوں سے ایسے پرخلوص شفقت سے ملتے جیسے ایک سراپا محبت روحانی والد سے توقع کی جاسکتی ہے۔ مخالفین، ذاتی حملے کرنے، کردار کشی کرنے والے ایک عرصے کے بعد خود ان کے مرید بن جاتے۔ دیوبندیوں نے خلاف لکھا، جماعت اسلامی والوں نے ان کے خلاف مہم چلائی۔ کچھ لوگ مولانا کی ذاتی کردارکشی پر اتر آئے۔ مولانا نے سب نظرانداز کردیا، خاموش رہے اور معاف کردیا۔ بالآخر سب لوگ خاموش ہوگئے۔ مولانا کے زبان وقلم سے ایک حرفِ ملامت نہ نکلا۔ مولانا کی یہی پروقار خاموشی اور عدم ردِعمل ان کی سب سے بڑی فتح تھی۔ علماء کے طعنے، فتوے اور ذاتی حملے آج کسی کو بھی یاد نہیں۔ جب کہ مولانا علم وفضل کی تاریخ میں کل اور آج بھی زندہ ہیں اور تا دیر زندہ رہیں گے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے پاکستان کے ایک مفتی صاحب ایک دفعہ اسلام آباد سے دہلی مولانا وحید الدین کے دفتر ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ ان دنوں اسرائیل وقادیانیت کے بارے مولانا کے افکار وخیالات نے مسلمانوں کے درمیان ایک طوفان بپا کر رکھا تھا۔ محترم پاکستانی مفتی صاحب، مولانا کے ان دونوں نکات پر مولانا کی اصلاح کے لیے انتہائی پرجوش و پرعزم تھے۔ مولانا سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو مفتی صاحب نے کہا کہ میں فلاں مفتی، پاکستان سے آیا ہوں۔ میری مدعائے ملاقات یہ ہے کہ آپ سے دو باتوں پر مناظرہ کروں۔ ایک یہ کہ آپ اسرائیل کے وجود کو درست تسلیم کرتے ہیں اور دوئم یہ کہ آپ قادیانیوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا:

''میں نے سوچ سمجھ کر اپنی تحریروں کا ایک موقف اپنایا ہے۔ اسی پر میں لکھتا ہوں:

(1) معرفت اور دعوت میرے بنیادی موضوع ہیں۔ (2) شخصی مدح وقدح سے مکمل اجتناب کرنا۔ (3) بعض موضوعات پر ایک مرتبہ کچھ لکھ چکا ہوں تو اس کو پھر سے دہراتا نہیں ہوں۔ گویا وہ میری ایک علمی توجیہہ یا میری علمی رائے کی حد تک ہوگی''۔ اس طرح بات ختم ہوگئی۔

دوسرا واقعہ لیبیا میں پیش آیا۔ لیبیا کے، مردِ آہن اور آمر کرنل قذافی اپنی شہرت، طاقت اور مقبولیت کے عروج پر تھے۔ دنیا جہان کی معروف سیاسی، سماجی اور علمی شخصیات کو لیبیا بلاتے اور ان کی مہمان نوازی کرتے تھے۔ صاحبانِ علم وقلم سے قصیدے لکھواتے اور بدلے میں انعام واکرام کے بارش سے نوازتے۔ پاکستان کے ایک معروف مذہبی سیاسی قائد بھی، مسلکی فرق کے باوجود، ان کے مستقل وظیفہ خوار رہے۔

1989ء کی بات ہے، کرنل قذافی نے لیبیا کے دارالحکومت طرابلس میں مسلمان علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں اسلامی دنیا کے 300 علماء بشمول مولانا وحیدالدین بھی مدعو تھے۔ کانفرنس کے دوران ایک صاحب کی تقریر جاری تھی۔ اسی اثناء میں قذافی کانفرنس ہال میں داخل ہوئے تو کانفرنس میں موجود سب علماء وشرکاء اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے لیکن ایک شخص اپنی نشست پر متانت سے بیٹھا رہا۔ یہ انڈیا سے آئے ہوئے مولانا وحیدالدین خان تھے۔

کانفرنس کے تیسرے روز قذافی نے علماء کے لیے عشائیہ کا خصوصی پروگرام بنایا، مگر مولانا نے اس میٹنگ میں شرکت نہیں کی۔ یہ واقعہ خود مولانا کی زبانی سنیے۔ مولانا نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ستمبر 1989 کے آخری ہفتے میں لیبیا میں انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ مختلف ملکوں کے کئی سو آدمی وہاں آئے۔ میں بھی شریک ہوا۔ ہم لوگ طرابلس کے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ اس کے بعد تمام لوگ اسپیشل جہاز کے ذریعہ بن غازی لے جائے گئے تاکہ وہاں کرنل قذافی سے ملاقات کرسکیں۔ تمام شرکاء خوشی خوشی وہاں گئے۔ میں اکیلا طرابلس کے ہوٹل میں ٹھہرا رہا۔ میں اکیلا قذافی سے ملنے نہیں گیا۔ اپنے اس استغنا کی وجہ سے 500 ڈالر کھودیے۔ (ڈائری 24 فروری، 1990)

https://sanurdu.com/featured/8890/

# مولانا وحید الدین خان میری نظر میں

ناصر منصور

قریب دو ہفتوں سے مرحوم کی صحت مسلسل گرتی جارہی تھی، اور 21 اپریل 2021 کو جان عزیز کو لبیک کہہ گئے۔ مرحوم کا میں نے ظاہری طور پر دیدار نہیں کیا تھا لیکن ملاقات کی جو خواہش تھی وہ پوری نہ ہوسکی۔ وفات با حسرت کی خبر سن کر یقین جانو، میں ششدر اور خوف زدہ ہوگیا کہ کیا واقعی مولانا اللہ کو پیارے ہوگئے، جن کی کتابوں کا مطالعہ میں دس سالوں سے بلا فصل کرتا آرہا ہوں اور یہ کہ ان کی وفات کے وقت بھی انہی کی کتاب سفر حیات کا مطالعہ جاری تھا۔ کتنی حیرت انگیز اور جبری الارم ہے موت، بغیر کسی رعایت کام تمام کرتی ہے موت۔

مرحوم کی کتابوں کے مطالعہ کرنے سے پہلے علم کی دنیا میں میری حیثیت ایک ادنی سے طالب علم کی بھی نہ تھی۔ آج دو حرف لکھنے کی صلاحیت اور اس کی تحریک مولانا مرحوم کی بالواسطہ دَین ہے۔ کچھ چند جزوی مسائل کے اختلاف کے باوجود میری نظر ہمیشہ خان صاحب کے بیشتر مثبت اور اہل سنت کے موافق مسائل پر جاتی رہی۔ اس سے ہوا یہ کہ میرے ذہن نے منفی سوچ کو مثبت میں تبدیل کرنے کا آرٹ سیکھا، جو میری ذاتی زندگی میں خوب نمایاں ہے اور یہی روش تمام مکاتب فکر کے مطالعہ میں رہی۔

بہر کیف مولانا وحید الدین خان مرحوم ایک بلند مرتبت کے حامل متعدد خصوصیات کے پیکر تھے۔ عالم اسلام کے ایک عظیم مفکر ہونے کے ساتھ ہی ایک عمدہ آئڈیالوجسٹ، سائنٹفک تھنکر اور دعوتی میدان کے ایک داعی تھے، جس نے اپنے آخری وقت تک یہ سلسلہ نہ تھمنے دیا۔

مولانا مرحوم مختلف مکاتب فکر کے یہاں متنازعہ شخصیت کہلاتے ہیں۔ چند تفردات کی وجہ سے بعض علماء ان کی تنقید میں کئی کتابیں اور سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں اور کئی لوگوں نے بدترین قسم کی تنقیص بھی کی، جو حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

بعض حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کا مسیح مہدی ہونے کا دعوی ہے۔ مگر انھوں نے اپنی بات کسی ٹھوس دلیل کے بغیر کہی ہے۔ یہ ایک بدترین قسم کا الزام ہے۔ اسی طرح کا الزام مولانا زکریا

کاندھلوی تبلیغی جماعت کے بانی کی طرف سے سید مودودی پر بھی لگایا گیا تھا۔کسی پر ایمان وعقیدہ کے اعتبار سے الزام لگانے کے لیے براہ راست دلائل وبرہان ہونے چاہیے، نہ کہ بالواسطہ استنباط۔اور بعض تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مہدی کو کوئی فرد نہیں گردانتے تھے بلکہ آپ کا رخ ایک آئڈیالوجی کی طرف تھا۔اگرچہ یہاں تفصیلی بحث ممکن نہیں ہے۔مختصراً یہ عرض ہے کہ ہوسکتا ہے کہ مرحوم کا نظریہ پہلے یہی ہو، بعد میں رجوع کرلیا ہو جیسا کہ بعد میں شائع ہونے والی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔مثال کے طور پر 2014 کی کتاب اظہار دین صفحہ نمبر 245 یوں رقم طراز ہیں:"اصحاب رسول نے جس دور تاریخ کا آغاز کیا تھا تقریبا ڈیڑھ ہزار سال میں وہ اپنے نقطہ کمال پر پہنچ چکا ہے اب دوبارہ اس نئی نسل سے ایک فرد اٹھے گا جس کو حدیث میں المہدی کا کا نام دیا گیا ہے"۔

اسی طرح کا ایک اور الزام جو مسیحی ماڈل کے نام سے مشہور مضمون ہے کہ آپ نے جون 2007 کے الرسالہ میں کہا تھا کہ"اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عیسی علیہ السلام کا اسوہ مطلوب ہے" کا پروپیگنڈا اچلایا گیا۔بظاہر اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی نفی ہوتی ہے حتی کہ اس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔جولائی 2010 میں خان صاحب نے اس الزام کا ایک سوال کے جواب میں یہ دیا تھا۔اس کا اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: ماہ نامہ الرسالہ جون 2007 کے شمارے میں مسیحی ماڈل کی آمد ثانی کے عنوان سے آپ کا ایک مضمون نگاہ سے گزرا اس سلسلے میں دو سوال پیش خدمت ہیں۔ایک یہ کہ اس تعبیر کے استعمال کرنے کی کیا حکمت پیش آئی۔۔صفحہ نمبر 38۔۔۔

جواب: آپ نے غالبا اصل مضمون کو زیادہ غور کے ساتھ نہیں پڑھا ورنہ آپ کو اس قسم کا اشکال پیش نہ آتا۔اگر آپ مضمون کو غور سے پڑھیں تو آپ پر کھل جائے گا کہ مسیحی ماڈل کی آمد ثانی کا مطلب دوسرے لفظوں میں مکی ماڈل کی آمد ثانی ہے۔مذکورہ مضمون میں جس چیز کو مسیحی ماڈل کہا گیا ہے، وہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پوری طرح موجود ہے۔مکی دور میں آپ نے خود اسی اصول کے مطابق عمل فرمایا ہے مضمون میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس تصور کو زیادہ ممیز کرنے کے لیے اس کو مسیحی ماڈل کا نام دے دیا گیا ہے، تاکہ وہ جدید ذہن کے لیے زیادہ قابل فہم ہوسکے۔جیسا کہ معلوم ہے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے پیغمبرانہ مشن کے دو دور ہیں— مکی دور اور

مدنی دور۔ مکی دور پُرامن دعوت کا دور ہے۔ اس کے مقابلے میں مدنی دور کو جہاد اور قتال کا دور سمجھا جاتا ہے اور یہ دونوں ادوار بلاشبہ اسلام میں مستند ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خان صاحب مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی سے مراد یہ لیتے ہیں کہ عیسیٰ مسیح کی جب آمد ہوگی، اور وہ جو ماڈل اپنائیں گے وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنایا ہوا مکی ماڈل ہوگا، نہ کہ کوئی خودساختہ مسیحی ماڈل۔

بہر کیف مولانا وحید الدین خان صاحب اپنے پیچھے قرآنی مشن کا ایک عظیم کام بالعموم تمام لوگوں پر اور بالخصوص اپنے پیروکاروں کے کندھوں پر چھوڑ کر چلے گئے۔ خان صاحب کے مغفرت اور صدقۂ جاریہ کے لیے قرآنی مشن ایک صدقۂ عظیم کے برابر ہے۔ مختلف زبانوں میں قرآن شریف کی سب سے زیادہ تراجم کرنے والی سرفہرست دعوتی این جی او خان صاحب کا cps سنٹر ہے۔ یہی مشن خان صاحب کا آخری مشن ہے۔

---

# بابا چلے گئے

کل رات سے دنیا بھر میں موجود ہم تمام دوستوں پر ایک رنج والم کی کیفیت طاری ہے۔ ہم میں سے کسی کو سمجھ نہیں آرہا ہے کہ خود کو دلاسا دیں یا ایک دوسرے کے غم خوار بنیں۔ بابا ہمارے لیے کیا کچھ چھوڑ گئے ہیں؟ اُن کی علمی خدمات کیا ہیں؟ یہ کوئی ایک دن کا موضوع تو ہے نہیں کہ ابھی کے ابھی سارا قصہ لکھ دیا جائے۔ دنیا بھر میں موجود سبھی دوستوں نے لکھنے کا آغاز کیا ہے اور یہ نہ ختم ہونے والی داستان بابا کے علمی کام کو ہر ایک تک پہنچانے کی صورت اَب جاری وساری رہے گی ان شاء اللہ۔ بابا مدح سرائی سے منع کر گئے ہیں لیکن بابا سچ تو ہم میں سے ہر ایک لکھے گا۔ یہ سچ ہے بابا کہ آپ نے آخرت کی یاددہانی کرانے، تزکیہ اور خدا کی معرفت کی راہ دکھانے میں اپنی تمام عمر لگا دی۔ جبھی تو یہ آخری بات کس سرشاری میں کہہ گئے کہ ”میں بہت جلد اللہ تعالیٰ کا خوشی اور آنسوؤں سے استقبال کرنے والا ہوں“ (ڈاکٹر اشفاق، کراچی)

# تحریک الرسالہ ایک تعارف

پروفیسر ظہیر الدین خواجہ، رائچور، کرناٹک

مولانا وحید الدین خاں بلا مبالغہ بیسویں صدی کے بڑے عالم دین اور مفکر اسلام تھے۔ اہل علم اس کا اعتراف کر رہے ہیں۔ آپ کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ سے کم نہیں۔

مولانا کی متعین فکری رجحان کا اظہار ویسے تو ان کی کتاب ''خدا کا مطلوب انسان'' سے ہو چکا تھا۔ مگر 1976ء میں الرسالہ کے اجراء کے بعد مولانا کی فکر ''تحریک الرسالہ'' کے نام سے موسوم ہو گئی۔ ایک منفرد تحریک جس کی نظیر دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ایسی تحریک جس نے ایک طرف دین خداوندی کو انسانی اضافوں سے پاک کر کے اس کی اصل روح اور اصل چہرے کو بے آمیز شکل میں ویسا ہی پیش کرنے کی کوشش کی جیسا کہ وہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اور دوسری طرف بے شمار نفوس کو نہ صرف معرفت کی روشنی سے منور کیا بلکہ زمانی بصیرت اور عصر حاضر کا شعور بھی عطا کیا۔ تقریباً نصف صدی پر محیط تحریک الرسالہ کے مکمل علمی وفکری جہات کا احاطہ کرنا اس مختصر مضمون کا مقصود نہیں ہے۔ یہاں تحریک الرسالہ کے مختلف ادوار کا اجمالی تعارف پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تاکہ قاری کو الرسالہ کی تحریریں قابل فہم ہو سکیں۔

راقم الحروف کے خیال کے مطابق، الرسالہ کے اصل بنیادی موضوعات ابتدا سے معرفت اور دعوت اور آخرت ہی رہے ہیں، مگر اپنے مضامین کے لحاظ سے اس تحریک کو درجہ ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ پہلا ''معرفت رب'' کا دور۔ سنہ 1976ء سے لے کر 1986ء تک۔

2۔ دوسرا ''معرفت زمانہ'' کا دور۔ سنہ 1986ء سے لے کر 1996ء تک۔

3۔ تیسرا ''معرفت دعوت'' کا دور۔ سنہ 1996ء سے لے کر 2021ء تک۔

''معرفتِ رب'' کا دور: اس دور میں الرسالہ کے صفحات پر ''عظمت خداوندی'' کے مضامین کا غلبہ رہا۔ اس دور میں خدا کی کبریائی، خدا کے جلال و جمال، کلمات اللہ اور آلاء اللہ کا ایسا لافانی نغمہ

الرسالہ کے صفحات سے بلند ہوا ایسا لگتا تھا کہ دین فطرت کا کائناتی اظہار ہو رہا ہے، گویا کہ فطرت ہم کلامی کررہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

’’خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے، کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک ایسی زلزلہ خیز دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو ہلا دیتی ہے وہ ایک ناقابل بیان ربانی نور میں نہا اٹھتا ہے، اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو سورج کی کرنوں میں خدا کا نور جگمگا تا ہوا دکھائی دے گا، ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمس ربانی کا تجربہ ہوگا، وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی مہک کو پائے گا۔ ایمان ایک زلزلہ ہے جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے، ایمان ایک سیلاب ہے جو خدا کے فیضان کو پا کر آدمی کے سینے میں بہہ پڑتا ہے‘‘۔(اللہ اکبر)

اس دور میں مولانا کے قلم سے ایسے ربانی کلمات نکلے جنہیں پوری تاریخ بشری میں انسانی زبان سے نکلے ہوئے بہترین ربانی کلمات کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خدا اور توحید نہ صرف مولانا کا پسندیدہ موضوع تھا بلکہ ہمیشہ مولانا پر ’’العظمۃ للہ‘‘ کی نفسیات کا غلبہ رہتا تھا۔

’’اللہ اکبر‘‘ اس دور کی نمائندہ کتاب ہے اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام کی 1400 سالہ تاریخ میں قرآن کے بعد خالص خدا کی عظمت کے مضامین پر مشتمل اوّلین کتاب ہے۔

اس دور کا پیغام و خصوصیات: اس دور میں مولانا کا موقف یہ تھا کہ خدا کی عظمت اور خدا کی قدرت کا اتنا چرچا کیا جائے کہ لوگ دریافت کی سطح پر خدا اور دین کو پانے والے بن جائیں۔ کیونکہ اصحابِ رسول نے دین کو خدا کی دریافت کی سطح پر پایا تھا۔ اس دور میں:

1۔ الرسالہ برصغیر میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا دینی پرچہ بن گیا تھا۔

2۔ مولانا کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے کچھ حلقوں میں بے چینی کی لہر پیدا ہوگئی۔

3۔ مولانا کے خطابات میں جدید تعلیم یافتہ اور دینی مدارس کے طلبا و فارغین کا ایک ہجوم شریک ہوتا تھا۔ شاید یہ بھیڑ اس لیے جمع ہوتی تھی کہ مولانا عظمت خدا کے ساتھ ساتھ، عظمت رسول، عظمت اسلام، عظمت صحابہ، عظمت مومن اور اسلام دور جدید کا خالق، جیسے مسلمانوں کے پسندیدہ موضوعات پر بھی بات کرتے تھے، شاید انہیں مولانا کی تحریروں میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی جھلکیاں نظر آتی تھیں، اور زوال یافتہ قوموں کے لیے ایسے موضوعات میں زیادہ کشش ہوتی ہے۔

دوسرا دور ''معرفتِ زمانہ'' 1986ء سے 1996ء تک امت مسلمہ کے لیے ایک ہنگامی دور ہے۔ اس دور میں امت مسلمہ دنیا کے کئی ممالک میں بے شمار مسائل میں ایسا گھرتی چلی گئی کہ آج تک ان سے نکلنا نصیب نہ ہوسکا۔ ان مسائل کے پیدا ہونے کے دو بنیادی سبب تھے۔ ایک دین کی غلط تعبیر کا عوام میں سرایت کر جانا اور دوسرے بصیرتِ زمانہ کا مکمل فقدان۔

عالمی سطح پر فلسطین سے لے کر عراق، افغانستان، کشمیر اور بوسنیا وغیرہ تک، اور ادھر ہندوستان کی سطح پر شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت میں جو ہنگامہ خیز تحریک چلائی گئی اس نے بابری مسجد کے سوئے ہوئے مسئلے کو نئی زندگی بخشی۔ اور مسلم قیادت نے مسلمانانِ ہند کے مستقبل کو گویا بابری مسجد پر بھینٹ چڑھا دیا۔

اس احمقانہ سیاست کا حاصل آج یہ ہوا کہ CAA اور NRC جیسے سنگین مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں مولانا ملت کی بربادی کا تماشہ دیکھ کر تڑپ اٹھے اور قرآن وسنّت اور زمانی بصیرت کی روشنی میں مسلسل مسلمانوں کی مثبت رہنمائی فرماتے رہے۔ ملت کے عالمی مسائل سے لے کر مقامی مسائل تک ہر موضوع پر لکھا، قدم قدم پر رہنمائی کی اور پیشگی متنبّہ فرماتے رہے کہ جس راستے پر ملت کو اس کے بے ریش و باریش رہنما لے جا رہے ہیں، وہ بربادی کا راستہ ہے۔ اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ قدیم قبائلی دور کی سوچ اور ''پدرم سلطان بود'' کی نفسیات سے نکل کر جدید زمانی تبدیلیوں کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل کو طے کرنے کی ضرورت ہے۔

بابری مسجد کے انہدام سے پہلے بھی اس مسئلے کو باہمی گفت وشنید سے حل کرانے کی کوشش کی اور انہدام کے بعد، قوم کے مستقبل کو سنوارنے کی خاطر اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا کر تین نکاتی فارمولا بھی پیش کیا۔ جس کو روزنامہ انقلاب ممبئی اور روزنامہ مڈ ڈے (Mid-Day) کے سروے کے مطابق 63٪ مسلم اور 69٪ غیر مسلم عوام نے منظور بھی کیا تھا۔ مگر ملت کے نام نہاد قائدین نے نہ مولانا کی سنی، نہ عوام کی سنی اور بدستور اپنی لایعنی سیاست میں لگے رہے۔ (ایک صاحب نے اپنے حالیہ مضمون میں یوں لکھا کہ ''امت نے مولانا کو رجکٹ کر دیا''۔ حالانکہ اوپر کا سروے بتا رہا ہے کہ امت نے مولانا کو رجکٹ نہیں کیا، بلکہ اپنی نااہلی اور ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ایسا لکھا جا رہا ہے)۔

حدیثِ رسول میں جس فراست اور زمانی بصیرت کو مومنانہ صفت بتایا گیا ہے، اس نعمت

سے وافر حصہ اللہ نے مولانا کو عطا کیا تھا۔ چنانچہ تعمیرِ ملت کے لیے پر حکمت مضامین پر مشتمل مولانا نے جو مثبت کتابیں لکھیں وہ اردو زبان میں لکھی گئی شاہکار کتابیں سمجھی جاتی ہیں ۔ جیسے ، رازِ حیات ، رہنمائے حیات، تعمیرِ حیات ، کتابِ زندگی ،روشن مستقبل اور راہیں بند نہیں وغیرہ ۔ان کتابوں سے انفرادی سطح پر تو مسلمانوں نے خوب استفادہ کیا، مگر اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں وہ اسی سنجیدگی کا ثبوت نہ دے سکے۔ اسی لیے اجتماعی ملی مسائل کا حل بھی قرآن وسنت کے ابدی اصولوں کی روشنی میں مولانا نے اپنی درجہ ذیل کتابوں میں پیش کر کے ملت کی مستقل رہنمائی کا سامان بھی کر دیا۔ جیسے، ہندوستانی مسلمان، قیادت نامہ، تصویر ملت، خلیج ڈائری، صبح کشمیر، کشمیر میں امن، وغیرہ۔

اس دور کا پیغام وخصوصیات: ملی مسائل پر مولانا کا موقف شروع ہی سے بالکل واضح رہا۔ مگر بدقسمتی کہیے کہ کسی نے اس کو سمجھنے کی ذرا بھی زحمت نہ کی ۔ ورنہ مسلمانان ہند کی تاریخ بربادی کے بجائے تعمیرِ نو کی تاریخ ہوتی ۔ مولانا کے نزدیک قرآن وسنت میں جس طرح ذکر و عبادت کے احکام موجود ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے اجتماعی امور کی رہنمائی بھی موجود ہے ۔ اسی کی روشنی میں ان کو حل کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اس دور میں:

1۔ الرسالہ کی اشاعت بہت کم ہو گئی۔ مگر مولانا نے اس کی پرواہ نہ کی ۔ یہ واقعہ مولانا کی بےلوث ملی خیر خواہی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

2۔ مولانا کو بدنام کرنے کا لوگوں کو بہترین موقع مل گیا۔ چنانچہ ملت کے نادان دوستوں نے اپنی سادہ لوحی سے طرح طرح کے بے بنیاد الزامات لگا کر مولانا کو خوب بدنام کیا اور عوام کو مولانا سے بدظن کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس کی وجہ سے ملت کو تو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا، مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ عنداللہ وہ ان الزامات کو کیسے ثابت کر پاتے ہیں۔

3۔ مولانا کے گرد ہر طرح کے لوگوں کی جو بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی وہ غبار کی طرح چھٹ گئی۔

اس دور کو تحریک الرسالہ کا سب سے مشکل ترین دور سمجھا جاتا ہے ۔ مگر میرے نزدیک یہی دور الرسالہ تحریک کی مضبوطی اور تقویت کا اصل دور ہے۔ اس لیے کے اس دور میں جو بھیڑ جمع تھی وہ تو چھٹ گئی اور جنھوں نے ''علی وجہ البصیرۃ'' اس مشن کو اختیار کیا تھا، وہی لوگ جمے رہے اور مولانا کے مستقل ساتھی بنے۔

تیسرا دور ''معرفتِ دعوت'': یہ دور 1996ء سے لے کر 2021ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کو علامتی طور پر ''معرفتِ دعوت'' کا دور کہہ سکتے ہیں۔ مولانا کا اصل مشن ہی دعوت الی اللہ رہا ہے بلکہ مولانا کی فکر کو اگر کوئی ایک نام دینا ہو تو اسے دین کی ''دعوتی آئیڈیالوجی'' کہہ سکتے ہیں۔ مولانا نے بہت صحیح لکھا ہے کہ اس امت کے لیے اگر کوئی کامیاب اقدامی عمل ہے تو وہ ''دعوت الی اللہ'' کا عمل ہے۔ دعوت شاہ کلید ہے، دعوت ہر کامیابی کا سرا ہے، دعوت تکمیل ایمان و معرفت بھی ہے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

''ایمان جب اپنی آخری انتہا کو پہنچتا ہے تو وہ دعوت بن جاتا ہے۔ دعوت دوسرے لفظوں میں کائنات کے غیر ملفوظ نغمہ کو الفاظ کی صورت دینا ہے۔ داعی خدا کی خاموش نشریات کو با آواز اعلان میں منتقل کرتا ہے۔ وہ خدائی پیغام کو سن کر اسے انسانوں تک پہنچاتا ہے''۔ (اللہ اکبر، صفحہ 35)

چنانچہ اس کام کے لیے ایک طرف عصری اسلوب میں دعوتی لٹریچر تیار کیا۔ دوسری طرف دعوتی ٹیم کو تیار کرتے رہے۔ دعوت کے ہر پہلو کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا، دنیا کو دار الدعوۃ قرار دیا، داعی اور مدعو کے تعلق کی نزاکتوں کو سمجھایا، آداب دعوت و اسلوب دعوت سے روشناس کرایا، جدید دور میں پیدا ہونے والے دعوتی امکانات اور اس کی موافقت میں جو علمی تحقیقات تھیں ان کو قابل فہم بنایا۔ الغرض دعوتی ضرورت کے ہر نکتہ کی مکمل تفہیم و تبین کی۔ اور اس راہ کو اپنانے کے لیے بطور تشجیع کہا کہ اصحابِ رسول وہ لوگ تھے جو اپنی پچھلی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کا خلاصہ تھے۔ انہوں نے خدائی مشن اور خدا کے منصوبۂ تخلیق کو سمجھا اور رسول اللہ کے ساتھ مل کر اس مشن کو تکمیل تک پہنچایا۔

بالکل اسی طرح آج بھی خدا نے پچھلے پانچ سو سالہ عمل کے ذریعہ دوبارہ وہ سب موافق دعوتی امکانات و مواقع پیدا کر دئے ہیں جن کو استعمال کرتے ہوئے دوبارہ دین کا فکری اظہار کر کے تاریخ کو دہرایا جاسکتا ہے۔ گویا خدا کے فرشتے پکار رہے ہیں ''من انصار اللہ''۔ اور زمین و آسمان کو انتظار ہے کچھ خدا کے ایسے بندوں کا (نہ کہ بھیڑ کا)، جو ایک طرف اس خدائی پلاننگ اور جدید دعوتی امکانات کا گہرا ادراک رکھتے ہوں اور دوسری طرف ان کی معرفت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ وہ فرشتوں کی پکار کو سن کر زبانِ حال سے ''نحن انصار اللہ'' کی تصویر بن جائیں، اور ''اصحابِ رسول'' کی

طرح اپنے آپ کو اس خدائی مشن میں لگا کر ’’اخوانِ رسول‘‘ کی فہرست میں اپنا نام شامل کرو اسکیں۔

اس دور کی نمائندہ کتابیں یہ ہیں: دعوتِ اسلام، دعوت حق، دورِ دعوت، مضامینِ اسلام، کتاب معرفت، اظہارِ دین وغیرہ۔

اس دور کا پیغام وخصوصیات: قرآن کے مستند ومعیاری تراجم ملکی وعالمی زبانوں میں شائع کرنا، اور حدیث رسول میں کی گئی ادخال کلمہ کی پیشین گوئی کے مطابق تمام انسانوں تک قرآن کو پہنچانا۔

اس دور میں—

1۔ 2001ء میں CPS International کو قائم کیا گیا۔

2۔ 2010ء میں القرآن مشن کی شروعات کی گئی۔

3۔ گڈ ورڈ کے تحت اب تک 30 سے زیادہ ملکی اور بین الاقوامی، زبانوں میں تراجم قرآن کی اعلی معیار پر اشاعت ہوچکی ہے۔

4۔ ملک اور بیرونی ممالک میں بڑے پیمانے پر قرآن ڈسٹری بیوشن کا کام جاری ہے۔

دوسرے اور تیسرے دور میں تحریکِ الرسالہ سے جڑنے والے اللہ کے مخلص بندوں پر مشتمل ایک مضبوط CPS کی ٹیم وجود میں آچکی ہے اور ان شاء اللہ یہی لوگ اللہ کی نصرت وتوفیق سے اس مشن کو تکمیل تک لے جائیں گے۔ (30.5.2021)

---

مولانا نے ہر وقت دعوتِ دین کو آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ یقیناً اُن کی موت بھی اُن کے دعوت کے کام کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنے گی۔ جولوگ مولانا کو نہیں جانتے تھے اُن تک جب یہ خبر پہنچے گی تو وہ بھی اُن کی دینی خدمات سے واقف ہوجائیں گے اور یوں دعوتِ دین کا کام اور تیزی سے آگے بڑھے گا۔ (سوہان، فیصل آباد)

# مولانا وحید الدین کی فکر کا ایک مطالعہ

خالد محمود، کشمیر، پاکستان

غالباً 1990ء کی بات ہے جب میں نے مولانا وحید الدین کی کتاب رازِ حیات کا مطالعہ کیا۔ پھر تقریباً تین سال تک میں بار بار اس کتاب کو پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کی دیگر کتابیں بھی میں نے حاصل کیں اور سب کا مطالعہ کیا۔ آج میں نے مولانا کی ساری کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔ آپ کی کتابیں ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کے لیے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھ کر ان سے اپنے لیے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ آپ کی کتابوں کو پڑھ کر میں نے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔ (1) غیر مسلموں کو دعوت کے ذریعے دائرہ اسلام میں لانا آپ کی فکر کی بنیاد ہے۔ (2) آپ کا یہ کہنا ہے کہ غیر مسلموں تک اللہ کا پیغام پہنچانا نہ صرف اللہ کا حکم ہے بلکہ اللہ کے اس حکم کو پورا کرنے کے بعد ہی ہمیں دنیوی اور اخروی ترقی ملے گی۔ (3) غیر مسلموں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے مسلمانوں کو اپنے رویے اور سوچ میں تبدیلی لانی ہوگی۔ (4) رویے میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ یک طرفہ طور پر اعلیٰ اخلاق کا معاملہ کرنا ہے۔ (5) سوچ میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ ہمیں پوری خیر خواہی کے ساتھ دلی طور پر غیر مسلموں سے ہمدردی کرنی ہے۔ (6) جب ہم اپنے ظاہر و باطن میں غیر مسلموں سے ہمدردی کریں گے تو جوابی طور پر وہ بھی اسلام کے قریب آئیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی حاصل کریں گے۔ (7) مسلمانوں کو اپنے مذہبی روایتی ڈھانچے سے اوپر اٹھ کر حقیقی اسلام کو دوبارہ دریافت کرنا چاہیے۔ (8) اسلام کو دوبارہ دریافت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ باپ دادا سے ملے ہوئے دین کو ذاتی طور پر سمجھا جائے اور پھر ذاتی دریافت کے طور پر پورے یقین کے ساتھ اس کو مانا جائے۔ تو اس طرح ماننے سے ہی ہم صحیح مسلمان بن سکتے ہیں اور دوسروں کو اس کا حقیقی فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ (9) مولانا کے نزدیک تلوار کے ذریعے کسی کو فتح کرنا جہاد کی ایک معمولی شکل ہے، جب کہ دلیل کے ذریعے کسی کو قائل کرنا جہاد کی سب سے بڑی اور عظیم شکل ہے۔ (10) مسلمانوں کے پاس سب سے بڑی دلیل قرآن پاک ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے جہاد کرنے کی ترغیب دی ہے۔

(11) ہر زمانے کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ پرانے ادوار میں تلوار کے زور پر اپنی بات منوائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو بھی اپنے دفاع میں تلوار اٹھانی پڑی۔ لیکن اسلام اُس دور میں بھی قرآن پاک کے ذریعے ہی پھیلا۔ (12) موجودہ دور تو ہے ہی دلائل کا دور۔ اس لیے آج بھی اسلام قرآن پاک کو بطور دلیل سامنے رکھ کر ہی پھیلے گا۔ (13) قرآن کو دلیل بنانے کے لیے اس کو سمجھنا پڑے گا، اور اس کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ (14) اور خود مولانا نے کیا شاندار محنت کی۔ 25 سال کی عمر تک مدرسے میں پڑھتے رہے، اور پھر 25 سال تک ذاتی مطالعے کے ذریعے انگریزی زبان سمیت جدید علوم سے آشنا ہوتے رہے۔ (15) 50 سال کی عظیم الشان محنت کے بعد آپ نے دردِ دل سے اپنے جذبات اور خیالات ساری دنیا تک پہنچائے۔ درد دل سے نکلی ہوئی اس آواز نے قلب سلیم والوں کو بہت متاثر کیا۔

مولانا کے خیالات اور جذبات پر کچھ لوگ سیاسی اور مذہبی حوالے سے تنقید کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقید میں وزن نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی تنقید میں دلیل نہیں ہے۔ دردِ دل نہیں ہے۔ 50 سال کی عظیم الشان محنت نہیں ہے — کسی پر صرف اس لیے تنقید نہیں کرنی چاہیے کہ اس کی فکر ہماری روایتی سوچ کے مطابق نہیں ہے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ فکر دلائل مطابق ہے یا نہیں۔

---

کل نفس ذائقۃ الموت، آج مولانا نے رختِ سفر باندھا کل ہماری باری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا انسانیت کو کیا دے کر گئے اور جس دن ہم یہاں سے جائیں گے ہم کیا دے کر جائیں گے۔ میں یہ عہد بھی کرتا ہوں کہ میں مولانا کے مشن کو جاری رکھوں گا اور اپنے اللہ کے حضور دست بدعا ہوں کہ اللہ میرے اس عزم کو زندگی کے آخری سانس تک ایسے جواں رکھ جیسے مولانا کے عزم جواں تھے۔ اللہ میرے عہد کو تقویت عطا فرما کیوں کہ تیری مدد کے بغیر کسی عزم پر قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔ (محمد فاروق، لاہور)

# بڑے نانا سے میں نے کیا سیکھا

مزطرب خان، فیض آباد

مولانا وحید الدین خاں صاحب میرے نانا کے بڑے بھائی تھے۔ میرے نانا تین بھائی تھے، ان میں مولانا دوسرے نمبر پر تھے اور میرے نانا تیسرے نمبر پر (تفصیل کے لیے دیکھیے الرسالہ مئی 2012)۔ مولانا سے میرا شعوری تعلق اس وقت شروع ہوا جب مجھے دہلی میں ایک مہینہ رہنے کا موقع ملا۔ اس وقت میں teenager تھی۔ اس دوران روزانہ میں مولانا سے ملتی رہی۔ وہ ایک مہینہ میری زندگی کا turning point تھا۔ اور وہ میری سب سے cherished memory ہے۔

میں اپنے آپ کو بالکل nothing سمجھتی تھی، مگر مولانا نے مجھے movtivate کیا اور مجھے یہ احساس دلایا کہ میں بھی کچھ کرسکتی ہوں۔ اس دوران مولانا نے میری زندگی میں خدا کا احساس بھر دیا۔ ایک مہینہ گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مستقبل میں مجھے اس خدائی مشن کا حصہ بننا ہے۔ اللہ نے نانا کے ذریعے میری upbringing کروائی، یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔

نانا کے ذریعے مجھے دنیا کی life of desire سے دوری ہوئی اور خدا کو پانے کا desire بڑھتا گیا۔ انھوں نے میرے اندر بہت کم عمر میں ہی God-oriented زندگی گزارنے کا بیج ڈال دیا تھا۔ ان کے ذریعے میں نے وہ informal education پائی جو سب سے زیادہ important ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ اس پر فوکس نہیں کرتے ہیں۔ انسان formal education میں کتنی ہی ڈگری حاصل کرلیتا ہے مگر میں نے یہ جانا کہ informal education سے ہی انسان اعلی انسان بن سکتا ہے۔ مولانا سے جو کچھ میں نے سیکھا، ان میں سے چند باتیں یہ ہیں:

1۔ ہر چیز کو خدا سے connect کرنا خدا سے قریب کرتا ہے۔ ہر سچویشن کو ہینڈل کرنے میں ہیلپ کرتا ہے اور ہمیں right path پر رکھتا ہے۔

2۔ لوگ دوسروں کی غلطیوں کو point out کرتے ہیں۔ میں نے مولانا سے سیکھا کہ اپنی غلطیوں کو ڈھونڈو۔

3۔ کسی بھی سچویشن میں نگیٹیو نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو positively/creatively مینج کرنا ہے۔

4۔ صرف ritual کر کے خدا سے گہرا تعلق پیدا نہیں ہوتا، بلکہ تدبر و تفکر کے ذریعے خدا سے حقیقی قربت حاصل کی جاسکتی ہے۔

5۔ لوگ self-interest کے لیے دنیا میں کام کرتے ہیں۔ مگر نانا نے ہم لوگوں کو خدا کے لیے کام کرنے کا موقع دیا۔ مولانا نے بتایا کہ خدا کا کام سب سے بڑا ہے۔ اِس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ اس کام سے ہمارا development ہوگا اور آخرت میں ہمیں نجات ملے گی۔

یہ چند لرننگس تھیں جو میں نے share کیں۔ مگر جب ہم مولانا کی books کو پڑھیں تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ مولانا کی writings اور lectures ہماری فطرت کی آواز ہیں۔

خدا کے بعد ماں باپ کا حق ہے۔ یہ میں نے جانا ہے۔ مگر میں نے یہ realize کیا ہے کہ ماں باپ وہ اصل ماں باپ ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو خدا سے connect کر دیں نہ کہ دنیا سے جوڑ دیں۔ لوگ اپنے بچوں کو material world سے جوڑتے ہیں۔ مولانا نے مجھے spiritual world/God سے جوڑا ہے۔

مولانا صاحب نے صرف مجھے نہیں ساری دنیا کو اپنی فیملی ممبر کی طرح treat کیا ہے۔ انھوں نے ہمیں اتنا کچھ دے دیا ہے جو دنیا کی تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ میری دعا ہے کہ میں بھی نانا کی طرح سارے عالم کے لیے well wisher بن سکوں۔ میرے لیے مولانا خدا کی ایک عظیم بلیسنگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو مولانا کے ساتھ جنت میں رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ یہ ایسا خلا ہے جو صدیوں میں بھی پر نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے الحمدللہ ان کے علم سے بے انتہا استفادہ حاصل کیا۔ ان کی ہر تحریر سیدھا دل پر وار کرتی ہے۔ یہ ان کے اخلاص کا کمال تھا۔ (احمد شاہ جمیل، پاکستان)

# اسلام کا داعیٔ بے مثل

نعیم بلوچ، لاہور

''مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی پر سب سے اچھی تنقید مولانا وحید الدین نے کی ہے۔ آپ 'تعبیر کی غلطی' پڑھیے''۔ سال تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ یہ اس دور کی بات ہے جب استاد محترم (جاوید احمد غامدی) سلطان پورہ میں تشنگان علم کے لیے آسودگی کا باعث تھے۔ اور ہماری ان سے ملاقات کو شاید ابھی دو ڈھائی برس ہی ہوئے تھے۔ استاد محترم کی بہت سی عنایات میں سے ایک یہ بھی ہے وہ ہمیں مختلف اہل علم کی تصنیفات اور عالم اسلام کی علمی شخصیات سے متعارف کراتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا وحید الدین سے تعارف انھی کی وجہ سے ہوا۔

'تعبیر کی غلطی' بڑی مشکل سے ملی۔ معلوم ہوا کہ ایک جماعت کے کچھ لوگوں نے کتاب کے شائع ہوتے ہی بازار سے اس کے زیادہ تر نسخے اٹھا لیے تھے۔

اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم پایا۔ پہلے حصے میں مولانا وحید الدین خاں نے وہ داستان ہوش ربا بیان کی تھی کہ وہ کیسے اس کتاب کو شائع کرنے پر مجبور ہوئے۔ اسے پڑھنے کے بعد قاری مولانا مودودی کے بارے میں خوف ناک تحفظات کا شکار ہو سکتا ہے یا وہ مولانا وحید الدین کو جھوٹا قرار دے کر کتاب ایک طرف رکھ دے گا کہ بانی جماعت اسلامی ایسے کردار کے مالک نہیں ہو سکتے۔

میں تو یقیناً کتاب ایک طرف رکھ دیتا، لیکن میرے ذہن میں مولانا مودودی سے انتہائی 'عقیدت' کے جذبات کچھ کچھ مجروح ہو چکے تھے۔ اصل میں، جماعت اسلامی سے ہمدردی رکھنے کی وجہ سے اس کی تاریخ کا مطالعہ بھی کرتا تھا۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ ماچھی گوٹھ (17 تا 21 فروری 1957ء) کے اہم اجلاس کے بعد مولانا مودودی نے جو کچھ کیا، اس کی کیا اخلاقی توجیہ کی جا سکتی ہے؟

واضح رہے کہ 53-1951 کے صوبائی انتخابات میں جماعت اسلامی نے بڑے زور شور سے حصہ لیا تھا۔ لیکن اسے توقعات سے برعکس انتہائی سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر پیدا ہونے والی بے چینی کا نتیجہ ایک کمیٹی کی شکل میں نکلا جس نے جماعت کے اراکین شوریٰ سے ملاقاتوں کے بعد اپنی یہ

سفارشات پیش کیں کہ جماعت اسلامی کو عملی سیاست میں آنے سے پہلے معاشرے کی فکری اور اخلاقی تربیت کے کام کو اولیت دینی چاہیے۔ لیکن مولانا مودودی نے انتہائی غیر جمہوری اور غیر اخلاقی انداز میں کمیٹی کی ان سفارشات کے خلاف فضا پیدا کر دی۔ اس کی وجہ سے جماعت اسلامی کے بڑے بڑے رہنما جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ ان میں مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر اسرار احمد بھی شامل تھے۔

اس داستان کو پڑھنے کے بعد جماعت اسلامی کی تاریخ سے واقف ہر غیر جانب دار شخص پر واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی اپنے مخصوص دینی نظریات اور حکومت الہیہ کے خود ساختہ تصور کی ترویج کے لیے بہت سے اخلاقی اصولوں کے قائل نہیں ہیں اور جماعت اسلامی اصل میں جمہوری اقدار کے بجائے بعض انتہائی فاشسٹ اور آمرانہ خصائص کو دین کا حصہ سمجھتی ہے۔ اور اس حقیقت کی گواہی اسے جماعت کی عملی جدوجہد کی تاریخ کے ہر صفحے پر جا بجا ملتی ہے۔ تعبیر کی غلطی کا پہلا حصہ اس کا دستاویزی ثبوت ہے۔

تعبیر کی غلطی کا دوسرا حصہ ایک اعلیٰ درجے کی علمی تحقیق ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جماعت اور مولانا مودودی پر متعدد علماء کی علمی تنقیدیں نکلیں تھیں لیکن یہ محض تاثراتی تھیں۔ علماء ان پر کامیاب علمی نقد نہیں کر سکے تھے۔ لیکن مولانا وحید الدین خاں نے اس تنقید کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے بتا دیا کہ مولانا مودودی کی فکر ان کی کتاب 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات' پر استوار ہے۔ اس میں انھوں نے الہ، رب، عبادت اور دین کو زیر بحث لا کر ایک بہت بڑا دعویٰ کیا ہے کہ ان چار اصطلاحات پر قرآن کا درست فہم منحصر ہے لیکن امتداد زمانہ سے ان کا درست فہم اس قدر گہنا چکا ہے کہ لغات میں بھی وہ فہم موجود نہیں رہا جو اصل میں تھا۔ اس لیے دین کی تعبیر وہ نہیں رہی جو حقیقت میں تھی۔ اس کے بعد انھوں ان اصطلاحات کی وضاحت کی اور اپنے تئیں ان کی معنی متعین کیے۔

اس کے بعد مولانا وحید الدین خاں نے دلائل کے ساتھ واضح کیا کہ مولانا مودودی کی یہ تفہیم بالکل غلط ہے۔ یہ خود ساختہ ہے۔ اس سے دین کی ایک نئی تعبیر سامنے آئی ہے جس کو انھوں نے بعد میں اپنی دوسری کتاب میں 'دین کی سیاسی تعبیر' کا نام دیا۔ کیونکہ مولانا مودودی دین کو 'ریاست'، عبادت کو 'ٹریننگ کورس' اور رب اور الہ کو ایک ایسی ذی اقتدار ہستی کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اپنی مرضی کو آخری معنوں میں زمین پر نافذ دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس تعبیر کی روشنی میں دین کی تشریح یہ ہوئی کہ اصل میں یہ دنیا اللہ کی ریاست ہے۔ اللہ تعالیٰ کو الہ اور رب ماننے کا تقاضا ہے کہ اس کی

مرضی کو پورے انسانوں پر نافذ کر دیا جائے۔ اس لیے سوائے اسلام کے دنیا پر کسی کی حکومت نہیں ہونی چاہیے۔ اسی کا غلبہ ہونا چاہیے۔ اس لیے اسلام اور کچھ نہیں بس غلبہ دین کی جدو جہد ہے۔ ساری عبادات اس کی ٹریننگ ہے، دعوت، تبلیغ اور جہاد اس منزل کو حاصل کرنے کا راستہ ہے۔

اس کے برعکس، مولانا وحیدالدین خاں فرماتے ہیں کہ زیر بحث اصطلاحات کے فہم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ انھوں نے قرآن مجید اور اسلامی تاریخ کے جید ائمہ اور علماء کی رائے نقل کر کے بتایا کہ الہ کا مطلب 'اللہ تعالیٰ' ہے، جس میں تمام جملہ صفات آتی ہیں۔ مگر مولانا مودودی نے اس میں ایک صفت حاکم مطلق کو تمام صفات پر حاوی کر کے الہ کے معنی کو محدود بھی کیا، اور یک رخا بھی۔ اس طرح 'رب' کا مطلب اصل میں تو پالنے والا ہے لیکن اس میں مالک و آقا کا مفہوم بھی متضمن ہے، مگر مولانا موصوف نے اس میں اسی معنی یعنی مالک و آقا کو لے لیا اور جب دونوں مفہوم کو ملایا تو اچھا خاصا تمام صفات کا حامل اللہ تعالیٰ محض ایک ڈکٹیٹر فرماں روا بن گیا۔

یہی حال عبادت اور دین کا ہے۔ عبادت تضرع، عجز اور فروتنی کا نام ہے۔ آپ خود کو اپنے معبود، خالق و آقا اور رحمان خدا سے انتہائی کم تر اور انتہائی کمزور مان کر اس سے مانگتے ہیں اور اس کی محبت میں حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ لیکن جب آپ اسے اصل میں حکمران سمجھتے ہیں، عبادت کو اللہ کی سلطنت میں کام کرنے کی قوت کے حصول کا ایک آلہ سمجھتے ہیں، اپنے آپ کو اللہ کی زمین پر اللہ کے اقتدار کو بحال کرنے کا ایک کل پرزہ سمجھتے ہیں تو آپ میں عجز نہیں فخر و برتری کا جذبہ پیدا ہوگا۔ آپ بندے نہیں، فوجی پریڈ میں تن کر کھڑے کمانڈوز ہوں گے۔ آپ کا رخ اپنی تربیت پر نہیں، دوسروں کی ایسی تیسی کرنے کے طریقوں پر ہوگا۔ مولانا وحیدالدین خاں نے اپنی تشریح میں متعدد مثالیں بھی دی ہیں. اور جماعت اسلامی کے معتقدین کا یہ پسندیدہ شعر تو ان کے اس دعوے کو آخری حد تک ثابت کر دیتا ہے کہ:

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلمان ، میں اسی لیے نمازی !

مولانا وحیدالدین خاں کی اس ساری تنقید کو ہم قرآن مجید کی ایک اصطلاح میں سمجھنے کی کوشش کریں تو وہ اقامت دین ہے۔ مولانا مودودی اس کا مطلب ''دین نافذ'' کرنا بیان کرتے ہیں اور مولانا وحیدالدین خاں دین پر قائم رہنا۔ ایک غیر مسلم ریاست میں اس آیت پر مولانا مودودی کے

نظریے کے مطابق عمل اس طرح ہوگا کہ آپ وہاں غیر مسلموں کی حکومت کو ختم کرکے وہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کی کوشش کریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ چین ہو یا روس ایسی ''باغیانہ کتاب'' کی اشاعت پر پابندی لگائے گا۔ اور عملاً صورت حال یہ ہوگی کہ وہ کروروں مسلمان جو غیر مسلم ممالک یا اسلام کو سرکاری مذہب نہ ماننے والے مسلم ملکوں میں بستے ہیں وہ کامل ایمان کا مظاہرہ کریں تو انھیں اپنی اپنی حکومتوں سے بغاوت کردینی چاہیے یا اضطرار کے اصول پر جس طرح حرام کھایا جاتا ہے اسی طرح وہ ان حکومتوں میں رہیں گے اور جیسے ہی موقع ملے گا، کافروں اور زندیقوں کی حکومت کو ختم کرکے اعلائے کلمۃ اللہ کا جھنڈا بلند کریں گے۔ اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ مولانا مودودی غیر اسلامی ملک میں رہنا تو دور کی بات وہاں کی نوکری کو بھی حلال نہیں سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ قرارداد مقاصد کی منظوری سے پہلے پاکستانی حکومت کی نوکری کو جائز بھی نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس، مولانا وحیدالدین خاں اور تمام ائمہ وعلماء کی تشریح کی روشنی میں دین پر قائم رہنے کا حکم ہے اور یہ کہ دین ریاست کے ہم معنی نہیں، بلکہ حقائق یعنی عقائد کو مان کر اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا نام ہے۔ اس لیے جب آپ پر نماز فرض ہوگی، آپ نماز پڑھیں گے، روزہ رکھیں گے، انفاق کریں گے، استطاعت ہوگی تو حج کریں گے، قربانی کریں گے۔ اسی طرح آپ مسلمان ریاست میں حکمراں یا سیاسی اثر ورسوخ رکھتے ہیں تو اسلامی شریعت کے نفاذ کی آئینی حدود میں رہ کر کوشش کریں گے۔ جیسے آپ کو زکوٰۃ اور انفاق تب کرنا ہے جب آپ کے پاس اس کی گنجایش ہوگی۔ یہ نہیں کہ اس کو ادا کرنے کے لیے پہلے دولت اکٹھی کریں گے پھر انفاق کریں گے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کرنا ہے کہ پہلے آپ اسلامی ریاست قائم کریں گے یا حکومت حاصل کرنے کے لیے کوئی جماعت اسلامی بنائیں گے، پھر حکومت حاصل کرکے اسلامی نظام نافذ کریں گے۔

مولانا وحیدالدین خاں کہتے ہیں کہ اسی لیے جماعت کے لٹریچر میں واضح الفاظ میں پہلے اس مفہوم کی عبارت لکھی ہوتی تھی کہ حکومت الہیہ کا قیام ہر مسلم مرد وعورت پر فرض ہے۔ اس میں غیر جانب داری اصل میں باطل کی طرف داری ہے اور اگر آپ کے پاس ہماری حمایت نہ کرنے کی کوئی دلیل نہیں تو آپ اللہ کے حضور اپنا عذر تیار رکھیں ورنہ آپ آخرت میں جواب دہ ٹھیرائے جائیں گے۔ لیکن مولانا وحیدالدین خاں کے نزدیک یہ دین میں دخل اندازی ہے۔ اس میں ایک نئے حکم کا

اضافہ ہے۔ ایسا کوئی حکم اسلام میں نہیں۔ جس طرح قاتل، چوراورزانی وغیرہ کوسزا دینا ہر آدمی پر فرض نہیں اسی طرح شریعت کا نفاذ عام آدمی پر نہیں، حکمران پر فرض ہے۔ شارع نے کہیں بیان نہیں کیا تم شریعت نافذ کرنے کے لیے حکمران بنو۔

اسلام کی اس غلط تعبیر کے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے جا بجا بیان کیا کہ پاکستان میں اس کے لیے جماعت اسلامی نے کسی حد تک آئینی اور جمہوری طریقہ اختیار کیا لیکن جن معاشروں میں ان کو اس کی اجازت نہ ملی وہاں القاعدہ اور اس قبیل کی بے شمار مسلح تحریکیں منظم ہوگئیں۔ اسی لیے جماعت اسلامی کے سابق امیر مرحوم منور حسن (جو کسی مصلحت کے قائل نہیں تھے) اور ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی صاف لفظوں میں اسامہ بن لادن کو شہید قرار دے کر انہیں مجاہد اسلام کہتے رہے ہیں۔ اور مولانا وحیدالدین خاں تعبیر کی اس غلطی کے برے انجام کی طرف واضح الفاظ میں نشان دہی کرتے رہے ہیں۔

مولانا وحیدالدین خاں نے اس بات کو بھی واضح کیا۔ تعبیر کی یہ غلطی کیوں سرزد ہوئی، غلط ہونے کے باوجود مسلمان معاشروں میں یہ تعبیر اتنی مقبول کیوں ہوئی؟ انھوں نے بجا طور پر اس پر بہت زیادہ لکھا اور خوب لکھا۔ فرمایا کہ مسلمان دین میں جامد تقلید اور دنیا میں سائنسی اور جدید سماجی علوم میں پیچھے رہنے کی وجہ سے پہلے سیاسی زوال کا شکار ہوئے اور پھر اقتدار چھن جانے کی وجہ سے ردعمل کی نفسیات کا نشانہ بنے۔ ان کے لیڈروں، دانش وروں اور علماء نے غلط طور پر یہ سمجھا کہ ان کے ساتھ سازش ہوئی ہے۔ جب کہ وہ تو اپنی جہالت، تقلید اور زمانے کے نئے علوم سے بے گانہ ہونے کی وجہ سے یورپی اقوام کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے۔ اس موضوع پر انھوں نے جتنا شان دار لٹریچر تخلیق کیا ہے اس کی عالم اسلام میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس میدان میں وہ 'ون مین آرمی' تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے انتہائی دلچسپ، مدلل، اور آسان زبان میں لکھا۔ اور ماضی ہی نہیں وہ جدید دور کے مسائل کو بھی زیر بحث لاتے رہے۔ اور مسلمانوں پر زور دیتے رہے کہ وہ سازشی تھیوریوں سے باہر نکلیں، دشمن تو سازش کرتا ہی ہے۔ ہمارا کام اس کی سازش کو سمجھ کر اس کا شکار ہونے سے محفوظ رہنا ہے لیکن ہمارے اندھے راہ دکھلانے والے ہمیں ٹکراؤ کی تعلیم دیتے رہے۔ حالانکہ ہمیں اعراض اور بچاؤ کی پالیسی اختیار کرکے ہر میدان میں تعلیم کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ ان کا شاہکار جملہ ہے کہ تخریب

سے تعمیر ممکن نہیں، ہتھیار خریدنے والے ہتھیار بنانے والوں کو شکست نہیں دے سکتے۔ شور مچانے، احتجاج کرنے والے غور وفکر سے محروم رہتے ہیں۔

مولانا وحید الدین خاں کے لٹریچر اور علمی کاوش کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلام کی حقانیت کو واضح کرنے کے لیے مسلمانوں کی کردار سازی میں، اسلام کی دعوت کو پھیلانے کے لیے، مسلمانوں کے اندر مثبت ذہنیت کو پیدا کرنے کے لیے جو کام کیا اس کی مثال شاید ہی اسلام کی علمی، تحریکی اور سماجی تاریخ میں مل پائے۔ (یہ ایک لمبا موضوع ہے، جس پر مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے)

اتنی عظیم شخصیت کے ساتھ ادنیٰ سا تعلق بھی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اس لیے میں بہت خوش قسمت ہوں کہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر انھیں نوے کی دہائی میں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ ان سے خط وکتابت کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی اور انھوں نے آخرکار ہماری دعوت قبول کی اور وہ پاکستان تشریف لائے۔ میری خط وکتابت کا ذکر انھوں نے اپنے سفرنامے میں بھی کیا جو میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

---

یہ میرے لیے بہت زیادہ خوشی کی بات ہے کہ میں اللہ کے فضل وکرم سے مولانا وحید الدین خاں صاحب جیسی عظیم شخصیت کو پہچان پایا۔ جب کہ لوگوں نے ان پر بے دینی، کفر وفسق، الغرض ہر قسم کے شبہات کے پردے ان کے اوپر بطور الزام لوگوں نے ڈال رکھے تھے۔ اس کے باوجود مسلسل دعا سے مدد لے کر ان کی اصل شخصیت کو پہچانا اور پھر لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر ان سے جڑ گیا اور حتی المقدور استفادہ کیا۔ جب مجھ پر کھلا کہ مولانا عین قرآن وحدیث پر چلنے والے ہیں۔ ان کا الرسالہ عصری اسلوب میں اسلام کی تشریح ہے۔ تو پھر میں بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ ان کو پڑھنے لگا اور لوگوں کو بھی مطالعہ کے لئے ابھارتا رہا۔ لوگوں نے مجھے اندھی تقلید کے طعنے دیے ان سب کے باوجود میں ان سے جڑا رہا اور ان کی کتابوں کو پھیلاتا رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ جو مجھ کو مقلد کہتے ہیں وہ دراصل مولانا کو جانتے نہیں اگر جانتے ہوتے تو وہ بھی وہی کرتے جو میں کر رہا تھا۔ اصل کمی مجھ میں نہیں تھی بلکہ مجھ کو طعنہ دینے والوں میں تھی۔ (مولانا عبدالباسط عمری، گلبرگہ)

# مولانا وحید الدین خان، اپنی تصانیف کی روشنی میں

طاہر محمود، پاکستان

میری عادت ہے کہ کہیں بھی کوئی کتاب پڑی ملے تو اسے اٹھا کر سرسری طور پر ضرور پڑھا جائے۔ ایک دفعہ اسی طرح میں نے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس پڑی ہوئی کتاب اٹھا کر دیکھی تو مجھے اس کتاب میں کچھ خاص لگا۔ جب اس کا مطالعہ شروع کیا تو ایک ہی نشست میں ساری کتاب پڑھ لی۔ کتاب اتنی اچھی لگی کہ اس پر دیے ہوئے رابطہ نمبر پر کال کر کے میں نے مولانا کی تمام کتابیں منگوالی۔ کوئی سو سے زائد کتابیں ہوں گی۔ چند دنوں میں کتابیں وصول ہوگئیں اور الحمدللہ دن رات ایک کر کے تمام کتب مطالعہ کرلیں۔ ان کی کتب کا حاصلِ مطالعہ اور خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

1۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بندے کو اس کے رب کا تعارف کروانے اور اس سے جوڑنے پر انہوں نے بہت عمدہ اور پراثر لکھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت پر پڑھ کر سب سے بڑھ کر سکون ملتا ہے اور میں نے ان کی کتب میں یہ چیز سب سے بڑھ کر پائی ہے۔ آپ ان کی کتابیں ''اللہ اکبر'' اور ''الاسلام'' پڑھ لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ انہوں نے اس موضوع کا حق کس طرح ادا کیا ہے۔

2۔ ان کا دوسرا اہم موضوع ترغیب و تحریک (motivation) ہے۔ بلاشبہ میں نے اس موضوع پر ان سے بہتر تحریر کسی دوسرے مذہبی انسان کی نہیں دیکھی۔ ''راز حیات''، ''کتاب زندگی''، اور ''مقصد حیات'' اس موضوع پر کسی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

3۔ قرآن مجید پر انھوں نے کافی کام کیا۔ انھوں نے ''تذکیر القرآن'' نامی ترجمہ اور مختصر تشریح لکھی جو کہ عام فہم ہے۔

4۔ اس کے علاوہ اسلام اور جدید سائنس کے موضوع پر ان کا کام بہت گراں قدر ہے۔

5۔ انسانیت کو اسلام کی دعوت پر امن طریقے اور حکمت سے دینے پر ان کا کافی زور رہا ہے۔ اس پر انھوں نے کافی کتب تحریر کی ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ایسے بہت سے موضوعات ہیں جن پر انہوں نے بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا۔ لیکن یاد رہے کہ میں نے اپنے ذوق کے مطابق خلاصہ پیش کیا ہے۔

میری رائے میں وہ اس دور کے ایک عظیم اور درد دل رکھنے والے انسان تھے اور اللہ کریم نے ان سے اپنے دین کا بہت بڑا کام لیا ہے جس سے رہتی دنیا تک استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اس موقع پر ان کا دنیا سے یوں رخصت ہونا کسی حکمت سے خالی نہیں ہے کہ ہم لوگ کسی کے کام کو اس کے دنیا سے جانے کے بعد ہی جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ جو شخص بھی تعصب سے بالاتر ہو کر تاریخ کے اس اہم اور نازک موڑ پر ان کو مطالعہ کرے گا تو ایک نئی دنیا سے متعارف ہوگا اور ان کی بیش بہا خدمات کا اعتراف کیے بنا رہ نہیں سکے گا۔ (بشکریہ ماہنامہ انذار، کراچی)

---

مولانا وحید الدین خاں، ایک ایسے عالم جنھوں نے دین کی تبلیغ کے ساتھ زندگی آموز کتابیں بھی لکھیں اور بتایا کہ زندگی میں جامد فقہی احکام کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ ان کے اسفار، ان کی ڈائریاں اور انگریزی اخبارات سے زندگی آموز واقعات پر نوٹ سب قابل مطالعہ ہیں۔ بہت سال ہوئے کشمیر پر ان کا موقف پڑھا تھا تو طیش آیا تھا۔ آج سوجوتے کھا کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ درست کہتے تھے۔ زندگی اور سیاست سے متعلق ان کے جیسی بصیرت کسی اور عالم میں شاید ہی ہو۔ ''تعبیر کی غلطی''، کیسی مدلل کتاب ہے۔ انداز ایسا جیسے کہتے ہوں کہ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔ کوئی زور زبردستی نہیں، کوئی غصہ نہیں۔ یار عزیز ابوعمش ان کے پرستار تھے اور انھوں نے ہی ان کی تحریروں سے متعارف کرایا۔ ایک بار دیکھا کہ استنبول میں غلطہ پل کے سامنے مسجد میں ان کا کیا قرآن کا انگریزی ترجمہ مفت بٹ رہا تھا۔ اللہ کوششوں کو قبول کرے (سید کاشف رضا)

---

آہ۔۔ مولانا آپ سراپا محبت تھے، آپ پر اللہ کی رحمت ہو، ہمارے پاس تو آپ جیسا اب ایک بھی نہیں۔۔ آپ بھی چلے گئے۔۔ بلاشبہ مولانا کی وفات ایک عہد کا خاتمہ ہے۔۔ اب اس اسلوب کی خوشبو مزید کبھی نہیں اڑے گی کہ جس کا سحر قاری کو باندھ کے رکھے رہتا تھا۔۔ بسا اوقات کنٹینٹ سے اختلاف اپنی جگہ، مگر پریزینٹیشن آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ (عزیر سالار، پاکستان)

# مولانا وحیدالدین خاں کی فکر اور میرے تاثرات

سید اسفندیار، پاکستان

21 اپریل 2021 کو مولانا وحیدالدین خاں صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ دن بھی مجھے یاد ہے جس دن پہلی مرتبہ میرے ہاتھ میں مولانا صاحب کی کتاب آئی تھی۔ یہ 2003 کی بات ہے، رمضان کے مہینے کے آخری عشرے میں میں چند دوستوں کے ساتھ اعتکاف کے لیے بیٹھا تھا۔ میرے ایک دوست کے پاس مولانا صاحب کی کتاب اللہ اکبر موجود تھی۔ اس نے مجھے پڑھنے کے لیے دی۔ میں نے اس کتاب کے دو تین صفحات پڑھے اور اچانک ہی میری کیفیت بدل گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ اچانک میں نے کوئی چیز پالی ہو۔ جس کو میں بچپن سے ڈھونڈ رہا تھا۔ جیسے یہی کتاب میرے سوالوں کا جواب بن گئی ہو، میں نے محسوس کیا کہ جیسے اچانک میں نے راستہ ڈھونڈ لیا ہو، جس کے سہارے میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاؤں گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی اَن دیکھی طاقت نے میرے ہاتھ میں مولانا صاحب کی کتاب تھما دی ہو اور سرگوشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا ہو کہ اس کتاب کو پڑھو۔ میں نے اس کے بعد ساری کتاب ایک ہی رات میں ختم کر ڈالی اور اگلے دن دوست سے کہا اس مولانا صاحب کی کوئی دوسری کتاب مجھے پڑھنے کے لیے دو۔

میری جب مولانا صاحب کی فکر سے شناسائی ہوئی تو اس پر میں خدا کا شکر بجالایا تھا کہ یہ خدا کی طرف سے میرے اوپر مہربانی ہے اور اس سے بھی زیادہ blessing میں سمجھتا ہوں جب میں اپنی جوانی کے ابتدائی سالوں میں تھا میں اس وقت انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا جب مولانا صاحب کی فکر سے روشناس ہوا۔

مولانا صاحب کی مثبت طرزِ فکر سے میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ شاید اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ بہت کم ہیں اور بات بہت بڑی:

1۔ مولانا صاحب کی فکر سے میں نے آج کے دور میں خالص اسلام کو جانا۔

2۔ مولانا صاحب کی فکر سے میں نے اسلام کو تجرباتی کیفیت کے طور پر دریافت کیا۔

3۔ مولانا صاحب کی فکر سے میں نے اسلام کی سچائی کو بے آمیز شکل میں دیکھا۔
4۔ مولانا صاحب کی فکر کو پڑھنے کے بعد میری بے قیمت زندگی مجھے قیمتی نظر آنے لگی۔
5۔ مولانا صاحب کی فکر سے میں نے پایا کہ میری اندرونی تڑپ نے باہر کی دنیا سے مطابقت کرلی ہو اور جیسے میرے سوالوں کا جواب مجھے مل گیا ہو۔
6۔ مولانا صاحب کی فکر سے میں نے دورِ حاضر کے عصری اسلوب کو بہتر طور پر سمجھا۔
7۔ میں سمجھتا ہوں کہ پوری امت مسلمہ میں واحد مولانا صاحب کا لٹریچر ہے جو جدید افکار کا مقابلہ کرسکتا ہے۔
8۔ مولانا صاحب کے لٹریچر کے مطالعے کے بعد میں نے اپنی پوری سوچ میں مثبت تبدیلی محسوس کی اور اپنے دنیوی معاملات کو مثبت طرز فکر سے حل کرنے کی کوشش کی۔
9۔ مولانا صاحب کے فکری نظریات سے دین اسلام کو میں نے واحد مستند دین سمجھا۔
10۔ مولانا صاحب کا لٹریچر آدمی کو ایک حقیقت پسند انسان بناتا ہے۔
11۔ میں نے مولانا صاحب کے لٹریچر سے خدا کے منصوبۂ تخلیق کو بہتر انداز میں سمجھا۔
12۔ مولانا صاحب کے لٹریچر سے انسان کا ذہنی ارتقا ہوتا ہے۔

---

سوشل میڈیا پر مولانا صاحب کے اتنے چاہنے والوں کو دیکھ کر رشک آیا۔ کسی بڑی شخصیت کے اس دنیا سے چلے جانے کا بعد اس شخصیت کے ساتھ وفاداری کا واحد راستہ یہ ہے کہ اس کے مشن کو زندہ رکھا جائے، اور اس کو مسلسل چلاتے رہنا چاہیے۔ یوں تو دنیا میں بہت ساری شخصیات آئیں اور چلی گئیں، بعض اپنے زمانے میں مشہور بھی تھے لیکن زمانے نے جب کروٹ بدلی تو اس شخصیت کو کوئی پہچاننے والا بھی نہ تھا، اور بعض ایسے ہیں کہ جن کا نام اب بھی دنیا کے ہر کونے میں زندہ ہے۔ انسان اپنی جسمانی زندگی کے حساب سے اس دنیا میں محدود مدت کے لیے آتا ہے لیکن انسان اگر اچھی کارکردگی دکھاتا ہے تو فکری و عملی حساب سے وہ ہزاروں سال زندہ رہ سکتا ہے۔ شخصیات کا دارومدار اس کے فالورز کی وفاداری و بے وفائی پر ہوتی ہے۔ فالورز وفا کرلیں اور مشن کو زندہ رکھیں تو شخصیت ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہے، ورنہ نہیں۔۔۔ (سراج احمد بادینی)

# مولانا وحیدالدین خان کے اہم افکار کا خلاصہ

مولانا ابوالمرجان فیضی، مالیگاؤں

1 – مثبت منفی: حالات وواقعات چاہے کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہوں، سازشوں کی بادصرصر چلے، پتھروں کی بارش ہو، آپ ان سے مثبت پیغام لو، پتھروں سے سیڑھی بنا کر بلندی کی طرف چڑھ جاؤ، ان پر اخلاق کا اتنا دباؤ ڈالو کہ ان پتھروں سے بھی پانی نکلنے لگے.. حل یہی ہے اور یہاں ہے..

2 – کنڈیشنڈ مائنڈ و ڈی کنڈیشنڈ مائنڈ: مخصوص حالات وظروف، بہت سے حادثات و واقعات، بعض افرادواقوام کے سابقہ برتاؤ کے تناظر میں ہم پہلے سے طے کیے رہتے ہیں کہ اگر ادھر سے کوئی چیز آئے گی تو ہمارے خلاف ہی ہوگی۔ دماغ صاف رکھو۔ ہمارا دماغ پیار ومحبت اور اچھی و مفید معلومات کے لیے بنا ہے، نفرت کو ذخیرہ کر کے رکھنے کے لیے نہیں۔ ہر نئے واقعے کو نئے سرے سے لو، اسے اچھا شگون مانو، اس کو بھلائی پر محمول کرو، اس سے وہ نتائج نکالو جو ہمارے حال و مستقبل کے لیے مفید ہو۔ پہلے سے موجود معلومات کی بنیاد پر دماغ کو ہر نئے واقعے کی آٹو کرکشن کی اجازت نہ دو۔

3 – خدا کی معرفت: خدا میں جیو، اسے پہچانو، اپنی ذات میں خدا کو پہچانو، پیش آنے والے واقعات میں خدا کو ڈھونڈھو، فطرت میں خدا کو تلاش کرو، دریاؤں، صحراؤں، بستیوں، تنہائیوں، اونچائیوں، پستیوں، قدرتی مناظر اور فطرت کے حادثات میں خدا کی معرفت حاصل کرو۔ اس سے نتائج اخذ کرو اور سبق لو۔

---

آہ... مولانا وحیدالدین خان کی وفات نے رنجیدہ کر دیا ہے.... کیا کمال کے شخص تھے۔ برصغیر کے ایسے ماحول میں انہوں نے برداشت اور میانہ روی کا درس دیا کہ جہاں شدت پسندوں کا غلبہ تھا... کتنے ہی لوگ ہوں گے جو ان کی فکر کے سبب شدت پسندی سے تائب ہوئے ہوں گے (انوار الحسن، پاکستان)

# ایک قاریٔ الرسالہ کی ڈائری

نذیر الاسلام پلوامہ کشمیر

## زندگی ایک نازک امتحان

انسان اپنی اعلی صلاحیتوں اور بھاری ذمہ داریوں کے اعتبار سے خدا کی شاہ کار مخلوق ہے۔ انسان نے عظیم صنعتی انقلاب برپا کرکے دنیا کو جنت کا نمونہ بنایا مگر یہی انسان کا مقصد تخلیق نہیں ہے۔ انسان کو خدا نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور اس دنیا کو اس کے لیے امتحان گاہ بنایا ہے۔ عبادت اپنے حقیقی معنوں میں اپنا سب کچھ خدا کے حوالے کرکے خدا کو اپنا سب کچھ بنانا ہے۔ مگر خدا نے انسان کو عمل کی آزادی دے رکھی ہے۔ انسان کے لیے اپنی آزادی کو غیب میں چھپے ہوئے خدا کے حوالے کرنا ہمیشہ انتہائی مشکل کام رہا ہے۔ اس میں جانتے بوجھتے اپنے آپ کو ذبح کرنا، ہلاک کرنا، کچلنا اور روندنا پڑتا ہے۔ تاکہ آخرت میں خدا کے انعام کے طور پر اس کو جنت کی ابدی زندگی حاصل ہو۔ مگر تمام انسان سوا ان لوگوں کے جو سچے مومن ہوں، اس عظیم قربانی کا ثبوت دینے میں ناکام رہ جاتے ہیں اور بالآخر جہنم کی ہولناک آگ اور دردناک عذاب سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ دور حاضر میں فتنوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں کیسے جہنم سے بچ کر جنت کا باسی بنا جائے۔ مولانا وحید الدین خان نے زندگی بھر یہی منزل دکھانے کا کام کیا ہے۔ مگر قرآن کے الفاظ میں، وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (41:35)۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیب والا ہے۔

## مولانا وحید الدین خان اپنی تحریر کے آئینے میں

’’دو احساسات ہر وقت غم کا پہاڑ بن کر میرے اوپر چھائے رہتے ہیں۔ ایک دعوت دین اور اصلاح امت کی ذمہ داری، دوسرے آخرت کی جواب دہی کا مسئلہ۔‘‘

’’ان دو غموں کے نیچے میری شخصیت گویا کچل کر رہ گئی ہے۔ کتنا جینے کی ضرورت ہے اور حال یہ ہے کہ ایک لمحہ بھی جینے کی طاقت نہیں۔ اسی طرح آخرت کی دنیا میں لازمی طور پر داخل ہونا ہے اور

آخرت کی دنیا میں داخل ہونے کی ذرا بھی ہمت نہیں۔''

''ایک صاحب نے مولانا وحید الدین خان سے کہا کہ میں آپ کی تحریریں برابر پڑھتا رہا ہوں اوران کو پسند کرتا ہوں، مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد کون؟ مولانا نے جواب میں کہا کہ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ میری موجودگی میں کون؟ میری دعوتی جدوجہد تقریباً 50 سال کی مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔اس راہ میں، میں نے اپنا خون خشک کیا، میری شخصیت ویران ہوگئی، میرے دن اور رات کا سکون چھن گیا، مگر اب بھی ہر طرف وہی حال نظر آتا ہے جس کی مثال انجیل میں ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ ہم نے بانسری بجائی مگر تم نے رقص نہیں کیا، ہم نے ماتم کیا مگر تم نہیں روئے''۔

## خدا کی دریافت

1۔زندہ اور طاقتور خدا پر یقین کرنا اتنا عجیب ہے کہ ماننے والے بھی اس کو نہیں مانتے اور جاننے والے بھی اس کو نہیں جانتے۔خدا مکمل طور پر ظاہر ہونے کے باوجود مکمل طور پر چھپا ہوا ہے۔وہ اپنی تخلیق میں مکمل طور پر ظاہر ہے مگر اپنی ذات میں وہ مکمل طور پر پوشیدہ ہے۔براہ راست طور پر اس کا مشاہدہ موجودہ دنیا میں آخری حد تک ناممکن ہے مگر بالواسطہ طور پر اس کا مشاہدہ آخری حد تک ممکن ہے۔

2۔انسان کی پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ حقیقی خدا کو دریافت کرے اور پھر یہ معلوم کرے کہ اس خدا سے رابطہ قائم کرنے کا کیا ذریعہ ہے۔اس دریافت کے بغیر انسان کی زندگی نہ صرف نامکمل ہے بلکہ وہ یقینی طور پر تباہی کے انجام سے دوچار ہونے والی ہے۔یہی کسی انسان کی زندگی کا سب سے بڑا نشانہ ہے۔جس انسان کی زندگی اس دریافت سے خالی ہو وہ بلاشبہ سب سے بڑا مفلس ہے۔خواہ بظاہر اس نے ساری دولت کے ڈھیر کو اپنے گرد اکٹھا کرلیا ہو۔

3۔اس دنیا میں سب سے بڑا پانا یہ ہے کہ آدمی نے خدا کو پالیا ہے اور سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ آدمی خدا کو پانے سے محروم رہا۔خدا کو پانے کے بعد کوئی اور چیز پانے کے لیے باقی نہیں رہتی اور جو لوگ خدا کو پانے سے محروم ہوں وہ گویا محرومی کی آخری حالت پر پہنچ گئے ہیں جہاں محرومی ہی محرومی ہے اول بھی اور آخر بھی۔

خدا کے ساتھ تعلق قائم کرنے اور اس کے لیے آنسو بہانے کی کیفیت پیدا کرنے کے زیادہ موثر ذرائع ہیں جو آدمی کے اپنے پاس موجود ہیں اور ہر وقت حاصل ہو سکتے ہیں۔وہ موثر ذرائع یہ ہیں:

۱۔قرآن میں تدبر کرنا۔

۲۔کائنات میں غوروفکر کرنا۔

۳۔ہر آن اپنے رب کو یاد کرنا۔

۴۔نماز میں ہمہ تن مشغول ہونا۔

۵۔دعاواستغفار میں اپنے آپ کو لگائے رہنا۔

۶۔خدا کی یاد میں کھو جانا۔

۷۔صبروشکراور قناعت کی زندگی اختیار کرنا۔

۸۔آخرت کی طلب میں اپنے ذوق، اپنی عادتوں اور اپنے عیش وآرام کو ترک کرنا۔

۹۔تنگی کے باوجود خدا کی خوشنودی میں خرچ کرنا۔

۱۰۔دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس کے خدائی مشن کو اپنا مقصد بنانا۔

اس قسم کے بے شمار مواقع ہیں جو ہر وقت اور ہر جگہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ان میں سے ہر ایک آپ کو تڑپا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔یہ وہ مقامات ہیں جہاں خدا کے فرشتے ترقی ایمان کی بے حساب غذائیں تقسیم کر رہے ہیں۔

خدا کی معرفت اول دن سے میری تلاش کا مرکز رہا ہے۔میرا دن اور میری راتیں اسی تلاش میں گزری ہیں۔یہاں تک کہ شاید میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے خدا کو پالیا ہے۔یہ موضوع بلاشبہ میرا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع ہے۔زمین وآسمان گواہ ہیں کہ میں سب سے زیادہ توحید کے موضوع پر سوچتا ہوں، میں سب سے زیادہ آخرت اور جنت کی باتوں میں گم رہتا ہوں۔

آدمی کو زندہ خدا کا اتنا زیادہ یقین ہونا چاہیے کہ اس کو بالفرض اپنے آپ پر شک ہو تو ہو لیکن اللہ ربّ العالمین کے وجود پر ادنیٰ درجہ میں بھی اس کے اندر کوئی شک پایا نہ جائے۔اس کو اس بات کا زندہ یقین ہو کہ وہ ہر لمحہ اللہ کی پکڑ میں ہے۔یہ یقین وایمان کسی کو ذکر وفکر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ یقین کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

جہاں تک انسان کے وجدان (intuition) کا تعلق ہے اس کی سطح پر خدا کا وجود اتنا ہی یقینی ہے جتنا انسان کا وجود۔

اس دنیا میں کامیاب انسان وہ ہے جو حقیقی یقین پر کھڑا ہو سکے مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں چند خوش نصیب روحوں کے سوا کسی کو بھی حقیقی یقین کا سرمایہ حاصل نہیں۔

انسان دل کی راہ سے خدا کو پاتا ہے اور یقین کی آنکھ سے اس کو دیکھتا ہے۔

سب سے بڑی حقیقت اللہ رب العالمین ہے۔ اس ذات کو پالینا ہی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی جہاں اپنے رب کو پاتا ہے وہ سجدہ ہے۔ مگر سجدہ حقیقی معنوں میں سجدہ اس وقت بنتا ہے جب کہ سجدہ سے باہر کی دنیا میں آدمی تواضع اور جھکاؤ کی زندگی اختیار کر چکا ہو۔ ایسا شخص اپنی نفسی حالت کے اعتبار سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا آخذ (recipient) بن سکے۔ اس کے لیے سجدہ حقیقی معنوں میں رب العالمین سے ملاقات کا مقام بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس، جو شخص سجدہ سے باہر کی زندگی میں خود پسند اور متکبر بنا رہے، اس کی روح کے اندر شیطان اپنے گھونسلے بنا لیتا ہے۔ اس کا سجدہ غفلت اور بے کیفی کا سجدہ ہوتا ہے۔ اس کا سجدہ اس کو خدا سے نہیں ملاتا۔ اس کا سجدہ اس کو خدا سے قریب نہیں کرتا۔

اصل یہ ہے کہ انسان لامحدود اطمینان چاہتا ہے۔ مگر دنیا کی چیزیں اس کو محدود اطمینان دیتی ہیں۔ اس لیے وہ اس کی تسکین نہیں بنتیں۔ یہ صرف اللہ کی یاد ہے جو نفسیاتی سطح پر انسان کی فطری طلب کا حقیقی جواب ہے۔ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28)۔ یعنی، سن لو بہ تاکید جان لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اللہ کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ اس لازوال ہستی میں اپنا دل لگایا جائے جو حقیقی اور ابدی ہے۔ اپنی امیدوں اور تمناؤں کو اس عالم کے ساتھ وابستہ کیا جائے جو ان تمام کمیوں اور محدودیتوں سے پاک ہوگی جن کی وجہ سے موجودہ دنیا ہمارے خوابوں اور تمناؤں کی تعبیر بننے نہیں پاتی۔

جو اللہ کو پالیتا ہے وہ گویا اپنا سب کچھ پالیتا ہے۔ دنیا میں اگر اس کو تکلیف پہنچے تب بھی وہ مطمئن رہتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ بالآخر اس کو منزل پر پہنچانے والا ہے۔

آدمی کی امیدیں اور احساسات جہاں اٹکے ہوئے ہوں وہیں وہ جی رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو ہر آدمی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو کہیں نہ کہیں جی رہا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے گھر بار اور بال بچوں میں جیتا

ہے، کوئی اپنی معاش اور کاروبار میں جیتا ہے، کوئی اپنی سیاسی اور قیادتی سرگرمیوں میں جیتا ہے اور کوئی اپنی عزت اور اقتدار کے خوابوں میں جی رہا ہے، مگر یہ تمام جینا جہالت کا جینا ہے۔ یہ اپنا آشیانہ ایسی شاخوں پر بنانا ہے جن کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ حقیقی جینا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب میں جینے لگے، وہ اس سہارے کو پکڑے جس کے سوا اس کائنات میں کسی کے لیے کوئی سہارا نہیں۔ وہ اللہ کی یاد کو لے کر سوئے اور اللہ کی یاد کے ساتھ صبح کرے۔ وہ اسی کے بھروسہ پر چلے اور اسی کے بھروسہ پر رکے۔ وہ اسی کے لیے بولے اور اسی کے لیے خاموشی اختیار کرے۔

## خدا کو پانے کی قیمت

خدا کو پانے کی قیمت طالب خدا کی خود اپنی ذات ہے۔ اس سے کمتر کوئی چیز خدا کو پانے کی قیمت نہیں بن سکتی۔ اپنی نفی نہیں تو خدا کی یافت بھی نہیں۔ خدا کو پانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ آدمی خدا کو اپنا واحد کنسرن نہ بنا سکے۔ خدا کو پانے کے لیے بلاشبہ یہی سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ علم کے بارے میں کسی بزرگ کا قول ہے: ''علم تم کو اپنا جز صرف اس وقت دیتا ہے جب کہ تم اس کو اپنا کل دے دو''۔ یہی بات خدا کو پانے کے لیے بھی درست ہے۔ خدا کو پانے کی قیمت یہ ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ خدا کو دے دے، وہ خدا کو اپنا واحد کنسرن بنائے۔ وہ خدا کی سوچ کو لے کر شام کو سوئے اور خدا کی سوچ کے ساتھ صبح کو جاگے۔ وہ اپنے آپ کو خدا میں اتنا زیادہ غرق کرے کہ وہ اس کا خواب دیکھنے لگے۔ خدا کو پانے کی قیمت کامل حوالگی ہے، جو شخص اپنے آپ کو خدا کے حوالے نہ کرے، خدا کی یافت کے دروازے بھی اس کے لیے نہیں کھلتے۔

اگر آدمی چاہتا ہے کہ اس کو دنیا میں حیات طیبہ حاصل ہو، آخرت میں وہ جہنم کے دردناک عذاب سے بچے اور اس کو جنت نعیم کی فراخی نصیب ہو تو اس کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی دین توحید کو اختیار کرے۔ دینِ توحید یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس طرح خدا میں شامل کرے کہ صرف ایک اللہ اس کے یقین اور خوف ومحبت کے جذبات کا مرکز بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود، اس کا دل و دماغ، اس کے جذبات و کیفیات خدا کی امانت ہیں۔ انسان کی زندگی کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا ایک مرکز ہو اور وہ ایک خدا ہو۔ اس کے جذبات، اس کی سوچ، اس کی سرگرمیاں اور اس کا سب کچھ پروانہ وار خدا کے گرد گھومنے لگیں۔

## عظمت خداوندی کا اعتراف

تاریخ اسلام میں سامانی سلطنت کا ایک حاکم نصر بن احمد بن سامان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے نیشاپور کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو وہاں اس نے ایک جشن منعقد کیا۔ جب وہ اپنے شاہی تخت پر بیٹھا تو اس کی فرمائش کے مطابق، تخت نشینی کی افتتاحی رسم قرآن کی تلاوت سے شروع ہوئی۔ مجلس میں ایک عالم موجود تھے۔ انھوں نے قرآن کی تلاوت کی۔ انھوں نے سورہ المؤمن کا ایک حصہ پڑھا، جس میں یہ آیت بھی تھی: یَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ لَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (40:16)۔ یعنی جس دن کہ وہ ظاہر ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی نہ ہوگی۔ آج بادشاہی کس کے لیے ہے، اللہ واحد وقہار کے لیے۔ مذکورہ عالم تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو سلطان نصر بن احمد پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ ہیبت زدہ ہو کر تخت سے اتر پڑا۔ تاج کو اپنے سر سے اُتارا اور سجدے میں گر گیا، اس نے کہا اے میرے رب، بلاشبہ بادشاہی تیری ہے، نہ کہ میری۔

## پیغمبر اسلام نئے انداز میں

مولانا وحید الدین خان صاحب نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر کئی اعلی پائے کی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں مولانا نے تاریخ میں پہلی بار پیغمبر اسلام کو بطور انسانی ماڈل پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ پیغمبر اسلام کو ایک فوق الفطری اور پر اسرار شخصیت کے طور پر پیش کرتے آئے ہیں۔ حیات طیبہ کی اس قسم کی توجیہ اور تشریح جدید ذہن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے اور ان کی انسانی عظمت کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ مولانا نے پیغمبر اسلام کو فوق البشر کے بجائے اسوۃ البشر (انسان کے لیے نمونہ) کے طور پر پیش کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے دور جدید میں ان سنتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق اعلی انسانی اقدار سے ہے۔ ان میں دو سنتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک سنت کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم سے ہے اور دوسری سنت کا تعلق دعوت کے درد سے۔ خلق عظیم کا مطلب ہے مکمل طور پر یک طرفہ حسن سلوک، جو مدعو کے دل کو جیتنے کے لیے شرط اول ہے۔ جہاں تک دعوت کے درد کا تعلق ہے سورہ الکہف آیت 6، سورہ الشعراء آیت 3 اور سورہ فاطر آیت 8 کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خدا کا مومن بنانے کے لیے اتنا زیادہ بے قرار رہتے تھے گویا کہ آپ اس غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ اس سلسلے میں سورہ

الشعراء میں یہ الفاظ آئے ہیں: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (26:3)۔ یعنی، شاید تم اپنے کو ہلاک کر ڈالو گے اس بات پر کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

## تجدیدی کام

تجدید کا مطلب کیا ہے۔ اس کو مولانا نے خود اپنی کتاب میں واضح کیا ہے: تجدید کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین میں کوئی نئی چیز نکالی جائے... حدیث میں جس تجدیدی عمل کا ذکر ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ دین کی تعلیمات کو ازسرنو اس کی اصل صورت میں واضح کرنا۔ دین کو انسانی ملاوٹوں سے پاک کر کے اس کو اس کی ابتدائی صورت میں سامنے لے آنا جیسا کہ پیغمبر نے اس کو اپنے زمانہ میں پیش کیا تھا (تجدیدِ دین)۔

اس اعتبار سے مولانا وحید الدین خان اس دور کے عظیم مجدد ہیں۔ اُن کے تجدیدی کارناموں میں سے چند یہ ہیں:

1۔ انسان ایک عاجز مخلوق واقع ہُوا ہے۔ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی تلافی کے لیے ایک برتر ہستی کی تلاش میں ہوتا ہے، اسی طرح انسان اپنی اُمیدوں اور تمناؤں کی تکمیل کے لیے ایک لامحدود دنیا چاہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان جس خارجی سہارے کی تلاش میں ہے وہ اس کا خدا ہے جو انسان کی فطرت میں گہرائی کے ساتھ پیوست ہے اور انسان جس کامل دنیا کو پانا چاہتا ہے وہ جنت ہے جو انسانوں کو موت کے بعد خدا پرستانہ زندگی گزارنے کے نتیجے میں آخرت میں حاصل ہوگی۔ الرسالہ فکر ان دونوں تقاضوں کا مفصل اور مدلل جواب فراہم کرتا ہے۔ وہ تمام ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جو اس خدائی سچائی کو پانے میں ناکام رہتے ہیں وہ یا تو مایوسی، ناکامی اور عدم تحفظ کی زندگی گزار کر طبعی موت مرتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے الرسالہ فکر آخری پناہ گاہ ہے۔ الرسالہ فِکر انسان کے تمام سوالوں کا اطمینان بخش جواب دیتا ہے۔ وہ آدمی کے ذہن سے تمام مصنوعی پردوں کو ہٹا دیتا ہے یہاں تک کہ انسان اعلیٰ حقیقتوں کا ادراک کرنے لگتا ہے۔

2۔ الرسالہ فِکر پیغمبرانہ مشن کی صحیح ترین تعبیر اور تشریح ہے جو عقل و فطرت کے ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد پر مشتمل ہے۔

3۔ الرسالہ فکر کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں: سچائی کی تلاش، بے آمیز حق کی دریافت، معرفتِ

خداوندی، انسانی عجز کی حقیقت، تزکیۂ نفس اور دعوت الی اللہ۔

4۔ الرسالہ مشن اسلام کے بنیادی موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تخلیقِ آدم کی حقیقت اور اُس کے تقاضے، توحید، آخرت، رسالت، شہادتِ حق، امن اور اسلام کو درپیش جدید چیلنجوں کا تجزیہ اور اُن کا رد شامل ہیں۔ قومی، سیاسی اور عسکری اسلام کی آئیڈیالوجی کے مقابلے میں مولانا نے امن، انسانیت اور روحانیت کی آئیڈیالوجی دی ہے۔

5۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تھے۔ اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ اب کارِ نبوت کا کام آپ کے اُمتیوں کو انجام دینا ہے۔ اس لیے قرآن میں اُمتِ محمدی کو ''اُمتِ وسط'' بتایا گیا اور کارِ نبوت کو اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود بتایا گیا۔ مولانا نے دعوت الی اللہ اور شہادتِ حق کے اُس قرآنی تصور کو زندہ کیا جو دورِ رسالت میں موجود تھا اور جو صدیوں سے اسلامی لڑیچر میں اپنی مربوط، مدلل اور مکمل صورت میں غائب ہو چکا تھا۔

6۔ الرسالہ مشن خالص اساسیاتِ دین پر مرکوز مشن ہے۔ یہ مشن اُن تمام فروعی اور ضمنی حد بندیوں سے اُوپر ہے جن کی وجہ سے نئی نئی جماعتیں اور فرقے وجود میں آتے ہیں۔

7۔ صاحب الرسالہ نے ایمان، عبادت، ذکر، تزکیہ، معرفت، خشوع اور ربانیت جیسی قرآنی اصطلاحات کی معنوی اہمیت کو نئے انداز میں پیش کیا۔

8۔ احادیثِ رسول میں اخوانِ رسول کا خصوصی تذکرہ آیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دورِ آخر میں دینِ حق کے اعلان واظہار کے مشن کو پورا کریں گے۔ اِن لوگوں کو خدا کے فضل سے مثلِ صحابہ ایمان عطا ہوگا۔ مولانا نے اخوانِ رسول کے رول کو نمایاں کیا اور مسلمانوں کو اخوانِ رسول کی اہمیت کا احساس دلایا تاکہ وہ اس گروہ میں شامل ہو کر سعادتِ اخروی کے اُمیدوار بنیں۔

9۔ صاحب الرسالہ کا اسلوب بیان تجزیاتی ہے۔ اس اسلوبِ بیان کے خاص اجزا یہ ہیں سائنسی طرز استدلال، لفاظی سے دوری، واقعیت اور موثر انداز میں حقائق وافکار کو ترتیب وار پیش کرنا۔

تجدید واحیائے دین کے سلسلے میں مولانا کے ذریعے زمانے کے معیار کے مطابق انتہائی طاقتور لڑیچر وجود میں آچکا ہے جو دنیا کے تمام اعلیٰ درجہ کے لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔ داعیانِ حق کی جماعت میں شامل ہونے کے لیے ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہم اس لڑیچر کو حق سے

غافل یا حق سے بے خبر بندگانِ خدا تک پہنچا دیں تا کہ ہم خدا کی بارگاہ میں بری الذّمہ ہوں اور لوگوں کے لیے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس خدائی کام کو اپنا ذاتی مسئلہ بنائیں اور ہم اپنی تمام صلاحیتوں اور وسائل کو اس مشن میں لگا دیں تا کہ ہم اُن سعادتوں کے اُمیدوار بنیں جو ایسے لوگوں کے لیے خدا کے یہاں مقدر ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ آج تک ہم اس دعوتی مہم میں اپنے آپ کو یا اپنے مال کو کتنا خرچ کر چکے ہیں اور آئندہ کے لیے ہمیں شعوری طور پر یہ طے کرنا چاہیے کہ ہم اپنے وسائل کا کتنا حصہ اس کام کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں 'کرنے' کی قیمت ہے، نہ کہ صرف 'کہنے' کی۔

---

مولانا وحید الدین خان کے انتقال پر نبیل احمد رشیدی کا اظہار تعزیت: بجنور (اسٹاف رپورٹر) نبیل احمد رشیدی ممبر جمعیۃ علماء ضلع بجنور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عظیم مفکر، مدبر، دانشور، سینکڑوں کتابوں کے مصنف، الرسالہ کے مدیر بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم دین، مذہبی اسکالر مولانا وحید الدین خان اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مولانا وحید الدین خاں ایک بہت ہی متحرک انسان تھے اللہ نے ان کو مستقبل کو دیکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی، جو بہت ہی کم لوگوں کو خدا عطا کرتا ہے۔ مرحوم کی میں نے کافی کتابوں کو پڑھا، تو ان کی کتاب میں ایک الگ ہی شاندار، مثبت مستقبل کو دیکھنے کی صلاحیت اور تخلیقی ذہن سازی ہوتی تھی۔ میں مرحوم کو بہت ہی ادب کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کی مغفرت فرمائے (روزنامہ انقلاب، ممبئی، 23 اپریل 2021)۔

# مولانا میری نظر میں

مولانا عبداللہ چترویدی، لکھنؤ

مولانا وحید الدین خاں صاحب ایک عظیم شخصیت تھے۔ میں نے مولانا سے زندگی میں صرف ایک مرتبہ ملاقات کی ہے اوران کی تقریباً ڈھائی سو سے زیادہ کتابیں ہیں۔ جن میں، سے دوسو کے آس پاس میں نے پڑھی ہیں۔

مولانا پر جو بہت سارے الزامات ہیں کہ انھوں نے یہ لکھا ہے یا فلاں بات لکھی ہے۔ لیکن جب میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ مولانا نے لکھا کچھ اور ہے اور الزامات بے بنیاد لگائے جارہے ہیں۔ ایک جگہ مولانا نے لکھا ہے کہ آج تک جتنے لوگوں نے میرے اوپر اعتراض کیا ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے جو یہ بتا سکا ہو کہ آپ کی یہ بات قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔ یہ سب بے بنیاد اور جھوٹی چیزیں پھیلائی جارہی ہیں۔

اس سے اندازہ ہوا کہ آدمی جب کسی کی مخالفت پر آتا ہے تو وہ یہ بھی نہیں ڈرتا کہ میں اللہ کے غضب کا مستحق ہورہا ہوں۔ اس کے لیے وہ جھوٹ بھی بولتا ہے، اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے بھی لوگ اس طرح کے ہوئے ،یعنی خود ساختہ دین کے خلاف بے آمیز دین پیش کیا ان سب کے ساتھ یہی ہوا۔ قرآن اس کی گواہی دے رہا ہے اور بڑی عجیب وحیرت انگیز بات ہے کہ اس زمین پر سب سے پہلا فتوی کفر کا دیا گیا، وہ ایک رسول کو دیا گیا۔ وہ ہیں سیدنا عیسی علیہ السلام۔ اس وقت کے تمام اہل علم نے جو یہودی تھے ان سب نے عیسی علیہ السلام کو کافر قرار دیا۔ وجہ کیا ہے۔ عیسی علیہ السلام ان کے خود ساختہ دین کی تردید کررہے تھے تو انھوں نے ان کو کافر قرار دے دیا۔

صحابہ کرام نے اس سے مکمل طور پر پرہیز کیا۔ کسی صحابی نے کسی کو کافر نہیں کہا۔ حد یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو قرآن کا حصہ نہیں مانتے تھے، اِس کے باوجود صحابہ ان کا احترام کرتے تھے، ان سے محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن سیکھیں گے تو عبد اللہ ابن مسعود سے۔ اختلاف کی وجہ سے کسی پر جھوٹی باتیں گڑھنا اور اس پر بہتان لگانا، بے بنیاد

باتیں کرنا یہ کم ازکم اہل ایمان کی شان تونہیں ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں جتنے بھی لوگوں نے خودساختہ دین کے خلاف بے آمیز اور حقیقی دین پیش کیا ان سب کے ساتھ یہی ہوا۔مثلاً حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر مولانا علی میاں ندوی نے تاریخ دعوت وعزیمت میں ایک جلد پوری لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ حافظ ابن تیمیہ کو اس وقت کے اہلِ علم نے کافر قرار دیا۔لیکن علی میاں نے لکھا کہ کافر کا فتویٰ دینے والوں کو دنیا نہیں جانتی لیکن ابن تیمیہ کو دنیا رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ یہ نئی چیز نہیں ہے جتنے بھی لوگوں نے خودساختہ دین کے خلاف بے آمیز اور سچا دین پیش کیا ان سب کے ساتھ یہی ہوا۔خود مولانا وحیدالدین صاحب سے کسی نے بات کی تو مولانا نے جواب دیا جو بعینہ درج کررہا ہوں۔مولانا نے لکھا ہے:

”ایک صاحب نے کہا کہ لوگ آپ کو ایسا اور ایسا کہتے ہیں تو میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ ہماری قوم میں کون وہ شخص ہے جس کو ایسا اور ایسا نہیں کہا گیا۔اس قوم نے شاہ ولی اللہ کو زندیق کہا اور آج انھیں کو سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا ہے۔اس قوم نے سرسید احمد کو انگریز کا ایجنٹ کہا اور آج انھیں کو قوم کا سب سے بڑا محسن بتایا جاتا ہے۔اس قوم نے اقبال کو انگریز کا نمک خوار کہا اور آج وہ مفکر اسلام کی فہرست میں نمبر ایک پر لکھے جاتے ہیں۔اس قوم نے مولانا حسین احمد مدنی کو کانگریس کا پٹھو کہا اور آج وہ شیخ الاسلام قرار دیے جاتے ہیں۔اس قوم نے مولانا ابوالکلام آزاد کو show boy کہا اور آج وہ دورجدید کی سب سے بڑی اسلامی شخصیت شمار کیے جاتے ہیں۔مسٹر محمد علی جناح کا انتقال ہوا تو بعض لوگوں نے کہا کہ مرگیا مردود نہ فاتحہ نہ درود۔اور آج وہ قائداعظم کا مقام حاصل کئے ہوئے ہیں،وغیرہ“۔

مولانا نے کہا کہ یہ قوم زندہ کی بے قدری کرتی ہے اور مردے کو پوجتی ہے۔یہی سیکڑوں سال سے ہورہا ہے تو میرے معاملہ میں استثنا کیوں کر ہوسکتا ہے۔اسی طرح سے مولانا کے بارے میں الزام ہے کہ مولانا نے لیبیا کے کرنل قذافی کی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔مولانا نے لکھا ہے کہ میرے بارے میں یہ مشہور کیا جارہا ہے کہ میں نے لیبیا کے صدر کرنل قذافی کی کتاب الاخضر کا اردو ترجمہ کیا ہے۔اس سلسلہ میں ایک صاحب سے گفتگو ہوئی میں نے کہا یہ بالکل جھوٹی بات ہے۔

اس کے بعد میں نے انھیں ایک واقعہ سنایا۔مولانا نے لکھا ہے کہ برطانوی حکومت کے دور

میں وائسرائے کے سامنے ایک خط پیش کیا گیا جس پر محمد علی کا دستخط تھا۔ یہ خط امیر کابل کے نام تھا۔ اس خط میں کہا گیا تھا کہ آپ اپنی فوج لے کر ہندوستان پر حملہ کردیجیے، ہم اندر سے بغاوت کردیں گے۔ اس کے بعد انگریزوں کو بھاگنا پڑے گا۔ اور ملک آزاد ہوجائے گا۔ اس خط کے مضمون سے مولانا محمد علی جوہر کی بغاوت ثابت ہوتی تھی۔ اس کو وائسرائے کونسل میں غور کرنے کے لیے پیش کیا گیا۔ کونسل کی اس میٹنگ میں جنرل ڈائر بھی تھا، جو اپنی سفاکی کے لیے مشہور تھا۔ جنرل ڈائر نے اس خط کو پڑھا پھر اس کو پھینک دیا۔ اس نے کہا کہ اس خط کی زبان محمد علی کی زبان نہیں ہوسکتی۔ یہ تو ہمارے کسی جونیر آفیسر کا لکھا ہوا خط ہے۔ جنرل ڈائر کی اس بات پر وہ خط رد کردیا گیا۔ مولانا نے کہا کہ ہمارے مخالفین کے اندر جنرل ڈائر کے بقدر کردار بھی نہیں، ورنہ وہ قذافی کی کتاب کا ترجمہ دیکھ کر اس کو رد کردیتے اور کہتے کہ یہ تو وحید الدین خاں کی زبان ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ واقعہ ہے کہ اس کتاب کی زبان میں اور میری زبان میں بہت فرق ہے۔

کرنل قذافی کی کتاب کا ترجمہ تو بہت دور کی بات ہے مولانا کی کرنل قذافی نے ایک دعوت کی تھی جس میں وہ نہیں گئے تھے وہ بھی مولانا نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔"ڈاکٹر شمس الآفاق منسٹری آف ہیلتھ نئی دہلی ملاقات کے لیے آئے۔ وہ الرسالہ سے پوری طرف متفق ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کا فعل مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ خدانخواستہ ہندوؤں کا یا حکمرانوں کا ایجنٹ ہوں جو کچھ کہتا ہوں مفاد کے تحت کہتا ہوں۔ مولانا نے کہا کہ ستمبر 1989 کے آخری ہفتے میں لیبیا میں انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ مختلف ملکوں کے کئی سو آدمی وہاں آئے۔ میں بھی شریک ہوا اور اخبار نو کے ایڈیٹر م افضل صاحب بھی اس میں شریک تھے، ان سے آپ پوچھ لیجیے۔ ہم لوگ طرابلس کے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ اس کے بعد اسپیشل جہاز کے ذریعہ طرابلس سے بن غازی لے جائے گئے تاکہ وہاں کرنل قذافی سے ملاقات کرسکیں۔ تمام شرکاء خوشی خوشی وہاں گئے۔ میں اکیلا طرابلس کے ہوٹل میں ٹھہرا رہا۔ میں اکیلا قذافی سے ملنے نہیں گیا۔ اپنے اس استغنا کی وجہ سے 500 ڈالر کھودیے۔ یعنی جو لوگ کرنل قذافی سے ملنے کے لیے گئے ان کو 500 ڈالر انعام کے طور پر دیے گئے۔ یہ بات پہلے معلوم تھی لیکن مولانا ملاقات کے لیے نہیں گئے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے خلاف جھوٹی اور بے بنیاد باتیں پھیلائی گئیں۔ میں یہ بات

اور واضح کردوں کہ میں مولانا کی تنظیم سے جڑا ہوا نہیں ہوں۔ لیکن میرا ایک اصول ہے کہ اگر کسی کے اوپر جھوٹا الزام لگایا جارہا ہو اور مجھے اس کی حقیقت کے بارے میں معلوم ہے تو میں اس کی تردید کرتا ہوں اور اس کو اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مولانا وحید الدین صاحب تو سراپا دعوت تھے۔ انھوں نے قرآن وحدیث کو دعوت کے طریقہ سے پورا پیش کیا۔ انھوں نے بہت واضح طور پر بتایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی حامل کتاب قوم مغلوب وذلیل ہوتی ہے تو اس کا سبب صرف ایک ہوتا ہے کہ اس نے اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک پہونچانا چھوڑ دیا۔ چونکہ جو کام میں کرتا ہوں وہی کام مولانا مجھ سے اعلیٰ پیمانے پر کرتے رہے، منظم طریقہ سے کرتے رہے۔ پوری دنیا میں ان کی ٹیمیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوالٹی کے اعتبار سے جتنی بڑی تنظیم انھوں نے تیار کی وہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

بہت سارے لوگوں کے سوالات اور اشکالات آرہے تھے تو میں نے سوچا کہ میں ایک message لوگوں کو دے دوں۔ میں غیر جانبدار ہو کر یہ بتا رہا ہوں کہ مولانا کے اوپر یہ سب جھوٹے الزامات ہیں۔ مولانا دنیا کے ایک عظیم مفکر تھے اور ان کی سوچ آخرت رخی تھی جس کی جھلک ان کی ساری کتابوں سے ملتی ہے۔ جو ان کی کتابوں کو پڑھ لیتا ہے اس کی سوچ بھی آخرت رخی ہو جاتی ہے۔ میں ان کی تنظیم سے جڑے بہت سے لوگوں سے ملا ہوں، دیکھتا ہوں کہ ان کی سوچ بھی آخرت رخی ہے اور ان کے اندر بڑی سنجیدگی اور متانت میں نے پائی۔ ان کی تنظیم کے لوگوں سے مل کر میں بہت متاثر ہوا اور اس لیے میں نے سوچا کہ بے بنیاد اور جھوٹی باتیں جو لوگ پھیلاتے ہیں اس کے بارے میں کچھ عرض کردوں۔

حد یہ ہے کہ ہمارے لکھنؤ میں ہمارے جاننے والے ایک انجینئر صاحب رہتے ہیں۔ وہ مجھے ایک بار دو کتابیں دے گئے اور کہنے لگے کہ یہ علماء نے لکھی ہے۔ ایک کتاب کو تو دس بارہ عالم نے مل کر لکھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ الرسالہ چٹکلوں کا مجموعہ ہے تو میں نے ان سے فون کر کے کہا کہ یہ تو سب سے بڑا جھوٹ پہلی ہی لائن میں مل گیا۔ میں نے کہا کہ الرسالہ میں نے پڑھا ہے اور سیکڑوں الرسالہ میرے پاس ہیں ان میں کہیں پر چٹکلہ ہے ہی نہیں، اس میں قرآن وحدیث کی بات ہوتی ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ انھوں نے کتاب میں لکھ دیا۔ دوسری کتاب جو موٹی تھی وہ ایک ادارے کے بہت بڑے عالم کی لکھی ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے مخالفت میں ایک ایسی بات کہہ دی جس کی تو

میں توقع بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی عالم کیا عام مسلمان بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ انھوں نے کہا صلح حدیبیہ (سورۃ فتح) کوئی دائمی حکم نہیں تھا۔ میں نے ان کو فون کیا کہ کیا سورہ فتح کا حکم دائمی حکم نہیں ہے، قرآن کی ہر آیت تو قیامت تک کے لیے ہے۔ بہر حال وہ کوئی مثبت جواب نہ دے سکے۔ تو یہ حال ہے کہ لوگ مخالفت میں غیر حقیقی باتوں پر مشتمل کتابیں لکھتے ہیں اور لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ بغیر تحقیق مان لیتے ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ کوئی بات سنو تو پہلے اس کی تحقیق کرو (الحجرات، 49:6)۔ اس لیے صاحب معاملہ کو کوئی بات کہنے سے پہلے اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔

میں آخر میں ایک بات کہتا ہوں کہ مولانا نے سورہ صف کی آخری آیت کا ایک جگہ تذکرہ کیا ہے جس پر ایک صاحب الزام یہ لگاتے ہیں کہ مولانا وحید الدین خاں کہتے ہیں کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں چلے گا بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کا طریقہ چلے گا۔ اس کی تحقیق میں نے کی تو پتہ چلا کہ یہ تو بالکل بیہودہ بات ہے۔ یہاں پر تو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جس طرح سے عیسیٰ کے حواریوں نے ان کی مدد کی تھی اسی طرح تم لوگ مدد کرو۔

مختصراً، لوگ مخالفت میں اس قدر گر جاتے ہیں، اور اپنے آپ کو ایمان والا بھی کہتے ہیں، اور جھوٹے الزام بھی لگاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ ''لعنة الله على الكاذبين'' قرآن (3:61) نے کہا ہے، اور بخاری (حدیث نمبر 34) میں ایسے لوگوں کو منافق کہا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومن چوری کرسکتا ہے، مومن زنا کرسکتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5827)، مومن بخیل ہوسکتا ہے، مومن بزدل ہوسکتا ہے، لیکن مومن جھوٹ نہیں بول سکتا (موطا امام مالک، حدیث نمبر 2832)۔ بعض لوگ مخالفت میں اس حد تک گر گئے کہ اتنے جھوٹے الزامات لگا بیٹھے۔ ایسے لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ اللہ ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین
''وما علينا الا البلاغ''

---

مولانا وحید الدین خان کے انتقال سے عالم اسلام ایک عالی دماغ سے محروم ہو گیا۔ وہ ایک شخص نہیں ایک ادارہ تھے ایک مکتب فکر تھے۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا تھا اور کیا بھی گیا ہے، لیکن ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (ندیم اقبال، لاہور)

# الرسالہ مشن کی تحریروں کا تعارف

مولانا سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تمل ناڈو

مولانا وحید الدین خاں صاحب نے جس میدان کا انتخاب کیا تھا اسے ہم ''اسلام عصری اسلوب میں''،''عصرِ جدید میں اسلامی لٹریچر'' یا ''عصرِ حاضر میں اسلام کی تشریح وتوضیح'' کہہ سکتے ہیں۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں ''عصری اسلوب میں اسلام'' کا عنوان مولانا کا امتیازی موضوع ہے اور انھوں نے اس موضوع کی وضاحت میں اپنی ساری زندگی وقف کردی۔

عصری اسلوب میں لٹریچر

حقیقت یہ ہے کہ جب ماڈرن ایج (modren age) آیا تو مختلف علماء نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دورِ جدید کی نسبت سے اسلام کو کیسے قابلِ فہم بنایا جائے۔ چنانچہ دیوبند کے ایک بزرگ عالم (مولانا قاری محمد طیبؒ) اکثر کہا کرتے تھے کہ ''آج کی ضرورت جدید طرزِ استدلال ہے''۔ ان کے الفاظ میں ''مسائل قدیم ہوں، دلائل جدید ہوں''۔ (ڈائری 1984 ص 318)

اسی طرح اہل ندوہ کی ''الی الإسلام من جدید'' کی تحریک بھی اسی رائے کا اظہار تھی۔ اس سلسلے میں مولانا علی میاں کی ایک کتاب کا عنوان ہے ''ردة ولا ابابكر لها'' (صفحہ 171)۔ یعنی ارتداد جدید کے مقابلے کے لیے کوئی ابوبکر صدیق نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ میدانِ کار پوری طرح قربانی چاہتا تھا، ڈیڈیکیشن (dedication) چاہتا تھا، مکمل سنجیدگی اور فراغت چاہتا تھا۔ چنانچہ مولانا کے ذہن میں اللہ تعالی نے یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ اس کام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ لہٰذا انھوں نے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کو تیار کرنے میں اپنی ساری زندگی لگادی؛ دورِ جدید کو متعین کیا، اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا، دورِ جدید میں پائی جانے والی مثبت اقدار کی وضاحت کی، عصری اسلوب میں مذہبی اپروچ کیا ہونا چاہیے، اس کی وضاحت کی۔ الغرض اسلام کی از سرِ نو دریافت کی حد تک ایک علمی اور فکری لٹریچر تیار کر کے انسانیت کے سامنے پیش کردیا۔ یہ معاملہ تجدد پسندی کا نہیں تھا بلکہ تطبیقِ نو یا

انطباقِ نو (reapplication) کا تھا۔ یعنی قرآن وحدیث کی ابدی تعلیمات کو دورِ جدید کے اسلوب میں بیان کرنا اور عصرِ حاضر کی نسبت سے ان کا (relevance) ریلیونس ثابت کرنا۔ اس کو مذہبی اصطلاح میں ہم 'اجتہاد' کہہ سکتے ہیں۔ گویا مولانا نے دورجدید کی نسبت سے بھر پور اجتہاد کیا۔

اس علمی اور فکری عمل کو تین عناوین کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1۔ مبنی بر عقل روحانیت (mind-based spirituality)

1۔مبنی برعقل استدلال (reason-based argument)

1۔مبنی بر امن اقدام (peace-based activism)

مولانا کا مرکزی تصور (central idea) یہ تھا کہ دورِ جدید حقیقت میں دورِ اسلام ہے مگر اس دور کو ملحد فلسفیوں نے الحاد کے حق میں خوب استعمال کیا۔ امتِ مسلمہ کو چاہیے تھا کہ وہ اس دور کو مکمل طور پر توحید کے حق میں استعمال کرتے۔ مگر امت مسلمہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میری سب سے بڑی دریافت اللہ کی دریافت ہے۔ میں نے اس دور کے علمی الحاد کو مکمل طور پر پڑھا ہے اور ہر طریقے سے اس کے استدلالی بنیادوں کو اسلام کی دریافت نو میں (convert) کنورٹ کر دیا ہے۔ حقیقت میں سائنسی علم کو ملحدین نے ہائی جیک کرلیا تھا۔ میں نے اس علم کو توحید کے اثبات کے لیے ان سے آزاد کرالیا ہے۔

## اسلام ایک مشن

مولانا کی تعبیر کا ایک پہلو یہ ہے کہ مولانا قرآن وحدیث، تاریخ انبیا اور تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کو ایک خدائی مشن کے روپ میں دیکھتے ہیں اور اس کو خدا کے منصوبۂ تخلیق کے عنوان کے تحت واضح کرتے ہیں۔ یعنی تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ حضرت آدم سے لے کر قیامت تک کے تمام واقعات کو زمانی اعتبار سے وہ ایک قابلِ فہم منصوبہ بندی کے طور پر واضح فرماتے ہیں، اور قرآن وحدیث سے مشن کی ترقی اور تسلسل کے لیے رہنمائی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ گویا مولانا کے پاس اسلام ایک مشن ہے۔

## سائنسی اسلوب

مولانا کی تحریریں عصری اسلوب میں ہیں، یعنی سائنٹفک اسلوب میں۔ اس میں ڈیٹا کی بنیاد پر گفتگو ہوتی ہے، بیانیہ انداز نہیں ہوتا۔ اس میں تقدّساتی اسلوب یا تمثیلی اسلوب نہیں ہوتا بلکہ تجزیاتی

اور تحقیقی اسلوب ہوتا ہے؛ قدیم روایتی اسلوب میں نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ جدید ذہن کے لیے قابل فہم ہوتا ہے، مگر جن کا مطالعہ روایتی ہوتا ہے ان کی اپنی ذہنی کنڈیشنگ کی وجہ سے ابتداءً ان کے لیے ان باتوں کو قبول کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ ان کا معاملہ حالفنی الشباب خالفنی الشیوخ کا معاملہ بن جاتا ہے۔ یعنی جدید سوچ رکھنے والوں نے ساتھ دیا اور قدیم سوچ رکھنے والوں نے اختلاف کیا۔

مولانا اپنی غیر مطبوعہ ڈائری میں ایک جگہ لکھتے ہیں: میں نے علما پر جو تنقید کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علما نے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا ہے۔ میری تنقید صرف اس بات پر ہے کہ موجودہ زمانے کے علما دورِ جدید کی نسبت سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہ کر سکے۔ نہ ہی انھوں نے دورِ جدید کو سمجھا اور نہ ہی دور جدید کی نسبت سے امت کی رہنمائی کی (ڈائری 2011)۔ اس موضوع سے متعلق کتاب ''علما اور دور جدید'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔ مولانا کی تحریروں میں بار بار مختلف انداز سے جن باتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ہیں:

معرفتِ رب (Realization of God)

معرفتِ حیات (Realization of Life)

معرفتِ جنت (Realization of Paradise)

معرفتِ دعوت (Realization of Dawah Work)

تقریباً ساری تحریروں کا محور یہی موضوعات ہیں۔

## تحریر کے متعلق اصولی موقف

مولانا نے ہماری ایک تربیتی مجلس میں کہا تھا کہ میں نے سوچ سمجھ کر اپنی تحریروں کا ایک موقف اپنایا ہے۔ اسی پر میں بار بار لکھتا ہوں، یعنی معرفت اور دعوت کے موضوع پر اور شخصی مدح وقدح سے مکمل اجتناب کرتا ہوں اور بعض موضوعات پر ایک مرتبہ کچھ لکھتا ہوں تو اس کو پھر سے دہراتا نہیں ہوں۔ گویا وہ میری ایک علمی توجیہ یا میری علمی رائے کی حد تک ہوتا ہے۔

## مبنی بر دلیل لٹریچر

مولانا کی تحریروں میں قرآن وحدیث سے ماخوذ الفاظ کی جو تشریحات ہیں اگر ان کو مولانا کے علمی استدلال اور فکری نقطۂ نظر کے مطابق سمجھ لیا جائے تو الرسالہ مشن کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

مولانا نے دعوت ومعرفت کے موضوعات کو عصری اسلوب میں سمجھانے کے لیے صفحات کے صفحات لکھے ہیں۔ بظاہر کہیں کوئی بات قابلِ اعتراض لگ رہی ہو تو دوسرے مضامین میں یا دوسرے پیراگراف میں ہی اس کا جواب موجود ہوتا ہے۔ قاری اگر مولانا کی تحریروں سے وابستہ رہے تو باتوں کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتا ہے۔

مولانا کے خلاف لکھی گئی کتابوں سے الرسالہ مشن کی تحریروں کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ میری تحریر یا تقریر میں جس بات کی وضاحت ہوتی ہے میں اسی کا ذمہ دار ہوں۔ خدا کا فضل ہے کہ آج تک ہماری نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں مولانا کی تحریروں پر علمی رد کیا گیا ہو۔

## عقیدت مندانہ اسلوب نہیں، حقیقت پسندانہ اسلوب

مولانا نے اپنی تحریروں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو مخاطب کیا اور عقیدت مندی کے اسلوب کے بجائے حقیقت پسندی کا اسلوب اختیار کیا۔ قاری کو مولانا کی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت اس پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔

## عصر حاضر کے چیلنجز

توحید اور اس کے پیغام کی حفاظت کی ذمہ داری ہر زمانے میں مطلوب ہے اور اللہ تعالی ہر زمانے میں ایسے افراد کو اٹھائے گا جو وقت کے انحراف کا اور باطل افکار کا دلیل و برہان کی زبان میں مقابلہ کرتے رہیں گے۔ چاہے وہ اہلِ دین کا غلو ہو یا ملحدین کے مغالطے ہوں۔ ہر قسم کے فکری مسائل کو ایڈریس کرتے رہیں گے۔ جیسا کہ ایک حدیثِ رسول میں اس ذمہ داری کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آپ نے کہا: يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ، يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ، وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ (شرح مشکل الآثار، حدیث نمبر 3884)۔ یعنی، اس علم کو ہر دور کے قابل اعتماد لوگ آگے لے کر جائیں گے — یہ لوگ اس علم سے اہل غلو کی تحریفات کی نشاندہی کریں گے۔ وہ اہل باطل کے جھوٹ اور جاہل لوگوں کی غلط تشریحات کی نفی کریں گے۔

موجودہ دور بہت سے نئے نئے فکری مغالطوں کا دور ہے۔ اس دور میں مختلف نظریات اور ازم پیدا

ہوئے۔ جہاں اہل دین کا انحراف ہے وہیں غیر اہل دین کا الحاد بھی اپنے پاس مستقل ایک لٹریچر رکھتا ہے گویا ہر ایک نے مبنی بر نظام تشریح کرنے کی کوشش کی — معاشی نظام، سیاسی نظام، اخلاقی نظام وغیرہ۔ ہر فکر کے مستقل رہنما شخصیات ہیں۔ اس طرح ہر ایک کے پاس رہنمائی کرنے والا لٹریچر بھی موجود ہے۔ بنیادی طور پر بڑی تقسیم کے اعتبار سے چار ازم وجود میں آئے ہیں:

مارکس ازم، ڈارونزم، فرائڈ ازم اور اسلام کی سیاسی تعبیر

چند مسلم شخصیات نے حالات سے متاثر ہو کر اسلام کو بھی نظامی یا سیاسی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کی، جس کو دین کی نظامی تشریح یا سیاسی تشریح کہہ سکتے ہیں۔

الغرض ان تمام باطل افکار کا مقابلہ کرنا وقت کی اہم ضرورت تھی۔ مولانا نے الرسالہ اور تذکیر القرآن کے ذریعے ان تمام غلط افکار کا جواب دیا۔ اور ان پر علمی حجت قائم کی۔ مولانا نے دور جدید کے ان فکری چیلنجز کو پہچان کر اسلام کو از سر نو دلیل و برہان کے اعلی مقام پر پہنچانے کا فریضہ ادا کیا۔ شاید ہی کسی شخص نے یہ حق ادا کیا ہو۔ مستقل کتابیں اور مقالات تیار کیے، اور مختلف اسفار کر کے ملاِ قوم تک سچائی کا پیغام پہنچایا۔ مذہب اور جدید چیلنج، کتاب معرفت، اظہار دین، خدا کی دریافت، دور دعوت وغیرہ جیسی کتابیں شائع کیں۔

اہل مشن خدا کو اپنا بہتر دیں

مولانا نے اپنی ساری بہترین صلاحیتیں خدا کے لیے دی ہیں۔ آج ہم اپنی صلاحیتوں کو کیش (cash) کرنا تو جانتے ہیں، خدا کے لیے دینا نہیں جانتے۔ ہم کو اپنی زندگی کا احتساب کرنا ہے اور خدا کے لیے اپنا بیسٹ (best) دینے کی کوشش کرنا ہے۔

میں نے اور میرے علما ساتھیوں نے تقریباً دس سال کے عرصے میں بار بار مولانا کی تربیتی مجالس میں حاضری دی اور فون کے ذریعے مسلسل رابطے میں رہے۔ الحمدللہ 2011 سے 2021 تک کی صحبتوں سے مولانا کے مشن کو سمجھنا ہمارے لیے اور آسان ہو گیا ہے۔ اب بھی کتابوں اور youtube پر موجود ان کے خطابات کے ذریعے الرسالہ مشن کو سمجھا جا سکتا ہے۔

مولانا کی تحریروں میں مطالعۂ کتب کا نچوڑ ہے۔ مشاہدۂ کائنات کا سبق ہے اور انسانی ملاقاتوں سے حاصل شدہ عبرت و نصیحت کی روداد ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم مولانا کی ساری کتابوں کا

مطالعہ کریں اور ساتھ میں خدا کے اثبات اور کائنات کی ڈسکوری پر لکھی گئی تمام انگریزی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے رہیں۔

## تلخیص، نہ کہ تشریح

ایک طویل علمی صحبت کے نتیجے کی بنا پر میں نے اپنی فہم ودانش کے مطابق مولانا کی تحریروں میں جو اہم بنیادی موضوعات ہوسکتے ہیں ان کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی مزید وضاحت الرسالہ کے مضامین میں کوئی بھی قاری پاسکتا ہے۔میں نے صرف تقریبِ فہم کے لیے یہ کوشش کی ہے۔

میں نے ذیل میں 30اہم باتوں کا ذکر کیا ہے جو مولانا کی فکر کو سمجھنے میں معاون ہوسکتے ہیں۔ان میں شخصیات کا رول واضح کیا گیا ہے، دین کے تعلق سے پائے جانے والے تصورات کی تصحیح کی گئی ہے اور مستقبل کا روڈ میپ بتایا گیا ہے:

1۔ ابراہیم علیہ السلام کا رول: إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (3:33)۔یعنی، بیشک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور آل ابراہیم کو اور آل عمران کو سارے عالم کے اوپر منتخب کیا ہے۔قرآن کی اس آیت میں تاریخِ انبیا کا ذکر ہے اور ہر ایک پیغمبر کے رول کو دریافت کرنے کی طرف کا اشارہ کیا گیا ہے۔

بالخصوص خدا نے ابراہیم علیہ السلام کو بت پرستی کے ماحول سے نکال کر فطرت کے آزادانہ ماحول میں بسایا تاکہ ایک مضبوط گروہ تیار ہو جو عالمی مشن کے لائق ہوں۔واقعہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین دونوں اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں۔

قرآن میں ’’أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا‘‘(16:123) کا حکم دیا گیا ہے، یعنی ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو۔اس کو دریافت کر کے عمل کا صحیح نقشہ بنایا جائے تاکہ امامت عالم کا ابراہیمی منصوبہ واضح ہو، جس کا اعلان قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:’’إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا‘‘(2:124)۔یعنی میں تم کو سب لوگوں کا امام بناؤں گا۔ان مذکورہ آیات میں انبیاء کی تاریخ کا ذکر ہے، اور ملت ابراہیم کی اتباع اور حضرت ابراہیم کی امامت کا ذکر ہے، گویا یہ ایک خدائی منصوبے کا اعلان ہے۔

2۔ بنو اسماعیل کا رول: خدائی منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے عرب کے صحرا کے فطری ماحول میں ایک نسل کو اللہ تعالی نے پروان چڑھایا، اور انہیں ڈیزرٹ تھِرَپی کے ذریعے شجاعت،

صداقت اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل بنایا۔ اس نسل کو تاریخ میں بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اسی نسل میں رسول اور اصحاب رسول جیسے باعزم و باحوصلہ لوگ پیدا ہوئے۔ قرآن کی اس آیت میں اسی منصوبۂ تخلیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ (22:78)۔ یعنی اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تم کو چنا ہے۔ اور اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا۔

اس آیت میں غالباً بنو اسماعیل کے انتخاب کا ذکر ہے۔ اس نسل کا انتخاب کرکے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک لیے کائناتی معرفت اور عالمی دعوت کی پلاننگ کی ہے۔

3۔ اصحابِ رسول کا رول: بنو اسماعیل میں اللہ تعالی نے ایک گروہ پیدا کیا جن کو ہم اصحاب رسول کہتے ہیں۔ اس گروہ کو اللہ تعالی نے مذہبی جبر کے خاتمے کے لیے برپا کیا تاکہ ختم نبوت کا خدائی منصوبہ پائے تکمیل تک پہنچے۔ اس خدائی منصوبے کے تحت اصحابِ رسول کی شکل میں ایک مضبوط جماعت کا قیام عمل میں آیا، جس نے مذہبی تعذیب کے دور کا خاتمہ کیا اور مذہب کو اقتدار کے جبر سے آزاد کرایا۔ جس کی بنا پر دنیا میں حقیقی خدا پرستی وجود میں آئی اور انسان کو یہ موقع ملا کہ وہ تخلیق کو خالق کا درجہ دینے کے بجائے مخلوق کا درجہ دے اور تخلیق کو تحقیق کا موضوع بنائے۔ اسی کے نتیجے میں بتدریج دورِ جدید کا ظہور ہوا جس کو آج ہم سائنسی دور کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا دورِ صحابہ سے ہوئی، اور اس کا کلمنیشن (culmination) اہل یورپ کے ذریعے اکیسویں صدی میں ہوا۔ اس اعتبار سے اسلام کو ''دور جدید کا خالق'' مانا جاسکتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں اسی رول کی طرف اشارہ ہے کہ صحابہ کرام نے خدا کے منصوبے کو سمجھا اور ایک دوسرے سے مسابقت کیا اور مشن کو پائے تکمیل تک پہنچایا جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (9:100)۔ یعنی اور مہاجرین و انصار میں جو لوگ سابق اور مقدم ہیں اور جنھوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ اگر کوئی گروہ اصحاب

رسول کی طرح خدا کے لیے وقت کا مطلوب رول ادا کرے گا وہ گروہ بھی خدا کی رضا کا امیدوار ہوگا۔

4۔ تکمیلِ دین: رسول اور اصحاب رسول نے جو جدوجہد کی، اس کا اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا۔ چنانچہ اس وقت قرآن کی جو آیتیں اتریں، ان میں ایک جز یہ تھا: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (5:3)۔ یعنی آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کرلیا۔

یہاں تکمیلِ دین کا مطلب استحکامِ دین ہے، نہ کہ فہرستِ احکام کی تکمیل۔ اور نہ ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دین ناقص تھا، اب دین مکمل ہوگیا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے رسول اور اصحاب رسول کو دعوت سے اقتدار کے مرحلے تک پہنچا دیا اور دین اسلام کو مستحکم کر دیا، جس کی وجہ سے حفاظتِ دین کا انتظام ممکن ہوا۔

اس آیت کے بعد بھی وحی کا سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً، ابن عباس وغیرہ کے مطابق، سورہ البقرہ کی آیت نمبر 281 سب سے آخری آیت ہے (الاتقان فی علوم القرآن، جلد 1، صفحہ 178)۔ اس لیے اس آیت سے استحکام دین کا وہ اعلان ہو رہا ہے، جس کی بنا پر ختم نبوت کا منصوبہ ممکن ہو پایا۔ تکمیل دین کی یہی توجیہ عین مطابقِ واقعہ ہوگی۔

5۔ حفاظتِ قرآن: قرآن مجید کی کامل حفاظت خدا کا منصوبہ تھا (الحجر، 15:9)۔ اسی مقصد سے مسلمانوں کو اقتدار کی طاقت عطا کی گئی، اور اسی بنا پر ختم نبوت کا منصوبہ بھی ممکن ہوا۔ ورنہ پوری تاریخ میں کسی بھی نبی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ نسل درنسل اپنی تعلیمات کی حفاظت کر سکے۔ تقریباً تمام انبیائے کرام اور ان کے اصحاب پر معاصر بادشاہوں نے شدید مظالم ڈھائے، اپنی جان بچانے کی خاطر انھوں نے ہجرت کی۔ یہی تعذیب تھی جو مکمل طور پر حفاظتِ دین کے لیے مستقل رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ جیسا کہ حضرت مسیح اور پیروان مسیح کی زندگی اس بات کی قریبی دلیل ہے اور انجیلِ مقدس کی غیر محفوظیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے۔

اس پس منظر میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو اقتدار کا ملنا اور اس کا چھن جانا آخر کس بنا پر تھا۔ روایتی دور میں جب تک قرآن کی حفاظت کا مسئلہ تھا مسلمانوں کو اقتدار کی طاقت دی گئی تھی۔

جب پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے قرآن کی حفاظت کا بہتر انتظام ہوگیا تو اقتدار کی طاقت غیر اہم ہوگئی۔ حفاظتِ قرآن کے اس انتظام کے بعد اشاعتِ دین کے لیے سارا زمانہ خود ہی تائید میں آگیا ہے۔ آج اسلام کی تعلیمات کی اشاعت کے لیے اقتدار کی ضرورت نہیں ہے بلکہ پر امن منصوبے کی ضرورت ہے۔

قرآن کی اس آیت میں حفاظتِ قرآن کے اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (15:9)۔ یعنی، یہ یاددہانی (قرآن) ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

حفاظتِ قرآن کے خدائی منصوبے کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اگر امت اس بات کو نہ سمجھے تو وہ اقتدار میں غالب آنے والی قوموں کے خلاف منفی نفسیات میں مبتلا ہوگی اور اقتدار کے حصول میں اپنا وقت ضائع کرے گی۔

6۔ اظہار دین: بعض آیات کی صحیح توجیہ نہ کرنے کی وجہ سے اقدام میں فرق ہوجاتا ہے۔ انہیں آیات میں سے اظہارِ دین والی آیت ہے۔ اس آیت میں اظہار دین کا مطلب سیاسی غلبہ نہیں ہے، بلکہ دینِ اسلام کا فکری اظہار ہے۔ اظہارِ قوم نہیں، بلکہ دین کا اظہار ہے۔ یہ بات اس آیت میں خود موجود ہے۔ آج اسلام کے حق میں وہ سارے علمی دلائل جمع ہو چکے ہیں جو اسلام کے فکری غلبے کے ہم معنی ہیں۔ آج دین کے فکری اظہار کے لیے علمی تیاری کی ضرورت ہے، نہ کہ عالمی اقتدار کے لیے جنگ کی تیاری کی۔ قرآن مجید میں اظہارِ دین اور اتمامِ نور کے الفاظ اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس دور میں تقریباً دونوں وعدے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (48:28)۔ یعنی، اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کردے۔ سورہ الصّف میں ہے کہ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ (61:8)۔ یعنی اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا۔

اظہار دین اور اتمام نور کا واقعہ خدائی مشن کی تکمیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

7۔ اِنذار عالم: ختمِ نبوت کے بعد امت مسلمہ پر فرض کے درجے میں کارنبوت کی ادائیگی کی ذمہ داری ہے، یعنی اِنذارِ عالم کی ذمہ داری۔ اس کو واقعہ بنانے کے لیے خدا نے دورجدید میں ہر قسم

کی کمیونی کیشن کی سہولیات مہیا کیں، اور عالمی اِنذار کا عمل ممکن ہو گیا۔ امت مسلمہ کو عالمی اِنذار کی پلاننگ کرنی تھی، نہ کہ عالمی اقتدار کی منصوبہ بندی کی۔

مگر دو سو سال کی تاریخ گواہ ہے کہ امتِ مسلمہ نے خلافت اسلامیہ کی واپسی کے لیے اَن تھک کوششیں کی۔ لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا، بلکہ برعکس طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی جارحانہ کارروائیوں کی وجہ سے اسلام کو دہشت گردی پر ابھارنے والا مذہب سمجھا جانے لگا۔ ایک طرف عالمی سطح پر اسلام کی امیج بلڈنگ کی ضرورت تھی تو دوسری طرف عالمی تبلیغ و انذار کی۔ قرآن مجید میں اسی عالمی اِنذار کے بارے میں بتایا گیا ہے:

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (25:01)۔ یعنی، بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔

عالمی اِنذار کو واقعہ بنانا اس دور میں ممکن ہو گیا ہے، اگر اس موقع کو بھرپور طور پر استعمال نہ کریں تو خدا کے یہاں پکڑ ہو گی۔

8۔ عصری اسلوب میں اسلام کی تبئینِ نو: زمانے کی نسبت سے مدعو کے ذہن کو اڈریس کرنے کے لیے جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے اس کو لسان قوم میں بات کرنا کہتے ہیں۔ آج ایک داعی کو مدعو کے لحاظ سے اسلوبِ عصری کو جاننا ضروری ہے۔ عصرِ حاضر تمثیلی اسلوب کے بجائے سائنٹفک اسلوب میں کلام کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ عصر حاضر کا اسلوب ریزن بیسڈ اسلوب اور تحقیق بیسڈ اسلوب ہے۔ چنانچہ اسلامی لٹریچر کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش الرسالہ مشن کے ذریعے ہوئی ہے۔ عصری اسلوب کے تقاضوں کی رعایت الرسالہ لٹریچر میں پائی جاتی ہے۔ اسلوبِ عصر میں کلام ہی اس لٹریچر کی خصوصیت ہے، اللہ تعالی صاحبِ مشن کو جزائے خیر عطا کرے کہ انھوں نے اس مقصد کے لیے اپنے خون کے آخری قطرے تک کو نچوڑ کر امتِ مسلمہ کی طرف سے یہ فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ فرضِ عین کے درجے میں اس لٹریچر کو استعمال کریں اور دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیں۔ کیونکہ دعوت ایک سنگین ذمہ داری ہے۔ اور اسلوب عصر اس کی ناگزیر ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (14:04)۔ یعنی اور ہم نے جو رسول بھی

بھیجا، اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان سے بیان کردے۔ اس آیت میں لسان قوم کا مطلب ہے لسان عصر۔

9۔ اجتہاد: اجتہاد ہر زمانے کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، تاکہ قیامت تک دین کی عصری تطبیق اور دین کی تبلیغ ہو سکے۔ اجتہاد کی اسی اہمیت کو ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: عَنْ عَمْرِو بْنِ العَاصِ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7352)۔ یعنی، جب کوئی فیصلہ کرنے والا فیصلہ دینے میں صحیح اجتہاد کرے تو اس کے لیے دہرا اجر ہے، اور اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

حدیث کے مطابق، غلط اجتہاد میں بھی ثواب ہے اگر نیت صحیح ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ بدلے ہوئے حالات کی رعایت کرتے ہوئے تطبیقِ نو کرنا ہی اجتہاد ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ تعبدی امور میں نئے اجتہاد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دعوتی اور تربیتی امور میں ہر وقت اجتہاد کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اگر اجتہاد کو کالعدم قرار دے دیا جائے تو تبیینِ حق کا کام انجام نہیں پاسکتا۔ اور اسلام عملاً ایک ماضی کی داستان بن کر رہ جائے گا، وہ حال اور مستقبل کے لیے اپنا ریلیونس کھودے گا۔ اس روش سے نہ ہی ازدیادِ ایمان نصیب ہوگا اور نہ ہی فریضۂ دعوت کا حق ادا ہوگا (قرآن، حدیث اور اجتہاد، یہی اِحیاءِ اسلام کے ضامن ہیں)۔

10۔ دورِ جدید: موجودہ دور قدیم دور سے مختلف ہے۔ اس دور میں ہر قسم کی ایجادات اور ہر قسم کی آزادیاں ہیں۔ اس میں ہر قسم کے مثبت اور منفی تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ اگر ہم اس تبدیلی سے بے خبر ہیں تو صحیح معنوں میں ہم دینِ اسلام کی اشاعت اور اس کی تبیین کے لیے مطلوب کردار ادا نہیں کرسکتے۔ دورِ جدید دورِ اسلام ہے۔ لیکن یہ دور اسلام کی موافقت کے اعتبار سے پوٹنشل (potential) حالت میں ہے۔ اس کو ایکچول (actual) بنانے کی ذمہ داری امتِ مسلمہ کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالی نے دورِ جدید میں مادی سفر آسان کر دیا ہے، اسی طرح معنوی سفر بھی خدا نے آسان کر دیا ہے۔ قرآن میں آیا ہے:

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

(16:07) ۔یعنی، اور وہ جانور تمہارے بوجھ اٹھا کر ایسے شہر تک لے جاتے ہیں جہاں تم اپنی جان کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہنچ سکتے، بیشک تمہارا رب بڑا شفیق، مہربان ہے۔

اس آیت کے مطابق معلوم ہوا کہ ماضی میں انسانی مشقتوں کو حیوانی تعاون کے ذریعے سے حل کیا جاتا تھا مگر آج میکانیکل سپورٹ کے ذریعے سے حل کیا جاتا ہے۔ گویا جدید دور کے اس انقلاب نے انسان کی ہر مشقت کو دور کر دیا ہے، چاہے وہ مادی ہو یا معنوی۔

11۔ دورِ امن: رسول اور اصحاب رسول نے جو جنگیں کی تھیں، اس کا اہم مقصد یہ تھا کہ مذہب کے حق میں پر امن ماحول قائم ہو جائے، اور مذہبی تعذیب کا خاتمہ ہو جائے جس کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (2:193) یعنی اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔

صحابہ کرام نے اسی فتنے کو ختم کرنے اور دور امن کو وجود میں لانے کے لیے جنگ کی تھی۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا تھا: قَاتَلْنَا حَتَّى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ، وَكَانَ الدِّينُ لِلَّهِ، وَأَنْتُمْ تُرِيدُونَ أَنْ تُقَاتِلُوا حَتَّى تَكُونَ فِتْنَةٌ، وَيَكُونَ الدِّينُ لِغَيْرِ اللَّهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4513) ۔یعنی ہم جنگ کر چکے ہیں، یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا، اور دین سارا کا سارا اللہ کے لیے ہو گیا، اور تم جنگ کرنا چاہتے ہو، یہاں تک کہ دوبارہ وہ فتنہ آئے، اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔

دوسرے الفاظ میں، اب جو جنگ ہوگی وہ ملک ومال کے لیے ہوگی۔ اس کی وجہ سے یہ اندیشہ ہے کہ قدیم دور کا مذہبی جبر والا فتنہ واپس نہ آجائے۔ گویا ختم فتنہ کے بعد جو عمل کرنا ہے، وہ پر امن دعوت کا مشن ہے، نہ کہ دوبارہ جنگ کی حالت کو واپس لانا۔ اب مذہبی امور کے لیے جنگ موقوف ہو چکی ہے۔ کیوں کہ جو چیز ماضی میں جنگ کے ذریعے ملتی تھی آج وہ پر امن منصوبے کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ آج جنگ صرف تباہی لاتی ہے، کامیابی نہیں۔ یہ زمانہ بڑے پیمانے پر تباہی لانے والے ہتھیاروں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں جنگ کے برے اثرات صرف دو لڑنے والے فریقوں کے درمیان نہیں رہتے ہیں، بلکہ اس تباہی کا برا انجام عام لوگوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ جنگ کا انجام اجتماعی ہلاکت (mass destruction) کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس دور میں ہتھیار سے جنگ کرنا اسلام کی روح کے سراسر خلاف ہے۔ آج کا انسان حقیقت میں امن وشانتی کا متلاشی ہے، جنگ کا نہیں۔ اگر اہل

ایمان اس بات کو سمجھ جائیں تو امن کی طرف دنیا اپنے قدم مزید آگے بڑھائے گی۔ بس اس کی ایک ہی شرط ہے کہ اہل اسلام اپنے دعوتی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت پر پر امن جدو جہد کریں، نہ کہ کوئی پر تشدد اقدام۔ جدید دور، دور امن ہے۔ مگر یہ پوٹنشل حالت میں موجود ہے، اور اس کو ایکچول بنانے کی ذمہ داری اہل اسلام کی ہے۔

12۔ معرفت اعظم: تخلیقات میں غور فکر کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایک اعلیٰ فریم ورک اور ایک بہترین انفراسٹرکچر (infrastructure) درکار تھا، وہ آج میسر ہو گیا ہے۔ چنانچہ خالق کی معرفت کو تخلیق کی معرفت سے جاننے کا اتنا بڑا موقع اہل ایمان کو اس سائنسی دور میں ملا ہے، جو اس سے پہلے اتنے اعلی پیمانے پر حاصل نہ تھا۔ اس کے ذریعے وہ اثبات ایمان بھی کر سکتے ہیں اور اپنے لیے ازدیاد ایمان کا سامان بھی فراہم کر سکتے ہیں۔

اسپرٹ آف انکوائری یعنی تلاش و جستجو کے نتیجے میں جو کائناتی نشانیاں ڈسکور ہوئی ہیں، وہ عین اسلام کے حق میں ہے۔ لہٰذا یہ دور اعلیٰ معرفت کا دور ہے، اگر ہم مادی مسائل میں الجھنے کے بجائے معرفت کو اپنا مقصود بنائیں تو معرفتِ اعظم کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ معرفتِ اعظم کوئی پر اسرار بات نہیں ہے۔ کائنات کی نشانیوں کے ذریعے دلائل اعظم کا پانا ہی معرفت اعظم کا پانا ہے۔ اس دنیا میں دلائلِ اعظم ہی سے حقیقتِ اعلی کا ادراک ممکن ہے۔ کیوں کہ احادیث میں اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ کی ذات پر نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

تَفكَّرُوا فِي آلاءِ اللهِ، ولاتَفكَّرُوا في اللهِ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 6319)۔ یعنی اللہ کی نعمتوں میں غور وفکر کرو، اللہ کی ذات میں نہیں۔ ابن عباس کی ایک روایت میں ہے: تَفَكَّرُوا فِي كُلِّ شَيْءٍ، وَلَا تَفَكَّرُوا فِي اللَّهِ (العظمۃ لابی الشیخ الاصبہانی، حدیث نمبر 2)۔ یعنی ہر چیز میں تفکر کرو، اور اللہ کی ذات میں تفکر نہ کرو۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: فَإِنَّكُمْ لَا تَقْدُرُونَ قَدْرَهَ (العظمۃ لابی الشیخ الاصبہانی، حدیث نمبر 5)۔ یعنی تم اس کی قدرت نہیں رکھتے ہو۔

ان احادیث میں ''آلاء اللہ'' اور ''کل شئ'' میں غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالی کی تخلیقات میں غور کرو، اس سے تم کو خالق کی معرفت حاصل ہو گی۔ یہ عملاً اِس دور میں اعلیٰ پیمانے پر قابل تطبیق ہو چکا ہے۔ خوردبین، اور دوربین کی ایجاد کے بعد، تخلیق کا تفصیلی علم حاصل کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس فرق

کے ساتھ کہ سائنسداں کی نظر صرف قوانین فطرت کی معلومات تک رہتی ہے، مگر اہلِ ایمان کے لیے وہ معرفت کا سامان ہوتا ہے۔ سائنسدان کو معلومات اعظم ملتی ہیں، اور اہل ایمان کو معرفت اعظم۔

13۔ شہادتِ اعظم: دور جدید میں جو انفراسٹرکچر (infrastructure) تیار ہوا ہے اور آفاق وانفس کے جو دلائل کھولے گئے ہیں اس کی وجہ سے خدا اور آخرت کے اثبات کے لیے دلائلِ اعظم فراہم ہوگئے ہیں۔ اب اہل ایمان کو اقوامِ عالم کے درمیان شہادت اعظم کا فریضہ ادا کرنا ہے، نہ کہ لڑ کر اپنے آپ کو یا سامنے والے کو ختم کر دینا۔ آج حجت و برہان کی طاقت سے حجت قائم کرنا ہے، نہ کہ تلوار و بم کے ذریعے خون بہانا۔ ایک حدیث میں بذریعہ دلائل حق کو ثابت کرنے والے کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: هذا أَعْظَمُ النّاسِ شَهادَةً عِنْدَ رَبِّ العالَمِينَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2938)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ آدمی رب العالمین کے ہاں سب سے بڑی شہادت کا حامل ہوگا۔

اس حدیث میں غالباً اسی عظیم شہادت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کو ادا کرنے پر خدا کے یہاں بڑا اجر مقدر ہے۔ شہادت علی الناس کا یہ عظیم موقع ہر داعی کے لیے مقدر ہے، تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے — لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165)۔ خدا کی طرف سے حجت کو ادا کرنے کا یہ فریضہ دلائل و براہین کے میدان میں ہوگا، نہ کہ میدانِ جنگ میں۔

14۔ مثبت فکر: انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی یا دعوتی رول، اگر اس کو پر امن طریقے سے گزارنا ہے تو صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ ہے مثبت فکر کو اپنانا۔ ورنہ شکایت اور نفرت کا ذہن پیدا ہوگا اور سماج کو تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لہذا کسی کو دشمن سمجھنا، سازشی سمجھنا، ظالم سمجھنا یہ ساری چیزیں مثبت فکر کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب تک اس روش کو ترک نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک کوئی بڑا تعمیری کام انجام نہیں پا سکتا۔ انفرادی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ اسی لیے قرآن میں بار بار شکر گزار بننے پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن کی یہ آیت: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (14:07)۔ یعنی تم شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا۔

شکر مزید پر انعام مزید کے وعدے ہیں، ناشکری کی زندگی تو حسرت میں اضافہ کرے گی۔

مثبت فکر خدا کے تعلق سے مثبت رہنا سکھاتی ہے ورنہ انسان خدا ہی سے منفی اور بدظنی کا شکار ہو جاتا ہے۔ایک حدیث میں مومن کو دعاء کے الفاظ یہ بتائے گئے ہیں: وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ، وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 771)۔یعنی تمام بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور برائی کی نسبت تیری طرف نہیں ہے۔دوسرے الفاظ میں، بندہ خدا سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ اس کے تعلق سے مثبت ذہن کے ساتھ رہے گا۔

علما کے مطابق، خدا کے تعلق سے یہ سوچ تقدیر کا مسئلہ ہے۔اس اعتبار سے مثبت ذہن پر قائم رہنا گویا عقیدے کا مسئلہ ہے۔مثبت فکر کو اپنانا گویا خیر کا سرچشمہ حاصل کرنا ہے۔

15۔تزکیہ: کائنات کی ہر چیز انسان کو یہ سبق دینا چاہتی ہے کہ اپنے اندر ذہنی ارتقا پیدا کرو(آل عمران، 193-3:190)۔خدا کی کائنات میں نکٹر (nector) کی طرح تزکیہ کے بے شمار آئٹم چھپے ہوئے ہیں۔اگر انسان اس کی آواز پر کان لگائے تو اپنے ایمان میں اضافہ بھی ممکن ہے اور اخلاق میں درستگی بھی۔قرآن اگر کتابِ مسطور ہے تو کائنات کتابِ مشہود ہے۔

لہذا تزکیہ کا تعلق اوراد و وظائف سے نہیں ہے بلکہ شعوری دریافتوں سے ہے،جن اوراد ووظائف کو ہم پڑھتے ہیں وہ بھی انبیائے کرام کے شعوری الفاظ ہیں، نہ کہ ہماری طرح محض تکرار لسانی یا رٹے ہوئے الفاظ۔تزکیہ نام ہے ربانی دسترخوان سے رزق معرفت حاصل کرنے کا۔تزکیہ نام ہے شعوری سطح پر تعمیرِ شخصیت کا۔مزکی انسان ہی کے لیے جنت ہے، نہ کہ کسی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جانے سے جنت ملے گی۔تزکیہ ایک شعوری عمل ہے،اپنے آپ کو بے خودی اور مدہوشی کے عالم میں لے جانے کا نام تزکیہ نہیں۔قرآن کریم کی مختلف آیات سے تزکیہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے: وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَن تَزَكَّىٰ (20:76) یعنی یہ (جنت) بدلہ ہے اس شخص کا جو پاکیزگی اختیار کرے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ (87:14)۔یعنی کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا (91:9)۔کامیاب ہوا جس نے نفس کو پاک کیا۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے شعور کو ڈیولپ کرے اور شعوری تزکیہ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔شعوری تزکیہ ہی ارتقاء ذہنی کا ذریعہ ہے۔یہی تزکیہ عبرت پذیری سکھاتا ہے، اسی سے انسان درس وعبرت والی زندگی گذار سکتا ہے۔

16۔ اخوان رسول کا رول: مادی ترقی ہو یا معنوی ترقی اس کے لیے ایک بوسٹر (booster) کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک شدید محرک کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اس کا حق ادا ہو اور آگے بڑھنے کا ذہن پیدا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں آنے والے امتی کو اخوان رسول کا ٹائٹل دیا ہے۔ آپ نے یہ ٹائٹل بطور مشن دیا ہے، نہ کہ بطور فضیلت۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، آپ نے کہا:

وَدِدْتُ أَنَّا قَدْ رَأَيْنَا إِخْوَانَنَا، قَالُوا أَوَلَسْنَا إِخْوَانَکَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ أَنْتُمْ أَصْحَابِي وَإِخْوَانُنَا الَّذِينَ لَمْ يَأْتُوا بَعْدُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 249)۔ یعنی میں پسند کرتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھیں، صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں آپ نے فرمایا تم تو میرے صحابہ ہو اور ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے۔

رسول اللہ کا مشن قیامت تک لوگوں پر خدا کی حجت قائم کرنا ہے۔ اسی عمل کی ترغیب کے لیے رسول اللہ نے اس حدیث میں داعیٔ حق کو اخوانِ رسول کا لقب دیا ہے تاکہ سارے امتی اس مشن کو شعوری طور پر جانیں اور رسول اللہ کے مشن پر قائم ہو کر مطلوب دعوتی رول ادا کریں۔ کارنبوت کی ادائیگی ہی رسول سے محبت کا تقاضا ہے۔ اصحابِ رسول سے جو تقاضا تھا اسی طرح اخوان رسول سے بھی ایک تقاضا ہے۔ اصحاب رسول سے حفاظت قرآن کا مشن مستحکم ہوا، اخوان رسول سے اشاعت قرآن کا مشن گھر گھر پہنچنا ہے۔

17۔ دورِ تائید: اشاعت قرآن کے لیے اللہ تعالی نے ایک ایسا دور ظاہر کیا ہے، جس کو ہم دور تائید کہہ سکتے ہیں۔ دورِ جدید اسلام کے حق میں دور تائید ہے، نہ کہ دور تعذیب۔ دعوت کا عملی اقدام ہو یا فکری اظہار دونوں کے لیے یہ دور موافق دور ہے۔ اس کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم نے خدا کے اس منصوبے کو نہیں سمجھا تو اندھے اور بہرے بنے رہیں گے، اور اپنا مطلوب رول ادا نہیں کر پائیں گے، اور یہ ڈر ہے کہ خدا کے یہاں ان مواقع کو ضائع کرنے پر سخت پوچھ ہوگی۔ اس تائیدی رول کے بارے میں مختلف احادیث میں بتایا گیا ہے۔ مثلاً قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيُؤَيِّدُ الإِسْلَامَ بِرِجَالٍ مَا هُمْ مِنْ أَهْلِه (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 14640)۔ اس معنی کی حدیث صحیح البخاری میں ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ

هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الفَاجِرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3062)۔ان دونوں احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ہر قسم کے افراد سے کرے گا، خواہ وہ سیکولر ہوں، یا غیر دیندار۔

اس قسم کی کئی احادیث ہیں جو غیر اقوام کے 'تائیدی رول' کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اگر ہم اس دور کو ڈسکور کریں تو ہر ترقی ہمیں اپنی تائید نظر آئے گی اور ہر شخص دین اسلام کا مؤید نظر آئے گا چاہے وہ مغربی ہو یا مشرقی۔

18۔اہل مغرب کا رول: اہلِ مغرب اسلام کے لیے مؤیدین کا گروہ ہیں، نہ کہ مخالفین کا گروہ۔ خدا نے ان کو اپنے دین کی خاطر سائنسی ترقی دی ہے۔ امتِ مسلمہ کو چاہیے کہ ان کی ایجادات اور ان کی کوششوں کا دل سے اعتراف کریں۔ ان سے شکایت کو اپنے اوپر حرام سمجھیں۔ انھوں نے جو تہذیب دی ہے اس کو سمجھیں۔ اگر ان میں کلچر کی برائیاں ہیں تو اس کو دعوت کا موضوع سمجھیں، نہ کہ دشمنی اور نفرت کا۔ کیوں کہ اس کا تعلق انسانی آزادی کے غلط استعمال سے ہے، نہ کہ اہلِ مغرب کی سائنسی ترقی سے۔

آج اہل مغرب میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو اپنے اندر اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور جنھوں نے انسان کو جدید سہولیات سے نوازا ہے۔ ہمیں ان تمام چیزوں کا اعتراف کرنا ہے اور اسلام کے حق میں انھیں استعمال کرنا ہے۔ ان چیزوں کے استعمال کی قیمت کھلے اعتراف ہی سے ادا کی جاسکتی ہے۔ آج ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم ویسٹوفوبیا میں مبتلا ہونے کے بجائے ان کی خدمات کا اعتراف کریں، اور ان کی ایجاد کردہ چیزوں کو دعوتی میدان میں استعمال کریں۔

آج مسلم برانڈ کے نام سے کوئی مادی چیز کو ایجاد کر کے اپنا الگ جزیرہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ امتِ مسلمہ ویسٹ کی ایجادات کو استعمال کریں، اور اپنے پاس موجود سب سے بڑی چیز قرآن کو ان لوگوں کے سامنے بطور دعوت پیش کریں۔ کیوں کہ اللہ قیامت کے دن پہلے مادّی ایجادات کے بارے میں نہیں پوچھے گا، لیکن دعوتی کوتاہی کے بارے میں وہ ضرور پوچھے گا۔ ایک حدیث میں اہل مغرب کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ قیامت کے قریب ان کا غلبہ رہے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: قَالَ الْمُسْتَوْرِدُ الْقُرَشِيُّ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: تَقُومُ السَّاعَةُ وَالرُّومُ أَكْثَرُ النَّاسِ (صحیح مسلم،

حدیث نمبر 2898)۔ یعنی، قیامت کے قریب اہل روم سب سے زیادہ تعداد میں ہوں گے۔

اس غلبہ والی بات کو جب قرآن میں بیان کردہ ایک خبر سے ملا کر سمجھا جائے تو یہ ایک مثبت بات بن جاتی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان کے لیے نصاریٰ اپنے دل میں سب سے زیادہ نرم گوشہ رکھتے ہیں: أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً (5:82)۔ یعنی، ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں تم سب سے زیادہ ان لوگوں کو پاؤ گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں، یہاں اہلِ مغرب سے بے نتیجہ مقابلے سے روکا گیا ہے۔ اس لیے اب ان کے تائیدی رول کو جاننے کی ضرورت ہے، نہ کہ ان سے دشمنانہ طریقہ اختیار کرنے کی۔ قرآن دشمنی میں اضافے کا حکم نہیں دیتا ہے، بلکہ حسنِ سلوک کے ذریعے دشمنی کو دوستی میں بدلنے کی تلقین کرتا ہے (فصلت، 41:34)۔

19۔ تخلیق کے ادوار: تخلیق کے چھ ادوار ہیں جس میں انسان کی تخلیق سب سے آخر میں ہے۔ انسان کو خدا نے اپنی معرفت کے قولی اظہار کے لیے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ انسان کو اس دنیا میں خود دریافت کردہ معرفت پر کھڑا ہونا ہے اور اقوامِ عالم کے درمیان اس کا اظہار کرنا ہے۔ ساری تخلیق کا مقصد خدا کی معرفت ہے۔ اور انسان ایک استثنائی مخلوق ہے جو آزادی کا اختیار رکھتے ہوئے سیلف ڈسکوری پر خدا کو دریافت کرنے اور سیلف ڈسپلن پر رہنے کی ذمہ داری لیے ہوئے ہے۔ جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے: وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (33:72)۔ یعنی اور انسان نے اس (امانت) کو اٹھالیا۔ بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

مولانا کے مطابق، امانت سے مراد اختیار و آزادی سے کام کرنا ہے۔ انسان نے کائنات کے آغاز میں اپنے لیے امانت، یعنی آزادانہ اختیار کا چوائس لیا۔ قرآن کی مختلف آیتوں میں تخلیقی ادوار کا ذکر ہے۔ یہ انسان کی معرفت میں اضافہ کرنے لیے ہے، نہ کہ صرف خبر دینے کے لیے۔ مولانا کی تحریروں کو اگر ترتیب سے جمع کیا جائے تو کائنات کے آغاز اور اس کے انجام کا ایک نقشہ تیار ہوسکتا ہے۔ سیکولر لوگوں نے اگر دنیا کے مادی نقشے کی ترتیب کی کوشش کی ہے تو مولانا نے معنوی نقشہ تیار کیا ہے۔

20۔ تاریخ کی تعبیر: تاریخ کی تعبیر جنھوں نے بھی کی ہے وہ خدا کے منصوبۂ تخلیق سے واقف

نہیں تھے۔ انھوں نے تاریخ سے منفی غذا لی۔ خدا کے نقشے کے مطابق یہ ہے کہ خدا نے انسان جیسی ایک بااختیار مخلوق پیدا کی اور خدا خود انسان کی آزادی کو ہر وقت چیلنج کر رہا ہے۔ قرآن میں انسانی تاریخ کے آغاز کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، جو فرشتوں اور خدا کے درمیان ہوا تھا:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (2:30)۔ یعنی، اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جب اپنا ایک نیا منصوبہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے مجموعے کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی۔ مگر خدا نے جب مطلوب افراد کی فہرست بیان کی تب فرشتوں نے خدا کا منصوبہ سمجھ لیا۔ اگر ہم انسانی تاریخ کو مثالی افراد کا باغ سمجھیں تو تاریخ اس سے خالی ملے گی، اگر ہم یہ مانیں کہ یہاں غیر مثالی دنیا میں مثالی افراد کا انتخاب ہو رہا ہے۔ یعنی، تاریخ میں صالح افراد کو چنا جا رہا ہے، تو انسانی تاریخ ایک بامعنی تاریخ بن جائے گی۔ ورنہ تاریخ صرف خاک وخون کی داستان نظر آئے گی۔ تاریخ میں صالح افراد کو چننے کا خدائی عمل جاری ہے، تاکہ ان کو خدا کی جنت میں بسایا جائے۔

21۔ تاریخ کا ربانی سفر: معرفت ہی مقصدِ تخلیق ہے۔ اسی بنیاد پر تاریخِ انسانی اپنا سفر طے کررہی ہے۔ اس دنیا میں معرفت کے سفر کا آغاز ہوتا ہے جو ابدالآباد تک جاری رہے گا۔ خدا اپنے منتخب افراد کو یہ موقع دے گا کہ وہ کبھی ختم نہ ہونے والی معرفت کا سفر جاری رکھیں۔ چنانچہ کوئی بھی تخلیق بے کار نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم سفر کا حصہ ہے جس کو ربانی سفر کہا جاتا ہے، جس کی قیمت ربانی زندگی اپنانے سے ادا ہوگی۔ سیاست یا قومیت کے مسائل میں الجھے رہنے سے نہیں ہوگی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے: قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (18:109) یعنی، کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی نشانیوں کو لکھنے کے لیے روشنائی ہوجائے تو سمندر ختم ہوجائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔ اس آیت میں جو بات ہے وہ صرف ایک خبر کے طور پر

نہیں ہے بلکہ مطلوب عمل کے طور پر ہے جس عمل کو ایک مومن بندہ ابد الآباد تک انجام دیتا رہے گا۔ گویا دنیا اور آخرت میں حمدِ رب میں جینا ہی اصل جینا ہے۔

22۔ حدیبیہ منہاج: مولانا نے الرسالہ میں صلح حدیبیہ کے واقعے کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کو قرآن میں فتح مبین (الفتح، 48:1) کہا گیا ہے۔

صلح حدیبیہ سے یہ پتہ چلا کہ جان کی قربانی کے مقابلے میں وقار کی قربانی زیادہ بڑی چیز ہے۔ یہی وہ قربانی تھی جس نے رسول اللہ کے مشن کو فتح مبین تک پہنچایا۔ انسان کے دلوں کو جیتنے کا یہ حکیمانہ طریقہ سب سے پہلے رسول اللہ نے دنیا والوں کو انٹروڈیوس کیا، یعنی یک طرفہ طور پر فریقِ مقابل کی ہر شرط کو مان لینا۔ تا کہ امن کا ماحول بنے، آج اسی امن کے حصول کے لیے مسلمانوں کو ماضی کی عظمت باہر آنا ہوگا۔ حدیبیہ منہاج اجتماعی کامیابی کے لیے شاہ کلید ہے۔ یہ مادی شکست میں معنوی فتح کی کامیابی کا راز ہے، اور مادی فتح سے زیادہ معنوی فتح اسلام کا اصل مطلوب ہے۔ اس لیے قرآن میں اس کو فتح مبین کہا گیا ہے: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا (48:01)۔ یعنی بے شک ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی۔

دعوتی مشن کا سفر ہمیشہ ''صلح حدیبیہ'' کی حد تک جاتا ہے۔ جس نے اس راز کو جان لیا وہی فاتح ہے اور جس نے ٹکراؤ کا راستہ اختیار کیا، وہ شکست کھا گیا۔ آج عالمی طور پر اقوام متحدہ میں ایک ناجنگ معاہدہ طے پایا ہے۔ گویا دنیا اصولی طور پر اس کی پابند ہوگئی ہے کہ کوئی بھی ملک دوسرے ملک پر جارحانہ کارروائی نہیں کرے گا۔ اس موجود صورتِ حال کو صلح حدیبیہ کی توسیعی سنت سمجھنا چاہیے، اور اس سے عالمی فائدے حاصل کرنا چاہیے۔

23۔ اقامت دین: اقامت کے موضوع پر مولانا نے بہت لکھا ہے۔ اس کو ردعمل کہنا بہت بڑی نادانی ہے۔ اس کو عمل کا صحیح رخ متعین کرنے کی کوشش سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ اقامتِ دین کو نفاذِ دین یا کامل دین کا نفاذ سمجھ کر امت کو تکلیف مالا یطاق میں ڈال دیا گیا ہے۔ جس کا انجام یہ ہوا ہے کہ امت مایوسی کا شکار ہوئی، اور اس مفروضہ مقصد کے حصول کے لیے خودکش بمباری جیسے قبیح فعل تک کو اپنے لیے جائز کرلیا۔ دین ہر ایک سے مکمل قبولیت کا تقاضا کرتا ہے، مکمل نفاذ کا نہیں۔ جو لوگ اقامتِ دین کو تنفیذ شریعت کے معنی میں لیتے ہیں، وہ دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جس میں

اقتدار کی طاقت لازمی جز کے طور پر شامل ہو جاتی ہے۔ پھر امت ایک سیاسی اپوزیشن کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ جب کہ اس کی پہچان خدا اور آخرت کی طرف دعوت دینے والی امت کے طور پر مطلوب ہے۔ ورنہ امت کا ہر اقدام قوم رخی بن جاتا ہے، مدعو ہمیشہ اسی مغالطے میں رہتا ہے کہ اسلام بھی ایک سیاسی جنگ کا مذہب ہے، اخروی نجات کا مذہب نہیں ہے۔

دین کی ایسی تعبیر کرنا، جس کے ہم مکلف نہیں ہیں، یہی تحریف اور غلو ہے، اور اسلام میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ جس آیت سے یہ ہدف متعین کیا گیا ہے، وہ اس ہدف کے لیے، مطابق واقعہ بھی نہیں ہے اور نہ ہی مطابق تاریخ ہے۔ حتی کہ مطابق لغت بھی نہیں ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (42:13)۔ یعنی، اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

اس آیت میں الوالعزم انبیاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ہم حقیقت پسندی کے ساتھ ان کے اقامت دین کو سمجھنے کی کوشش کریں تو پتہ چلے گا کہ مذکورہ پیغمبروں نے نہ ہی اقتدار کی کوشش کی اور نہ نفاذ قانون کے لیے سرگرم رہے۔ بلکہ ان مشترک تعلیمات کی اشاعت کرنے میں لگے رہے، جس پر نجات کا دارومدار ہے۔ دین کی اقامت کا مطلب اس کا اتباع ہے، نہ کہ حکومت یا اقتدار کا قیام۔ کیوں کہ یہ بات تمام انبیائے کرام کے درمیان غیر مشترک بلکہ غیر موجود چیز کی حیثیت رکھتی ہے۔

24۔ احتساب خویش: اسلام کا مطلوب یہ ہے کہ افراد کے اندر احتساب غیر سے پہلے احتسابِ خویش کا ذہن پیدا ہو۔ دوسروں کی غلطیوں کا انکشاف کرنے سے زیادہ انسان اپنی غلطیوں کو دریافت کرے۔ قرآن میں الامر بالمعروف، والنہی عن المنکر کا حکم بھی آپسی اصلاح کے لیے ہے۔

مستقبل کی صحیح تعمیر کے لیے ماضی اور حال کی غلطیوں کو جان کر توبہ کی روش اختیار کرنا چاہیے۔ جب کوئی مصلح احتسابِ خویش کی ذمہ داری ادا کرے گا تو اس کی زد میں اس کی اپنی ذات بھی آئے گی اور ماضی اور حال کے اکابر بھی ہوں گے۔ یہ بہت ہی حساس عمل ہے۔ یعنی یہ قیامت سے پہلے قیامت کو قائم کرنا ہے۔ خدا کے سامنے حاضر ہونے سے پہلے اپنا دفتر چک کرنا ہے۔ یہی ایسا کام ہے

جس میں وقت کے مصلحین امت کا بھی امتحان ہے، اور متبعین شریعت کا بھی۔ قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (42:30)۔ یعنی، اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے پہنچتی ہے، اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔

اس آیت کے مطابق، مصیبت کا پہلا ذمہ دار خود مبتلا انسان ہے، نہ کہ کوئی دوسرا شخص۔ مولانا اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: موجودہ دنیا کو اسباب کے قانون کے تحت بنایا گیا ہے۔ یہاں آدمی پر جب بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ واضح طور پر اس کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کے یہ واقعات اس لیے ہیں کہ آدمی ان سے سبق لے۔

اپنی پیدا کردہ مصیبتوں کو جاننا بہت ہی مشکل کام ہے دوسروں کو دوشی ٹھہرانا بہت آسان ہے۔ ''اپنی ذات کو مسائل کا ذمہ دار ٹھہرانا'' یہی قرآنی روش ہے۔ دوسروں کی سازش کا انکشاف کرتے رہنا غیر قرآنی روش ہے۔ اگر احتساب خویش کے لیے امت تیار ہو جائے تو غیر معمولی تبدیلی واقع ہوگی (الرعد، 13:11)۔ مولانا کے الفاظ میں، اب اگر اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے، نہ کہ خارجی حملوں کی وجہ سے۔ اور اندرونی کمزوریوں سے پاک رہنے کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ اس کے افراد اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

25۔ خشیت انسانی، خشیت ربانی: یہ دور خشیت انسانی سے نکل کر خشیت ربانی میں داخل ہو گیا ہے۔ آج اسلام اور مسلمان دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ ارکانِ اسلام کا تقریباً ہر جگہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اللہ کی عبادت کے لیے کوئی حقیقی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر کسی جگہ مسلمانوں کو کوئی رکاوٹ ہے تو وہ ''آبیل مجھے مار'' کے اصول کے تحت ہے۔ قرآن وحدیث کی تعلیم کے لیے، مدارس اور مکاتب کا ایک مضبوط سلسلہ ہر جگہ قائم ہے۔ مسلمان کسی بھی معاشرے کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا وہ ماضی کے خوف اور خدشات میں جینا چھوڑ دیں، وہ خوفِ خدا میں جینے والے بنیں۔ قرآن میں حکم کے انداز میں بطور پیشین گوئی ارشاد ہوا ہے: فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (5:3)۔ یعنی تم اُن سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔

دوسرے الفاظ میں، اب جو دور آنے والا ہے، اس میں انسانوں سے ڈرنے کا ماحول نہیں ہوگا

توتم ان سے نہ ڈرو، بلکہ میری خشیت میں جیو۔ مولانا ہمیشہ امتِ مسلمہ کو انسان کے خوف سے نکالنا چاہتے تھے اور خدا کی خشیت کی طرف دعوت دیتے تھے۔ انسان کا خوف اگر ہو بھی تو وہ وقتی ہوگا مگر خدا کا خوف دائمی ہے۔ لہذا وقتی خوف سے نکل کر دائمی خوف کی طرف آگے بڑھنا ہوگا۔ بہ ظاہر حالات اگر خوف کے ہوں تو خدا پر ڈال دیں اور انتظار کریں۔ کیوں کہ مومن کا اصل سہارا خدا کی ذات ہے، نہ کہ کوئی اور طاقت۔

26۔ نفرتِ مغرب کا فتنہ: اس کا اشارہ حدیث میں فتنۂ دہیماء کے الفاظ میں موجود ہے۔ حدیث کے متعلق الفاظ یہ ہیں: ثُمَّ فِتْنَةُ الدُّهَيْمَاءِ، لَا تَدَعُ أَحَدًا مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا لَطَمَتْهُ لَطْمَةً (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4242)۔ یعنی پھر دہیماء کا فتنہ ہوگا، اور وہ اس امت میں سے کسی ایک فرد کو بھی نہیں چھوڑے گا مگر وہ اس کو ہٹ (hit) کرے گا۔ حدیث کے مطابق، فتنۂ دُہَیماء (سیاہ فتنہ) امت مسلمہ میں پھیلنے والا عمومی فتنہ ہوگا۔ لطمۃ سے مراد غالباً لطمۂ نفرت ہے۔ یعنی نفرت کا فتنہ اتنا زیادہ پھیلے گا کہ امت کا ہر فرد اس سے شدید طور پر متاثر ہوجائے گا۔ وہ ہر امت کے ہر فرد کو نفرت کا کیس بنا دے گا۔

یہ حادثہ اس طرح پیش آئے گا کہ جو مغربی قومیں حدیث کے الفاظ میں موید دین بن کر ابھریں گی، ان کے ساتھ ایک اور اتفاقی پہلو بھی شامل ہوگا۔ وہ یہ کہ یہ مغربی قومیں ایک طرف موید دین تہذیب لے کر ظاہر ہوں گی، لیکن اسی کے ساتھ ان کی دوسری حیثیت یہ ہوگی کہ وہ اس سیاسی کلچر کی حامل ہوں گی، جس کو نوآبادیاتی نظام (colonialism) کہا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام ایک اتفاقی سبب (chance factor) کی بنا پر اس تائیدی تہذیب کا حصہ ہوگا۔ مگر مسلم رہنما دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی پالیسی (delinking policy) اختیار نہ کرسکیں گے، اور سیاسی اختلاف کی بنا پر خود اپنی تائید کے لیے ظاہر ہونے والی تہذیب کے دشمن بن جائیں گے۔ مسلمانوں کا یہ مزاج اتنا زیادہ بڑھے گا کہ امت کا کوئی فرد اس کی زد میں آنے سے محفوظ نہ رہے گا۔

اگر ہم اس فتنے کو نہیں سمجھیں گے تو خالق سے بھی بدظن رہیں گے، اور مدعو سے بھی۔ اس طرح بحیثیتِ اخوان رسول ہم مطلوب دعوتی رول ادا نہیں کر پائیں گے۔

27۔ انصار اللہ ماڈل: قرآن میں کہا گیا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ

عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ (61:14)۔ یعنی، اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو۔ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا، کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

اس آیت میں رسول اللہ کی موجودگی میں ہی اہل ایمان کو انصار اللہ بننے کے لیے حواریوں کے ماڈل کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی توجیہ کیا ہوگی۔

مولانا اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: یہود کی اکثریت نے اگرچہ حضرت مسیح علیہ السلام کو رد کر دیا مگر ان میں سے کچھ لوگ (حواریین) ایسے تھے جنھوں نے پورے اخلاص اور وفاداری کے ساتھ آپ کا ساتھ دیا، اور آپ کے پیغمبرانہ مشن کو آگے بڑھایا (تذکیر القرآن)۔

حواریوں نے جو طریقہ کار اپنایا اس کو اپنانا ہوگا یعنی عمومی رجحان سے اوپر اٹھ کر خدا کے دین کی مدد کرنا۔ حکمت دعوت کے طور پیروانِ حضرت مسیح نے ساری دنیا میں دعوتی کلچر قائم کیا ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ہمیں بھی ان کے دعوتی طریقۂ کار کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے، ان کی شریعت یا ان کے عقیدہ کو نہیں۔ یہی حکمت دعوت کا تقاضا ہے۔ امتحان کے تقاضا کے تحت وہ حالات جو ملت مسیح پر پیش آئے، وہ امت مسلمہ پر بھی پیش آئیں گے۔ مگر وہ لوگ مشکل حالات میں بھی ایک دعوتی گروہ بن کر ہی رہے، ان کی پہچان ہی محبت، امن، دعوت، تعمیر، تعلیم ترقی بن گئی۔ یہی طریقہ ملت محمدی کو بھی اپنانا ہوگا۔

28۔ ناجنگ تدبیر، پیس فل پلاننگ: ہتھیار کے استعمال اور خون بہائے بغیر اپنا مطلوب حاصل کرنا اگر دیکھنا ہو تو سیرت رسول کو گہرائی سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا کی تحقیق کے مطابق دنیا کی جنگی تاریخ میں رسول اللہ ہی وہ واحد قائد ہیں جن کی جنگی تدبیر کی وجہ سے انسانوں کا سب سے کم خون بہا، رسول اللہ نے ہر جنگ کو معمولی جھڑپوں میں بدل دیا، واقعہ یہ ہے کہ ساری جنگوں کی مدت صرف 36 گھنٹے شمار کی جاتی ہے۔ یعنی 23 سال کی مشنری زندگی میں صرف ڈیڑھ دن کی مدت سے بھی کم میدان جنگ میں رہے۔ ناجنگ تدبیر کی واضح مثال صلح حدیبیہ ہے۔ رسول اللہ نے امن کی بحالی کے لیے ایک طرفہ طور پر اہل مکہ کے سارے شرائط قبول کیے۔ اگر کوئی کہے کہ صلح سے کیا ہوتا ہے تو اس کا جواب قرآن کی زبان میں فتح مبین ہے۔ اسی طرح پر امن تدبیر سے کیا ہوتا ہے تو اس کا جواب

ہندوستان کی آزادی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان والوں نے آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے تو ہرطرح کی ناکامی ملی، جب گاندھی جی کے کہنے پر ہندستانیوں نے ہتھیار پھینک دیے، اور پرامن تدبیر، یعنی غیر ہتھیاری تدبیر اختیار کی تو آزادی کا پرچم لہرا سکے، امت مسلمہ کو چاہیے کہ وہ پرامن تدبیر اختیار کریں تاکہ انسانوں کو جہنم سے آزادی ملے، انسانوں کے دلوں کو فتح کیا جا سکے۔ آج مادی تعمیر ہو یا معرفت کا سفر دونوں کے لیے پرامن منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

مولانا نے جب کبھی سیکولر حوالے دیے ہیں تو وہ پریکٹکل وزڈم کے طور پر ہوتے ہیں۔ اور حکمت کو اپنانے کے لیے اسلام میں کوئی تفریق نہیں ہے، چاہے وہ مذہبی انسان سے ملے یا سیکولر انسان سے۔ جیسا کہ حدیثِ رسول ہے: الحكمة ضالة المؤمن، حيثما وجد المؤمن ضالته فليجمعها إليه (مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 146)۔ یعنی حکمت مومن کا متاع گم شدہ ہے، مومن جہاں اپنی گم شدہ متاع کو پائے تو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھ لے۔

29۔ ذہنی ارتقاء: ذہنی ارتقاء کا لفظ مولانا کی کتابوں میں بہت زیادہ ملتا ہے۔ اس سے مراد سیکولر پرسنالٹی ڈیولپمنٹ نہیں، بلکہ انٹلکچول اور اسپریچول ڈیولپمنٹ ہے۔ مادی واقعات سے معنوی حقائق تک پہنچنا، زندگی کے حقائق سے واقف ہونا، قادر مطلق خدا کے مقابلے میں اپنی عاجزانہ پوزیشن کو دریافت کرنا، دنیا کے مقابلے میں آخرت کی زندگی کو ڈسکور کرنا، اعلی اخلاق پر قائم رہنا، وغیرہ۔ قرآن میں رسول اللہ کے اخلاق کے بارے کہا گیا کہ وہ بلند اخلاق پر فائز تھے: وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4)۔ یعنی، اور بیشک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو۔

اعلیٰ اخلاق کا حامل انسان وہی ہوتا ہے جو ذہنی ارتقاء کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔ خدا سے اعلیٰ تعلق اور بندوں سے اعلی سلوک یہی ذہنی ارتقاء ہے۔ بے خدا ذہنی ارتقاء مولانا کے یہاں نہیں ہے۔

30۔ دعوت: مولانا کی تحریروں میں ابتدا ہی سے دعوت الی اللہ کی بات کہی جا رہی ہے۔ دعوت کا مطلب خدا کے بندوں کو منصوبۂ تخلیق سے آگاہ کرنا ہے، خدا اور آخرت کا تعارف کرانا ہے مدعو کی قابلِ فہم زبان میں خدا کا پیغام پہنچانا ہے۔ ایسی تبلیغ جس سے مدعو کا ذہن اڈریس ہو۔ مولانا محترم دعوت اور کنورزن (conversion) میں فرق کرتے ہیں۔ دعوت کا مطلب ہے انٹلکچول ٹرانسفارمیشن۔ دعوت ہمارا اختیار ہے، ہدایت خدا کا ڈومین ہے (القصص، 28:56)۔ جو لوگ

کنورٹ کرنے کو دعوت سمجھتے ہیں، وہ نہ اسلامی دعوت سے واقف ہیں اور نہ ہی زمانے کے تقاضوں سے۔ دعوت کا مطلب اسلام کے کلمے کو ہر گھر میں داخل کرنا ہے، نہ کہ دعوت کے پیغام کو کسی کے اوپر امپوز (impose) کرنا۔

قرآن میں کئی مقامات پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر یہ الفاظ آئے ہیں: وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (36:17)۔ یعنی، اور ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ عَنْ تَمِيمٍ الدَّارِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَيَبْلُغَنَّ هَذَا الْأَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ، وَلَا يَتْرُكُ اللَّهُ بَيْتَ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللَّهُ هَذَا الدِّينَ (مسند احمد، حدیث نمبر 16957)۔ یعنی یہ دین اس جگہ تک پہنچے گا جہاں پر دن رات پہنچتے ہیں کوئی کچا پکا گھر ایسا باقی نہ رہے گا جہاں اللہ عزوجل اسلام کو نہ پہنچائے۔

مذکورہ آیت اور حدیث میں ابلاغِ عام اور ادخالِ عام کا ذکر ہے۔ مکمل سنسیر ٹی کے ساتھ تبلیغ ہماری ذمہ داری ہے، تبدیل کرنا خدا کی منشاء سے ہے۔ توحید کا یہ مشن تاریخی اعتبار سے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اپنی آخری تکمیل تک پہنچے گا:

حضرت آدم سے حضرت ابراہیم تک، حضرت ابراہیم سے حضرت مسیح تک، حضرت مسیح سے حضرت محمد تک، اور حضرت محمد سے وقوع قیامت تک۔

اس کے لیے خدا نے امن کا دور پیدا کیا ہے۔ اب ایسے افراد کی ضرورت ہے جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں۔ قیامت تک انسان حالت میں امتحان رہے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوجائے اور ساری دنیا تبدیل ہوجائے۔ انسان کو منصوبۂ تخلیق کے مطابق، انکار واختیار کا حق ان کے رب کی طرف سے ملا ہوا ہے۔ قیامت سے پہلے اختیار کا کلی طور پر خاتمہ ہوجائے ایسا مصلحت امتحان کے خلاف ہے: قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ یعنی، اور کہو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، پس جو شخص چاہے اسے مانے اور جو شخص چاہے نہ مانے۔

ابلیس نے قیامت تک مہلت مانگی تھی: قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (15:36)۔ یعنی اے میرے رب، تو مجھے اس دن تک کے لیے مہلت دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ اس آیت

کے مطابق، خدا نے ابلیس کو قیامت تک کے لیے چھوٹ دے کر بھیجا ہے۔ مگر اس سے مخلص بندے بچے رہیں گے، اور وہی آخرت میں کامیاب ہوں گے: إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (15:40)۔ یعنی سوائے ان کے جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں (سب کو میں گمراہ کروں گا)۔

اللہ تعالیٰ صاحب الرسالہ کی کوششوں کو قبول فرمائے، انھوں نے جو دورِ جدید میں دین کے تطبیق نو، یا اجتہاد کی کوشش کی ہے اس کو سمجھنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں منصوبۂ تخلیق کو جان کر اس کے مطابق زندگی گزارنے، اور صحیح رخ پر منصوبہ بندی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

اُمت مسلمہ کی ایک بڑی شخصیت، جنھوں نے کروڑوں انسانوں کو راہ ہدایت دکھائی اور زندگی میں مثبت سوچ کے ساتھ حق پر رہنے اور جینے کا انداز بتایا وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ (عاطف، سعودی عربیہ)

---

یہ مولانا کا اعجاز تھا کہ وہ فرد کی توجہ خارج سے ہٹا کر داخلی اصلاح پر لگا دیتے تھے۔ (حسن جمیل، اوکاڑا)

---

اللہ کریم کی عظمتوں سے صحیح معنوں میں روشناس کرانے والا اپنے اسی عظیم رب سے جا ملا۔ اللہ کریم ان کی عزت و رفعت والی خصوصی مہمان نوازی فرمائے آمین۔ (ضیاء الحق، لاہور، پاکستان)

# مغالطوں کا جائزہ

پروفیسر ابواریب، کرناٹک

انسان کی اصلاح کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے کیوں کہ خدا نے انسان کو با اختیار مخلوق کی حیثیت سے پیدا فرمایا ہے۔ اس بنا پر آدمی سرکشی اور اطاعت دونوں قسم کے رویوں کا اظہار کرتا ہے، اپنی شخصیت کو آخری حد تک چھپانے کی کوشش کرتا ہے خاص طور پر سچائی کے مقابلے میں ہر قسم کی غلط روش اختیار کرتا ہے۔ یہ سلسلہ نبیوں کے زمانے سے آج تک کے مصلحین کے ساتھ بھی جاری ہے، استہزاء، عیب نکالنا، الزام تراشی کرنا، شوشہ نکالنا وغیرہ۔ صاحب الرسالہ بھی وقت کے ایک مصلح انسان تھے ان کے معاصرین نے بھی وہ تمام حربے مولانا کے خلاف استعمال کیے جو ماضی کی تاریخ میں مصلحین کے ساتھ کیے گئے تھے۔ میں نے اس قسم کے بعض الزامات اور مغالطوں کا جائزہ لے کر ان کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ قارئین کو کوئی بات دعوت الی اللہ سے نہ پھیر سکے:

1۔ بَرنَامِجُنَا اِعدادُ المُبَرمِجِین: تحریکیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک خارج رخی تحریک اور دوسرے داخل رخی تحریک۔ اول الذکر تحریک کا نشانہ کسی خارجی ڈھانچے کو بدلنا ہوتا ہے۔ جیسے معاشرتی، معاشی یا سیاسی نظام کو بدل کر اس کی جگہ دوسرا نظام قائم کرنا، ثانی الذکر تحریک کا مقصد کسی خارجی ڈھانچے کی شکست وریخت نہیں ہوتا، بلکہ ایسی تحریک انسان کو اس کے داخل سے مکمل طور پر تبدیل کرنا چاہتی ہے جس کے سہارے تمام خارجی عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایسی تحریک فرد کو خارجی سطح پر متحرک کرنے کے بجائے اس کے باطن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہے، تاکہ اس سے زیادہ دوررس اور گہری نوعیت کی تبدیلی لائی جا سکے۔

الرسالہ تحریک بھی انسان کی داخلی شخصیت میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے اٹھی تھی۔ ظاہر ہے ایسی تحریک کو جو ایک زوال یافتہ قوم کے انسانی جمود کو توڑنے کے لیے اٹھی ہو، اسے انتہائی صبر کے ساتھ ایک طویل مدت تک تزکیہ وتربیت کے ذریعہ افراد سازی میں لگے رہنا ضروری تھا۔ اسی لیے الرسالہ کے اجراء سے لے کر قیام سی پی ایس انٹرنیشنل تک یعنی 1976ء سے 2001ء تک کا زمانہ، افکارِ

الرسالہ کا گویا دورِ تیاری (preparatory period) تھا۔ اس زمانے میں مولانا کے کام کا طریقہ یہ رہا کہ الرسالہ اور دیگر شائع شدہ کتب کو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلایا جائے تاکہ اس ذہن سازی کے ذریعہ مطلوبہ افرادِ کار کی ایک ایسی ٹیم وجود میں آجائے جو اپنی ذات میں پروگرام ساز ہوں۔

اسی لیے مولانا نے ایک عرصہ تک، نہ کوئی تنظیمی ڈھانچہ بنایا، اور نہ ہی کوئی خارجی پروگرام دیا۔ اس روایتی طریقہ کو ترک کرنے کی اور بھی کئی اہم وجوہات تھیں۔ چونکہ یہی چیز آگے چل کر بہت جلد ایک نئی جماعت اور ایک نئے فرقے کے وجود میں آنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اور پھر ایک زوال یافتہ قوم سے کسی تعمیری کام کی توقع نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اس کی اچھی طرح تربیت نہ کی جائے۔ ورنہ ایسے افراد کسی تنظیم کی تنزّل و بربادی میں اضافے کا سبب تو ضرور بن سکتے ہیں، نہ کہ اس کی تعمیر و ترقی میں اضافے کا ذریعہ۔

مولانا کا یہ انداز روایتی ذہن اور سطحی سوچ رکھنے والوں کی سمجھ میں نہ آسکا۔ چنانچہ اس بات کو عوام وخواص میں اس طرح مشہور کیا گیا کہ، مولانا کے پاس الرسالہ اور لٹریچر کے سوا کوئی عملی پروگرام نہیں ہے۔ یعنی ان لوگوں کے نزدیک غیر تربیت یافتہ افراد کو لے کر عملی پروگرام کے نام پر خارجی ہنگامہ کھڑا کرنا گویا کام تھا، اور لٹریچر کے ذریعہ خاموشی سے تزکیہ وتربیت اور تعمیر و اصلاحِ فرد میں ایک وقت تک لگے رہنا کوئی کام ہی نہیں تھا۔

اس بات کو ہر طرف پھیلا دیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان سے لے کر عرب مما لک تک ہر جگہ مولانا سے ایک سوال ضرور کیا گیا۔ وہ یہ کہ، ''آپ کا پروگرام کیا ہے''۔ اس کے جواب میں مولانا نے وہ جملہ کہا جو بہت مشہور ہوا:

برنامجنا اعداد المبرمجين

یعنی ہمارا پروگرام ہے پروگرام ساز افراد کو تیار کرنا۔ وقت کے روایتی ڈھانچے میں کھڑے ہو کر دیکھنے والوں کو یہ جواب سمجھ میں نہیں آسکتا تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تاہم اس سے قطع نظر جو اعتراض کیا گیا اس جملے پر ایک اور رخ سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جملے کو دوبارہ دیکھیے:

''مولانا کے پاس صرف الرسالہ اور لٹریچر ہے کوئی عملی پروگرام نہیں ہے''۔

اس جملے میں بہت بڑا بالواسطہ اعتراف موجود ہے، گویا وہ یہ اقرار کر رہے ہیں کہ فکرِ الرسالہ میں

تو کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو قابل گرفت ہو، یا جس کو عقلی یا نقلی دلائل سے غلط ثابت کیا جا سکے۔ قابلِ اعتراض بات بس یہ ہے کوئی عملی پروگرام مولانا کے پاس ہمیں نظر نہیں آتا۔ یہ جملہ کہہ کر گویا وہ الرسالہ کی صحت فکر کا اعتراف کر رہے ہیں۔ یہ جملۂ اعتراف ہے، نہ کہ جملۂ اعتراض۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کچھ نادان لوگوں نے اس کو اعتراض سمجھ کر پھیلایا۔

2۔ القرآن مشن: دوسرا مغالطہ بعض احباب کو اس وقت پیش آیا جب القرآن مشن کا آغاز ہوا، قرآن کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے فوری بعد۔ 2010ء میں القرآن مشن کی شروعات ہوئی۔ اس کا خاص مقصد حدیث رسول میں کی گئی ادخال کلمہ کی پیشن گوئی کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ چنانچہ مولانا نے اپنی ساری توانائی اور توجہ کے ساتھ پوری CPS ٹیم کو اس کام پر لگایا۔ اس کے لیے ہندستان کے مختلف شہروں میں کئی دعوہ میٹ منعقد ہوئے، جیسے دہلی، حیدرآباد، بنگلور اور ممبئی وغیرہ۔ ان دعوہ میٹس کا خاص مقصد دعوت الی اللہ کی اہمیت اور ٹیم اسپرٹ کو سی پی ایس ممبران میں پیدا کرنا تھا تاکہ قرآن کو تمام انسانوں تک پہنچانے کے لیے سب متحرک ہوجائیں۔

اس پر کچھ لوگوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مولانا نے اسلامی مرکز کے تاسیسی مقصد، یعنی علمی و تحقیقی کام سے، ہٹا کر ساری ٹیم کو بس قرآن کی تقسیم (Quran distribution) پر لگا دیا۔

جن افراد کو یہ اشکال پیش آیا انھوں نے میرے سامنے جب ذکر کیا تو ذہن کے حافظے میں یہ بات رہ گئی اور ذہن مسلسل اس پر سوچنے لگا۔ علمی و تحقیقی کام پر مولانا نے کہاں لکھا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے یاد آیا کہ مولانا نے اپنی کتاب تجدید دین کے باب ”علوم اسلامی کی تدوین“ کے تحت اس سلسلے میں کچھ لکھا ہے۔ فوراً تجدید دین کا متعلقہ باب دوبارہ پڑھا اور جب فہرست تدوین علوم اسلامی کو بغور دیکھا تو حیرت و اطمینان کی کیفیات سے دوچار ہوا۔ اطمینان اس بات کا کہ مجھے اس اشکال کا جواب مل چکا تھا، اور حیرت کی پہلی وجہ یہ تھی کہ بارہا اس فہرست کو میں نے دیکھا ہے، مگر پہلا نکتہ ہی یاد نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ سنہ 1983ء میں پہلی بار تجدید دین شائع ہوئی تھی، جب کہ CPS اور القرآن مشن کا کوئی وجود بھی نہ تھا۔ گویا اس وقت مولانا نے جس علمی و عملی کام کا نقشہ بنایا تھا۔ ٹھیک اسی پروگرام کے تحت مولانا کام کر رہے تھے۔ اس فہرست کے مطابق سب سے پہلے جو کام کرنا ہے وہ درج ذیل ہے:

غیر عربی دانوں کے لیے قرآن پاک کے تراجم (بغیر تفسیر) شائع کرنا، مختلف زبانوں میں۔

اسی وقت مولانا نے یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ پہلا کام تراجم قرآن کی اشاعت کا کا کام ہے۔ ڈسٹری بیوشن (distribution) کا عمل بھی اشاعت ہی کا کام ہے۔ظاہر ہے یہ اشاعت دعوتی تقاضوں کو پورا کرنے ہی کے لیے مطلوب تھی ۔جب ترجمہ اور اشاعت کا کام ہو چکا تو اس کو خدا کے بندوں تک پہنچانا ہی سب سے اولین تقاضا ہوگا۔اور پھر اس کام کی نوعیت بھی ذہن میں رہے کہ دنیا کے تقریباً 6 بلین انسانوں تک قرآن کو ان کی قابلِ فہم زبان میں پہنچانا ہے۔گویا کام تو عین اپنے پروگرام اور مقصد کے تحت ہی ہو رہا ہے، نہ کہ مقصد سے ہٹ کر کیا جا رہا ہے۔اور پھر قرآن ڈسٹری بیوشن کو دعوتی کام نہ سمجھنا دعوت الی اللہ کی تصغیر ہے۔

3۔مسیح کی آمد ثانی اور مولانا کا موقف: تیسرا مغالطہ لوگوں کو اس وقت ہوا جب مولانا نے مسیحؑ کی آمد ثانی کی احادیث کی قابل فہم تاویل کرنے کی کوشش کی۔اس مسئلہ کو لے کر مسلمانوں میں بہت سی بے اصل باتیں مشہور ہو چکی ہیں۔ جیسے دوبارہ آسمان سے ایک خاص شہر اور ایک خاص جگہ پر مسیحؑ کا جسمانی نزول ہوگا، وہ دجال کو قتل کریں گے وغیرہ وغیرہ۔حالانکہ قدیم وجدید دور کے ممتاز اہل علم نے مسیح کے جسمانی نزول کا انکار کیا ہے۔ جیسے جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہُ، سید رشید رضا، مولانا عبید اللہ سندھی، ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، جاوید احمد غامدی وغیرہ۔اس سلسلے میں مولانا نے جو لکھا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

”مصر کے مشہور عالم محمد بن احمد ابوزہرہ نے نزول مسیح کی تمام روایات کو اخبار آحاد کہا ہے اور وہ متواتر نہیں ہیں اور پہلی تین صدیوں کے بعد عوام میں مشہور ہوئی ہیں“ (الرسالہ جولائی 2008 صفحہ 8)

اس طرح کے معاملات میں جب کوئی تاویل سجھائی نہ دے رہی ہو تو اہل علم کو دوطرفہ مشکل پیش آتی ہے، ان اخبار آحاد کو مان کر ایک ایسی بات کو تسلیم کیا جائے جو نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ عقل اسے قبول کرسکتی ہے، یا ان احادیث کا انکار کیا جائے۔اس کشمکش سے ہر صاحب علم کو سابقہ پڑتا ہے۔ اس کشمکش سے نکلنے کی جستجو اور ایسی تاویل کی تلاش ہمیشہ مطلوب ہوتی ہے جو عقل اور قلب دونوں کے لیے اطمینان بخش ہو۔جن اخبارِ آحاد میں مسیح کی آمد ثانی کا ذکر ہوا ہے ان کی بہترین تاویل کرنے کی مولانا نے دو طرح سے کوشش کی ہے، ایک وہ جو کتابچہ قیامت کا الارم میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ایک اعتبار سے، ظاہر ہونے والا شخص، امت محمدی کا ایک فرد ہوگا، اس اعتبار سے اس کو رجل مؤمن کہا گیا۔ دوسرے اعتبار سے وہ گم راہی کے عمومی اندھیرے میں ہدایت کی روشنی کو مکمل طور پر دریافت کرے گا، اس اعتبار سے اس کو مہدی کہا گیا ہے، یعنی ہدایت پایا ہوا شخص۔ ایک اور اعتبار سے وہ شخص امت محمدی کے آخری زمانے میں وہی رول ادا کرے گا، جو امت یہود کے آخری زمانے میں حضرت مسیح نے انجام دیا تھا۔ گویا کہ یہ تینوں الفاظ ایک ہی شخصیت کے تین پہلوؤں کو بتاتے ہیں، نہ کہ الگ الگ تین مختلف شخصیتوں کو'' (قیامت کاالارم صفحہ، 45)

دوسری تاویل وہ ہے جو مضمون ''مسیحی ماڈل کی آمد ثانی'' میں لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر آخرالزماں کا زمانہ نبوت قیامت تک ہے، اس لیے اب آپ کے بعد کسی اور پیغمبر کا شخصی طور پر آنا نا قابل فہم بات ہے۔ اس لیے ان روایات کو درست مانتے ہوئے ان کی صحیح تاویل یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں جو چیز واقع ہوگی، وہ مسیح کی آمد ثانی نہیں ہے، بلکہ مسیحؑ کے ماڈل کی آمد ثانی ہے۔ یعنی بعد کے زمانے میں حالات کے اندر ایسی تبدیلیاں واقع ہوں گی کہ حالات کے اعتبار سے حضرت مسیح کا عملی ماڈل زیادہ قابل انطباق (applicable) بن جائے گا۔ (الرسالہ جون، 2008 صفحہ 5)

حیدرآباد دعوہ میٹ میں اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک نشست میں مولانا نے فرمایا کہ دراصل محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح پیغمبرِ امن ہیں جس طرح پیغمبر مسیح کو سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے یہاں بھی پرامن ماڈل پوری طرح موجود ہے، مگر بعد کے ادوار میں امت محمدی جہادی ماڈل (بہ معنی قتال) سے اس قدر کنڈیشنڈ ہوجائے گی کہ وہ آپ کے پرامن ماڈل کو دریافت کرنے سے عمومی طور پر قاصر رہے گی، غالباً اس دور میں جو چیز واقع ہوگی وہ یہ کہ پرامن طریقہ کار ہی قابل عمل ہوگا، اسی بات کو حدیث میں تمثیل کی زبان میں مسیح کی آمد ثانی کہا گیا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مسیح کی آمد ثانی کا عقیدہ، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اخبار آحاد اور اسلامی لٹریچر میں پہلے سے موجود ہے۔ اور اس مسئلہ کی مولانا نے جو قابل فہم تاویل پیش کی ہے، اس تاویل کو ماننا لازمی نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں آپ کے اور ہمارے لیے اب جو انتخاب ہے وہ یہ ہے کہ ہم حضرت مسیح کا آسمان سے جسمانی نزول ثانی مانیں، یا ان اخبارِ آحاد کا انکار کریں۔ تیسرے یہ کہ مولانا

کی پیش کردہ قابل فہم تاویل کو مانیں۔ اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم اس معاملے میں اپنے آپ کو کس گروہ کے ساتھ بریکٹ کرنا پسند کرتے ہیں۔

4۔ آر ایس ایس، بی جے پی اور مولانا: چوتھا مغالطہ یہ ہوا کہ مولانا بی جے پی اور آر ایس ایس سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ غلط فہمی لوگوں کو محض ان کے غیر داعیانہ مزاج کی وجہ سے ہوئی۔ اگر مسلمانوں میں داعیانہ مزاج ہوتا تو ان کے اندر انسانوں سے خیر خواہی کا مزاج ہوتا، وہ مدعو سے ملاقات کو غنیمت سمجھتے، مدعو کی تالیف قلب کرتے ہوئے دین کا پیغام ان تک پہنچانے کے مواقع تلاش کرتے۔

مولانا کے اندر خالص داعیانہ مزاج تھا، جہاں بھی مدعو کے سامنے اپنی بات پیش کرنے کا موقع ملتا وہاں پہنچ جاتے تھے۔ جیسا کہ مولانا نے وضاحت کی ہے۔

ہندستان میں غیر مسلم دو طرح کے ہیں۔ ایک، نو پرابلم (سیکولر) طبقہ اور دوسرا، پرابلم طبقہ۔ مسلمان یہ کرتے ہیں کہ نو پرابلم طبقے کے لوگوں سے مل کر جلسے اور پروگرام کرتے ہیں تاکہ ان کی تائید حاصل کرسکیں، اس سے ہمارا مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ مولانا نے انتہائی حکمت سے پرابلم گروہ میں کام کیا اور ان کے ذہن سے بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ (ملاحظہ ہو اوراقِ حیات، صفحہ 825-824)

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ محمد علی جناح کی قیادت میں تقسیم کی تحریک چلا کر مسلمانان ہند نے ہندستان میں رہنے کا اخلاقی جواز کھو دیا ہوتا، اگر دو مسلم رہنما موجود نہ ہوتے۔ ایک، مولانا ابولکلام آزاد اور دوسرے، مولانا حسین احمد مدنی (بشمول جمعیۃ العلماء ہند)۔ دونوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے ہمیں سر اٹھا کر ہندوستان میں رہنے کا اخلاقی جواز فراہم کیا۔ دونوں نے مذہبی بنیاد پر تقسیم ہند اور دو قومی نظریہ کی پرزور مخالفت کی، قومی یکجہتی اور ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور اپنا حصہ ادا کیا، مگر بدقسمتی سے آزادی کے بعد جتنے بھی مسلمانوں کے لیڈر و رہنما پیدا ہوئے، سید شہاب الدین سے لے کر موجودہ رہنماؤں تک، سب مسٹر جناح کا تسلسل ثابت ہوئے ہیں، سوائے دو کے۔ ایک، مولانا وحید الدین خاں اور دوسرے، سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبد الکلام۔ جدید ہندستان میں ملک اور قوم و ملت کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کی خدمات و تعاون (credibility and contribution) کسی بھی درجہ میں مولانا آزاد اور مولانا مدنی کی خدمات سے کم نہیں ہیں۔ دونوں نے برادران وطن کی

نظروں میں مسلمانانِ ہند کے وقار کو بلند اور وفاداری کو غیر مشکوک بنایا۔

5۔ کشمیر و فلسطین اور مولانا کا موقف: کشمیر کا مسئلہ بھی غیر داعیانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ مولانا اس مسئلے کو ایک داعی کی طرح دیکھتے تھے۔ مولانا جس کشمیر کا تصور کرتے تھے اس کا خاکہ شاید کچھ اس طرح کا تھا:

''کشمیر کو خدا نے بے پناہ سیاحتی کشش رکھنے والا خوبصورت قدرتی مناظر کا مرکز اور مخصوص پلاننگ کے تحت ایک مسلم اکثریتی علاقہ بنایا تاکہ دنیا بھر سے سیاح وہاں آئیں اور کشمیر ایک بہت بڑا عالمی دعوتی مرکز بن جائے۔ کشمیری اس منصوبۂ خداوندی کو سمجھتے اور مکمل طور پر پر امن دعوتی کام میں اپنے آپ کو لگاتے ہوئے ہر سیاح کو قرآن پہنچاتے رہتے تو نہ صرف یہ کہ بہت بڑا دعوتی کام ہوتا بلکہ اس طرح وہ دنیا و آخرت دونوں میں خدا کی خصوصی مدد و نصرت کے مستحق بھی بن جاتے۔

مگر افسوس کشمیر کے کچھ لیڈروں نے مولانا کی پر امن دعوتی آئڈیالوجی کے بجائے پر تشدد سیاسی آئڈیالوجی کو اختیار کیا، جس کی وجہ سے یہ امکان واقعہ نہ بن سکا۔ اور اس کے برعکس، روز بہ روز کشمیر اور کشمیریوں کی تباہی و بربادی میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

فلسطین کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ فلسطین بھی اپنی قدیم مذہبی تاریخی آثار کی وجہ سے عالمی سیاحوں کا مرکز ہے۔ اسی لیے فلسطین میں دعوت کا عالمی مرکز بننے کا پورا امکان موجود ہے، مگر افسوس فلسطین اور کشمیر دونوں کی کہانی ایک جیسی ہے۔

ان نامساعد حالات کے باوجود خدا کا فضل ہے کہ دونوں جگہ اب CPS کی ایک مضبوط ٹیم وجود میں آچکی ہے اور خاموشی سے اپنا کام کررہی ہے۔

(6) بابری مسجد اور مولانا کا موقف: دوسرے معاملات کی طرح بابری مسجد کے مسئلے میں بھی مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقے نے مولانا پر بڑی زیادتی کی ہے۔ مولانا کے موقف کو پڑھے اور سمجھے بغیر بات کو کچھ سے کچھ بنادیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا so called دانشور طبقہ کیا اتنا کم فہم ہے کہ وہ کسی بات کو سمجھنے کی اپنے اندر سرے سے کوئی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ کسی نے کہا بابری مسجد مولانا نے ہندوؤں کو دے دی، کسی نے کہا مولانا نے مسلمانوں کو مسجد سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیا، وغیرہ وغیرہ۔

بابری مسجد کے معاملے میں مولانا نے جو رائے دی اس کی درجہ ذیل ترتیب ہے۔ اس زمانی ترتیب (chronology) کو سمجھے بغیر مولانا کا موقف واضح نہیں ہوسکتا۔ اس کی وضاحتی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

1۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو کم سے کم جو کرنا تھا وہ یہ تھا کہ یکم فروری 1986 کے بعد بھی وہ اسی طریقہ پر قائم رہتے جس پر وہ اس سے پہلے قائم تھے یا دوسری سیکڑوں مسجدوں کے بارے میں آج بھی جس طریقہ کو وہ عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یعنی مذکورہ غلط فیصلہ کو قانون اور گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرنا۔ (قیادت نامہ، صفحہ 79)

مولانا کا پہلا مشورہ یہ تھا۔ مگر ہمارے لیڈروں اور اخبارات نے اس کے بالکل برعکس جو کچھ کیا، وہ یہ تھا: بند، گرفتاری، دھرنا، ریلی، جلسوں اور تقریروں کے ہنگامے شروع کردیے۔ اور ہمارے اخبارات نے اس موضوع پر تیز وتند سرخیاں قائم کرکے مسلسل دھواں دھار مضامین شائع کیے۔ اس طرح اس مسئلے کو مقامی سطح سے اٹھا کر بین الاقوامی مسئلہ بنا کر پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید ترین تناؤ کا ماحول بنا دیا۔

2۔ دوسرے مرحلے میں جب حکومت اور عدالت دونوں کوئی پائیدار فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے، اس وقت ایک میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی کہ تاریخ دانوں کے ایک بورڈ کو ثالث بنا کر معاملہ اس کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ تاریخی آثار کی روشنی میں جانچ کر بتائے کہ مسجد کسی دوسری عمارت کو توڑ کر تو نہیں بنائی گئی ہے۔ ہندو فریق کے نمائندوں نے اس بات کو تسلیم کرلیا مگر مسلم فریق کے ایک لیڈر نے ہنگامہ کرکے اس کو ماننے سے انکار کیا۔ (ملاحظہ ہو مضمون، قیادت کا دیوالیہ پن، الرسالہ جولائی 1988)

اس مسئلہ پر جلسہ، جلوس، نعرے بازی وبیان بازی کرکے نفرتوں کو اتنی ہوا دی گئی کہ فرقہ پرستی کا سویا ہوا فتنہ جاگ اٹھا۔ تمام فرقہ پرست عناصر متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے، جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ اگلے الیکشن میں بی جے پی کی نشستیں 2 سے 89 ہوئیں اور پھر 89 سے بڑھ کر 180 ہوگئیں (اب 300 تک پہنچ چکی ہیں)۔ بالآخر اس سیاست کا انجام یہ ہوا کہ بابری مسجد 6 دسمبر 1992ء کو گرادی گئی اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر بھی پولیس اور فوج کی موجودگی میں بنا دیا گیا۔

3۔ تیسرا مرحلہ۔ مسجد شہید ہوچکی ہے، پورے ملک میں کشیدگی کا ماحول ہے۔ گویا ایک آتش فشاں ہے جو اگر پھٹ جائے تو سب کچھ جل کر خاک ہو جائے گا۔ حالات کی نزاکت اور سنگینی کا بروقت مولانا نے ٹھیک اندازہ لگایا، حالات جس رخ پر جا رہے تھے اور اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کو سمجھنے کے لیے درجہ ذیل سطور ملاحظہ ہوں:

''6 دسمبر سے پہلے ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بابری مسجد کو کس طرح بچائیں۔ 6 دسمبر کے بعد اب مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح بچایا جائے اور اجودھیا جیسے واقعہ کو کسی اور مقام پر دہرانے کو کس طرح روکا جائے، شریعت کی روشنی میں پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد اس کے حل کے لیے میں نے تین نکاتی فارمولا پیش کیا ہے جو کہ اس طرح ہے:

مسلمان بابری مسجد کے بارے میں اپنے ایجی ٹیشن کو ختم کر دیں، ہندو اپنی مندر مسجد تحریک کو اجودھیا ہی میں ہمیشہ کے لیے اسٹاپ کر دیں۔ گورنمنٹ عبادت گاہوں کے تحفظ کے ایکٹ (۱۹۹۱) کو دستور ہند کا جز بنا دے''۔ (الرسالہ، مئی 1993، صفحہ 4)

اس فارمولے کو غور سے دیکھیے، اس کے بین السطور کو سمجھیے۔ کتنا معقول فارمولا مولانا نے دیا تھا۔ اس فارمولے کے تحت مولانا مسلمانوں کو مسجد کے ایجی ٹیشن کو ختم کرنے یا بالفاظ دیگر مسجد سے دستبردار ہونے کا مشورہ کب دے رہے ہیں۔ غور کیجیے، یہ مشورہ کب دیا جا رہا ہے۔ یہ مشورہ اس وقت دیا جا رہا ہے جب کہ مسجد کا وجود ختم کر دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو مسجد کی عمارت سے دستبردار کیا جا چکا ہے، تمام مسلم رہنما صرف تماشہ دیکھتے رہنے کے علاوہ کچھ نہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اب دوبارہ مسجد وہاں بننے کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اب وہاں جو کچھ ہے وہ مسجد نہیں مسجد کا ملبہ پڑا ہوا ہے، اگر آپ دانشمند ہیں تو اب آپ اس ملبہ سے (نہ کہ مسجد سے) صرف اعلانِ دستبرداری کر کے (آپ کی عملی دستبرداری تو ہو چکی ہے، یعنی جو چیز آپ کھو چکے ہیں اس سے اعلانِ دستبرداری کر کے) 15 کروڑ مسلمانوں اور ہماری اگلی نسلوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے، اگلے دو نکات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ تھا مولانا کا اصل مشورہ (بین السطور کو اپنی دانست میں میں نے کھولنے کی کوشش کی ہے)۔

اور اگر آپ اس ملبے سے دستبرداری کے لیے تیار نہیں تو کیا ہوگا، مولانا کی اس پیشین گوئی کو بھی سن لیجیے۔ مولانا کے الفاظ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، ملاحظہ ہو:

”6 دسمبر کے حادثہ کے بعد اس معاملہ میں نوعی اور بنیادی تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اب مسئلہ بابری مسجد کے تحفظ کا نہیں ہے۔ اب اصل مسئلہ خود مسلمانان ہند کے تحفظ کا ہے۔ اب اگر مسلمان اپنی اس احتجاجی تحریک کو مزید جاری رکھیں جس طرح اس ایشو پر وہ 6 دسمبر سے پہلے چلا رہے تھے تو یقینی طور پر اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلے گا کہ مذکورہ مقام پر دوبارہ بابری مسجد بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس ،عملاً جو نتیجہ نکلے گا وہ یہ ہوگا کہ مسلمان پورے ملک میں فسادات کی زد میں آجائیں گے۔ وہ بے شمار ایسی مشکلوں میں گھر جائیں گے کہ اس ملک میں عزت کے ساتھ رہنا ہی ان کے لیے دشوار ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ 6 دسمبر کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس معاملے میں اب مسلمانوں کے لیے جو انتخاب ہے وہ بابری مسجد بنانے یا بابری مسجد نہ بنانے کے درمیان نہیں ہے، بلکہ بابری مسجد اور ملت کی تباہی کے درمیان ہے۔ یعنی مسلمان اگر دوبارہ اسی مقام پر بابری مسجد تعمیر کرنے کی مہم چلائیں تو اس کے نتیجہ میں یہ نہیں ہونے والا ہے کہ بابری مسجد اپنے اصل مقام پر بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس، جو ہوگا وہ یہ کہ انڈیا کے مسلمان ناقابلِ بیان تباہی میں پھنس کر رہ جائیں“۔ (الرسالہ، مئی 1993، صفحہ 7-6)

بین القوسین کی عبارت پر غور کیجیے۔ آج لفظ بہ لفظ یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے، مسجد اب دوبارہ وہاں نہیں بن سکے گی۔ 1993ء میں ہی ایک صاحب بصیرت انسان کو یہ سمجھ میں آچکا تھا، مگر ہمارے دانشورانِ ملت کو اس وقت کیا سمجھ میں آتا، نہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد سمجھ میں آیا، اور نہ 9 نومبر 2019 کے سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد۔ آج صورت حال یہ ہے کہ CAA اور NRC جیسے قوانین کا مسئلہ درپیش ہے۔ کئی والدین اس خدشے سے پریشان ہیں کہ ہماری اگلی نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا، ہمارے رہنماؤں نے اپنی نااہلی سے ایک بھیانک تاریکی میں پوری قوم کو دھکیلا ہے۔

اب اس پر کچھ احباب کو یہ شکایت ہے کہ CAA اور NRC پر مولانا نے کوئی رہنمائی نہیں کی۔ حالاں کہ رہنمائی تو ان لوگوں سے طلب کرنی چاہیے، جو مولانا کے پیشگی تنبیہ کے باوجود، ان حالات کو پیدا کرنے کے براہ راست ذمہ دار ہیں، اور برابر ملت کو اسی راستے پر ہانکے جا رہے ہیں۔

اب واحد خدائے عالم الغیب کی ذات ہی سے امید ہے کہ وہ اگلی نسل کو ہماری کوتاہیوں اور ہمارے رہنماؤں کی نادانیوں کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات سے نکلنے کے اسباب بھی فراہم کرے گا۔

# مولانا کی تحریریں میری نظر میں

محمد ندیم ندوی، مظفر نگر

مولانا کے متعلق پہلا تعارف لکھنؤ میں دوران تعلیم ہوا، یہ تعارف منفی تھا۔ دوسرا تعارف اس وقت ہوا جب میں نے ندوہ کی لائبریری میں پیغمبر انقلاب کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب نے میرے زاویۂ فکر کو تبدیل کر دیا۔ یعنی یہ معاملہ قدیم اسلوب تحریر اور عصری اسلوب تحریر کا ہے، منفی ہونے کا معاملہ نہیں ہے۔ پھر میں نے مولانا کی کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ مولانا کی کتابوں کے متعلق تاثرات کو میں چند نکات کی روشنی میں رکھوں گا:

1۔ علمی تنقید زندہ قوم کی علامت اور اس کی بقاء کا ذریعہ ہے اور تعمیر ملت کا لازمی جزء ہے۔ یہ چیز آپ کو مولانا کی تحریروں میں جا بجا نظر آئے گی، خصوصا ''شتم رسول کا مسئلہ'' نامی کتاب میں علمی تنقید کا اعلی نمونہ موجود ہے۔

2۔ مولانا نے ثابت کیا کہ کیسے ہم موجودہ مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کر سکتے ہیں۔ جب کہ دیگر علماء پچھلی صدیوں ہی میں گم نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا کی کتاب مسائل اجتہاد بہت اچھی کتاب ہے۔

3۔ مولانا کی تحریروں سے انسان کے اندر تعمیری صلاحیت اور عملی جذبہ پیدا ہوتا ہے جو تعمیر انسانیت کے لیے ناگزیر ہے۔ جیسے رازِ حیات، تعمیر حیات اور ''نشری تقریریں'' کے بعض خطبات۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا مولانا ایک موٹیویشنل آرٹ کی صلاحیت رکھتے تھے۔

4۔ ہندوستان کے مسائل پر مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے، اور ہر محب وطن کے لیے اس کا مطالعہ لازمی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کی ''ہند پاک ڈائری'' اور ''ہندوستانی مسلمان'' بہت عمدہ کتابیں ہیں۔

5۔ مولانا کی تحریریں معرفت الٰہی کا ذریعہ بنتی ہیں، اور بندے کا رب سے تعلق مضبوط کرتی ہیں۔ یہ چیز مولانا کی ''کتابِ معرفت'' اور ''اللہ اکبر'' میں نمایاں ہے۔

6۔مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ خارجی سیاست سے پہلے داخلی سیاست (اصلاح) لازمی ہے، جو مشکل امر ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ گزشتہ صدی میں اسلام کے نام پر جتنی تحریکیں وجود میں آئیں ان کا تعلق خارجی سیاست سے تھا۔ انہوں نے اصلاح بین المسلمین کی کوشش نہیں کی، اس سے صرف تبلیغی جماعت کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کی کتاب قیادت نامہ، تصویر ملت ایک نشان راہ کا کام کرتی ہے۔

7۔مولانا کی تحریروں کا مرکزی نقطہ جس کے لیے مولانا نے ساری زندگی وقف کی تھی، وہ یہ تھا کہ امت کو اس کا فرض منصبی یاد دلایا جائے، تاکہ مسلمان اللہ کی امانت لوگوں تک پہنچائیں۔ لوگوں کو اللہ کا تعارف کرائیں جس کے متعلق یہ امت مجرمانہ غفلت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس موضوع پر مولانا نے بہت کام کیا جن میں سے چند کتابیں یہ ہیں: دور دعوت، اسلامی دعوت، دعوت اسلام، حل یہاں ہے، وغیرہ۔

---

مولانا وحیدالدین خان اس صدی کے نابغہ تھے۔فکری وضوح، سلاستِ تحریر، مشاہداتی انداز، تاریخی تناظر، تجدیدی وتنقیدی، سائنسی وعصری، مثبت وتعمیری اندازِ تفکر ان کے وہ اوصاف ہیں جو انہیں عہدِ حاضر کے کسی بھی مسلم مفکر سے ممتاز کرتے رہیں گے۔ وہ اپنا کام کر گئے۔ اللہ پاک ان سے راضی ہو۔ اللہ کرے کہ ہمیں اپنے حصے کا کام کرنے کی توفیق نصیب ہو۔ آمین یارب العلمین۔ (اختر ضیاء، گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

# مولانا وحید الدین خان اور علماء کا اعتراض

مولانا انس ملک ندوی، سورت گجرات

مولانا وحید الدین صاحب اب اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ جہاں ایک طرف سنجیدہ لوگ ڈھیرے ڈھیرے ان کی خدمات کا اعتراف کرنے لگے ہیں تو وہیں پر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں، اور عوام کے مابین اپنی شہرت اور مقبولیت کے سبب لوگوں کو مولانا کے فکر سے بدظن کرتے ہیں۔ ان کی حیات میں یہی علماء ان کی کردار کشی کے درپے تھے اور آج ان کے اس دارفانی سے جانے کے بعد بھی ان کے خلاف جھوٹ اور بہتان باندھنے سے باز نہیں آتے دکھائی دیتے، اور یہ سب وہ دین کے نام پر کرتے ہیں۔

بلاشبہ یہ بہت ہی بڑا اور بہت ہی سنگین جرم ہے۔ کاش کہ یہ لوگ آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھتے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حسد جیسی برائی علماء کی ایک موروثی برائی ہے۔ علماء سے میری مراد علمائے سوء ہیں۔ ہمیشہ سے یہ چلا آرہا ہے کہ ہر مصلحین کے ساتھ وقت کے دینی طبقہ کے پیشواؤں نے یہی سلوک کیا ہے۔ کسی سے اگر آپ کو علمی بنیاد پر اختلاف ہوا ہے تو اس کو اختلاف ہی تک محدود رکھنا چاہیے اسے نزاع اور کردار کشی تک نہیں جانے دینا چاہیے۔ بلاشبہ یہ سنگین جرم ہے۔

اب ہم جائزہ لیں گے کہ آخر ہمارے علماء کے اعتراضات کیا ہیں۔ کیا واقعی ان میں کوئی سچائی بھی ہے یا نہیں؟ مولانا وحید الدین خان پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں:

1۔ مولانا وحید الدین خاں اجماع سے ہٹے ہوئے ہیں۔

2۔ مولانا وحید الدین ایک متنازع شخصیت ہیں۔ وہ ہمارے اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔

3۔ مولانا وحید الدین اہلحدیث ہیں، تین طلاق کے حق میں نہیں ہیں۔

4۔ وہ غیر مسلموں کے پروگرام میں شرکت کرتے ہیں۔

5۔ مولانا جہاد بالسیف کے قائل نہیں۔

6۔ مولانا تبلیغی جماعت کی مخالفت کرتے ہیں۔

7۔ بابری مسجد کے بارے میں مولانا کا موقف دوسرے علماء سے الگ کیوں ہے؟

8۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مولانا نے کہا ہے کہ وہ اسوہ حسنہ ہیں، اسوہ کاملہ نہیں۔

9۔ مولانا شاتم رسول کی سزا کے قائل نہیں ہیں۔

10۔آمد مسیح اور دجال کو ایک الگ زاوئے سے دیکھتے ہیں۔

سب سے پہلے جو چیز سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ مولانا وحید الدین خان دین اسلام کے ایک سچے داعی ہیں اور حقیقی معنی میں اسلام کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ایک عالم دین۔تبھی آپ مولانا کی فکر کو ان کے مشن کو سمجھ سکتے ہیں۔ ورنہ آپ انہیں اگر دوسرے علماء کی طرح سمجھیں گے تو ان کی باتوں کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یادرکھیے کہ گائے کی غذا گھاس ہے اور شیر کی غذا گوشت۔اسی طرح ہر آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ مولانا کو سمجھ سکے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا ذہنی مستوی بلند کرے۔کنڈیشنڈ ذہن کا آدمی اس قابل نہیں کہ وہ مولانا وحید الدین خان جیسی علمی شخصیت کو سمجھ سکے۔

جو کوئی بھی بلا تعصب مولانا صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرے گا وہ با آسانی سمجھ سکتا ہے کہ مولانا کے دلائل ایسے ہیں کہ اس کا کوئی جواب ہمارے رواجی علماء کے پاس موجود نہیں۔ دلیل کی سطح پر علماء پوری طرح بے بس ہیں ۔مولانا صاحب کی پوری فکر قرآن وسنت پر مبنی ہے۔سالوں سے مولانا کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد اور ان کی زندگی کو بغور مشاہدہ کرنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کی پوری زندگی رسول اور اصحاب رسول کی زندگی سے تعبیر ہے۔ سادگی، قناعت، صبر وتحمل، خدا کی معرفت، اور آخرت کا انذار— اسی سے مولانا کی پوری زندگی عبارت ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مولانا کے متعلق ایک شخص نے طنزیہ انداز میں کہا تھا کہ وہ تو آخرت نویسی کرتے ہیں۔ بلا شبہ یہ بات بالکل درست ہے کہ مولانا کی تمام کتابیں اور ان کی زندگی کے روز و شب اسی سے عبارت ہیں۔آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔ دنیا کی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں۔خدا کی معرفت، مخلوق کی خیر خواہی یہی ساری چیزیں مولانا کی کتابوں میں آپ پائیں گے۔ کہنے والے کی یہ بات درست ہے۔لیکن بس اسے طنزیہ نہیں، بلکہ تعریف میں ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ دراصل معاملہ تو اصل آخرت ہی کا ہے۔مخلوق کی خیر خواہی میں اپنے آپ کو پگھلا ڈالنا۔خدا کی معرفت اور دین اسلام کی تبلیغ کے علاوہ مولانا کو کبھی کسی اور معاملے کے لیے اتنا فکر مند اور بے چین نہیں پایا۔

رسول اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا (شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا) الطبقات الکبریٰ، جلد 1، صفحہ 334۔ بلا شبہ مولانا کی ذات میں آپ اسی فکر و تڑپ کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ خدا کے دین کے سچے داعیوں کو جو اذیت مذہبی گدیوں پر بیٹھنے والوں نے دی ہے وہ کسی دوسرے نے نہیں دی۔ حضرت مسیح کی زندگی اس کی ایک واضح مثال ہے۔ ویسے یہ دنیا آزمائش کے اصول پر بنی ہے۔ یہاں کھوٹا سکہ چل جاتا ہے اور کھرا رہ جاتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ مدارس آج کی ایجاد ہیں۔ یہ کوئی دین کا معیار نہیں کہ آٹھ سال یا دس سال مدارس میں تعلیم لینے سے انسان خدا کے نزدیک بھی علامہ کا لقب پالے۔ بلا شبہ یہ بالکل غلط تصور ہے۔

میں علم دین اور علماء کا مخالف نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ چند سال مدرسے میں پڑھ لینے سے کوئی اللہ والا عالم نہیں ہو جاتا۔ یہ چند سالوں پر مشتمل علم کے ایک کورس کو مکمل کرنا ہے۔ اس سے عملاً دین کے تعلق سے معلومات حاصل ہوتی ہے، نہ کہ خشیت الٰہی اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ یہ رواجی تعلیم کسی کو خدا کے نزدیک عالم قرار نہیں دے سکتی، اگر اس کے اندر تقویٰ اور محبت الٰہی وغیرہ پیدا نہ ہوئی ہو۔ قرآن پاک کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو علماء وہ ہیں جو خدا کی خشیت میں کانپتے رہتے ہیں (فاطر، 35:28)۔ ان کے دل ہمیشہ خدا کی یاد سے آباد رہتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ دنیا اعتراف اور بے اعترافی کی امتحان گاہ ہے۔ اگر اعتراف کرو گے تو خدا کی جانب سے انعام ہے اور اگر بے اعترافی کرو گے تو بلا شبہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ اب ہم بات کرتے ہیں ان اختلافی موضوعات کی جن کو لے کر کچھ نادانوں نے مولانا کی کردار کشی کرنا چاہی اور مولانا کے خلاف مسلمانوں میں غلط فہمیاں پیدا کیں۔ ان میں سر فہرست مولانا پر یہ الزام ہے کہ وہ اجماع سے ہٹے ہوئے ہیں۔

1۔ پہلا اعتراض مولانا صاحب امت کے اجماع سے ہٹے ہوئے ہیں تو بھائیو اس امت کا ہر وہ بڑا عالم جو زندہ تھا اور غور و فکر کرتا تھا وہ اجماع سے ہٹا ہوا کہلاتا تھا۔ ہاں مگر جب وہ مر جاتا تو امام، شیخ الاسلام اور نہ جانے کیا کیا القابات سے نوازا جاتا۔ مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ امام ابو حنیفہ، شافعی، مالک اور احمد ان کی تاریخ آپ پڑھ لیں آپ کو جواب مل جائے گا۔

کیا مولانا وحید الدین خان اجماع سے ہٹے ہوئے تھے؟ علماء عام طور پر عوام کو مولانا وحید الدین خان کے خلاف صرف اسی ایک جملے سے سے متنفر کرتے ہیں کہ مولانا اجماع سے ہٹے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے یہاں جو محتاط رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ آپ کو دوسری جگہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مولانا نے کچھ اکابرین پر تنقیدیں کی ہیں اور اس کے پیچھے بھی محرک صرف یہ تھا کہ دین اسلام کی حقیقی تصویر انسانیت کے سامنے آئے اور اسلام کا حقیقی چہرہ جو کہ ان اکابرین کی سیاسی اور جارحانہ تعبیر کے گرد وغبار میں چھپ چکی تھی، وہ چھٹ جائے۔ اور اسلام کا روشن چہرہ پوری انسانیت دیکھ سکے۔ مولانا کی زندگی کا ایک اہم اصول یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو صرف ان ہی کاموں میں مشغول رکھتے اور انہی امور میں بولتے جہاں کوئی نتیجہ خیز عمل کی امید ہو، ورنہ وہ خاموشی ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ اکابرین کے خلاف ان کی تنقیدیں درحقیقت علمی تجزیہ ہوتی تھیں، تنقید کے نام پر کسی کی تنقیص کرنا ان کا مسلک تھا ہی نہیں۔

مولانا کی فکر کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ مولانا ایک داعی ہیں۔ اسلام کے سچے داعی۔ دعوت اسلام ان کی زندگی کا مشن ہے جس کے سبب ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں مولانا کی رہنمائی ہمیشہ سے یہی رہی کہ اس ملک میں ہر حالت میں امن برقرار رہنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر امن نہیں ہوگا تو اس ملک میں دعوت کے مواقع برباد ہو جائیں گے۔

مولانا صاحب کی اسی حکمت کا یہ نتیجہ ہے کہ آزاد ہندستان کی تاریخ میں مولانا پہلے شخص ہیں جو غیر مسلموں کے اعلی افراد تک اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے میں مکمل طور پر کامیاب ثابت ہوئے۔ اسلام کے متعلق جو غلط فہمی ہندوستان کے غیر مسلم عوام کو لاحق تھی، ان کے ازالہ کا ایک بہت بڑا ذریعہ اللہ تعالی نے مولانا کی ذات کو بنایا۔ اللہ تعالی ان کی ان مساعی کو شرف قبولیت بخشے اور اس ٹیم کو دین کی خدمت کے لیے مزید بہتر کارکردگی کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

2۔ دوسرا اعتراض ہے کہ مولانا وحید الدین خان ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔ ان کو قبول عامہ حاصل نہیں۔ میں کہوں گا کہ متنازعہ ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی سنت ہے۔ کیوں کہ داعی کا کام حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہوتا ہے۔ اور جو کوئی بھی ایسا کرے گا وہ معاشرے میں متنازعہ ہو کر ہی رہے گا۔ انبیاء کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

3۔تیسرا اعتراض مولانا کے متعلق یہ کیا جاتا ہے کہ مولانا احناف کے مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں۔اس طرح کے اعتراضات ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے علماء کے یہاں مسالک اور گروہ بندی کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے۔تو ظاہر ہے کہ جو عالم اتحاد بین المسالک کے ساتھ انسانیت کو جوڑنے کی آواز بلند کرے وہ ان میں مقبول کیسے ہوسکتا ہے۔

مولانا اس طرح کی باتوں کو ایمانیات میں شمار نہیں کرتے تھے۔ ہاں، مولانا حنفی مسلک کے پیروکار تھے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو باتیں قرآن اور سنت سے غلط ثابت ہوجائیں، اسے صرف اس بنا پر صحیح سمجھیں کہ ان کا مسلک اس کا حکم دیتا ہے۔تین طلاق کے متعلق سبھی لوگ جانتے ہیں کہ مولانا اس سلسلے میں سلفی مسلک کو زیادہ درست مانتے تھے۔کیوں کہ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور دینی مزاج کو دیکھتے ہوئے یہی مسلک زیادہ راجح نظر آتا ہے، اور اسی سبب سے خود مختلف مسلم ممالک نے بھی اب اسی کو اپنایا ہوا ہے۔ جیسے سعودی عرب، یواے ای اور انڈونیشیا وغیرہ نے۔

4۔ چوتھا اعتراض یہ کہ مولانا صاحب غیر مسلموں کے پروگرام میں شرکت کرتے ہیں۔میرے نزدیک یہ سارے بودے اعتراضات کی اصل وجہ دعوتی ذہن کا نہ ہونا ہے۔ ورنہ یہ جانتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے میلوں میں کیوں جاتے تھے؟ دعوتِ دین اس امت کا اصل مشن ہے۔اگر دعوت کا ذہن مفقود ہے تو اس امت کا خیر امت ہونا یقیناً مشکوک ہے۔مولانا ایک داعی تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عکاظ کے میلے میں جا کر دعوت دیا کرتے تھے۔لہذا دعوت کے لیے جو مواقع ملیں، انھیں اویل کرنا ایک سچے داعی کا کام ہے، اور مولانا یہی کرتے تھے۔

5۔مولانا کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولانا جہاد بالسیف کے قائل نہیں۔ یہ مولانا پر سراسر ایک الزام ہے جس کی ہمارے علماء کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔

مولانا نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جہاد بالسیف اب منسوخ ہوچکا ہے۔مولانا صرف یہ کہتے ہیں کہ جہاد بالسیف خدا کا عارضی حکم تھا۔جب کہ جہاد بالقرآن یعنی دعوت کا کام اسلام کا ایک ابدی حکم ہے۔ دعوت دین یا دین کی نسبت سے اب قتال بالسیف عملاً موقوف ہے حکماً منسوخ نہیں۔لیکن کون سمجھائے ان نادانوں کو جو کچھ کا کچھ مطلب اپنے ذہن سے نکال لیتے ہیں۔البتہ یہ درست ہے کہ موجودہ زمانہ میں جولڑائیاں کشمیر، افغانستان، عراق، ایران اور فلسطین میں لڑی جارہی ہیں، ان کو مولانا

جہاد کا نام نہیں دیتے تھے۔ بلکہ اسے قومی لڑائیاں شمار کرتے تھے۔ اگر آج مسلمان مولانا کے مشوروں کو قبول کرلیں تو یقیناً ان کے لیے یہ سب سے بڑی کامیابی ثابت ہوگی۔ مگر کچھ لوگوں نے دین کی سیاسی تعبیر کر کے اس خونریز لڑائیوں کو جواز بخش دیا ہے، جس سے آخر یہی ہوگا کہ مسلمان مزید سے مزید تر ہلاکت کے گڑھے میں گرتے چلے جائیں گے۔

6۔ چھٹا اعتراض مولانا پر یہ ہے کہ مولانا مصلحت کی بنا پر تبلیغی جماعت کے حامی ہیں، ورنہ دراصل تبلیغی جماعت کے مخالف ہیں۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ یا تو کلی طور پر کسی کی موافقت کو جانتے ہیں یا کلی مخالفت کو۔ جب کہ ان کے درمیان ایک تیسری چیز بھی موجود ہے، اور وہ ہے اچھے پہلوؤں کو سراہنا اور غلطیوں کی نشاندہی کرنا۔ مولانا نے بس یہی کیا۔ وہ مداہنت اور چاپلوسی کے ہنر سے پوری طرح ناواقف تھے۔ ان کا کام صحیح باتوں کا اعتراف کرنا اور غلط بات کی وضاحت کرنا ہوتا تھا۔ انہیں اپنی ملت، قوم و مسلک سے کہیں زیادہ اسلام کی سربلندی کی فکر رہتی تھی۔ وہ مسلم قوم کے نہیں، اسلام کے ایڈوکیٹ تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں کو ان کی غلطیوں پر آگاہ کیا۔ انہوں نے کبھی مصلحت کی خاطر قوم کی غلطیوں پر خاموشی نہیں اختیار کی بلکہ حق اور سچ بولنے کا حق ادا کر دیا۔ اللہ انہیں اس کا بہترین بدلہ عطا کرے۔

مولانا نے تبلیغی تحریک پر جو کتاب لکھی ہے بلاشبہ وہ خود تبلیغی جماعت کے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے بدرجہا بہتر ہے اور اس کو پڑھنے کے بعد تبلیغی جماعت کے بارے میں میری اپنی مثبت رائے بنی ہے۔ میں علماء کی اکثریت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ تبلیغی جماعت سے بیزار ہیں۔ دل میں ان کے لیے عناد رکھتے ہیں۔ لیکن مصلحت کے سبب وہ علماء تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ مولانا وحید الدین وہ ہیں، جن میں نفاق بالکل نہیں تھا۔ جہاں وہ ایک طرف اس کے اچھے کاموں کو سراہتے ہیں تو دوسری طرف اس میں جو خرابیاں ہیں، اس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں، اور یہی ایک حقیقی عالم دین کا کام ہے۔

7۔ ساتواں اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مولانا کا بابری مسجد کے بارے میں موقف ہمارے علماء کے موقف سے بالکل الگ ہے۔ جی بالکل درست، لیکن یہاں پر بھی مولانا کے بارے میں ہمارے قائدین غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ بابری مسجد کے حوالے سے ہندستانی علماء نے مولانا کے ساتھ بڑی زیادتی

کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا مسجد کو غیر مسلموں کے سپرد کر دینے کے قائل تھے جب کہ ایسا بالکل بھی نہیں۔ بابری مسجد کے قضیہ میں مولانا کا موقف مختلف مراحل میں مختلف تھا۔ یعنی مولانا کی تجاویز ہر مرحلے میں الگ الگ تھی۔ مسجد کی شہادت سے پہلے انہوں نے مسلمانوں کو جو مشورہ دیا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی ثالثی کے فیصلے پر راضی ہو جائیں۔ اس وقت مسلمانوں نے اسے نہیں مانا۔ کاش مسلمان اس پر راضی ہو جاتے تو بہت امید تھی کہ آج حالات ہرگز اس طرح نازک نہ ہوتے اور مسجد کی مخالفت ہندوؤں کے لیے وقار کا مسئلہ نہ بنتی۔

مگر جب مسجد کو گرا دیا گیا تب مسلمان اسی ثالثی کے آپشن (option) کی دہائی دینے لگے تھے۔ لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ مسجد کی شہادت کے بعد مولانا نے مسلمانوں کو صحیح اور غلط کے پیمانے پر نہیں بلکہ ممکن اور ناممکن کے زاویہ سے دیکھتے ہوئے جو مشورہ دیا تھا، وہ حالات کے اعتبار سے پوری طرح مناسب تھا، اور اگر اس وقت اسے مان لیا جاتا تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت بالکل مختلف ہوتی۔ اور بالآخر وہی ہوا جو مولانا نے کہا تھا، اور مسلمانوں نے اسے مجبور ہو کر مانا۔

بابری مسجد کے متعلق اگر مولانا کے موقف کو اپنا لیا جاتا تو مسلمانوں کو اس طرح کی شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ جو باتیں مولانا نے اس وقت کہی تھیں، جب بابری مسجد کو شہید کیا گیا تھا اور جن باتوں کا مولانا نے اس وقت مشورہ دیا تھا، آج وہی مشورہ امت کے علماء دے رہے ہیں۔

8۔ مولانا صاحب پر ایک سب سے بڑا اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مولانا نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اسوہ حسنہ سمجھا، نہ کہ اسوہ کاملہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ مولانا صاحب کے اس جملے پر معترض ہیں ان کو چاہیے کہ وہ مولانا صاحب کے اس مضمون کو اس کے پورے سیاق کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اللہ تعالی ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم انبیاء کے مابین فرق نہ کریں (البقرہ، 2:136,285) تمام انبیاء سے رہنمائی حاصل کرنا اور تمام کو اپنے لیے اسوہ سمجھنا یہی تعلیم ہمیں قرآن اور اسلام دیتا ہے۔ مولانا نے اسوہ حسنہ اور اسوہ کاملہ کا یہ لفظ استعمال کیا ہے اس کے پیچھے یہی سیاق تھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ مسلمان اللہ تعالی کے تمام رسولوں کو اسوہ سمجھے اور جس وقت جس حالات میں جس نبی کا اسوہ موجود ہو اس پر عمل پیرا ہوں۔ بس اتنی سی بات تھی۔ ایک سیدھی سی بات کو علماء نے کیا سے کیا معنی پہنا دیا۔ اگر

انسان موشگافیاں تلاش کرنے کو ہی اپنا مشغلہ بنالے تو اسے کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے۔

ایسے لوگوں کو مولانا کا وہ جملہ پڑھنا چاہیے جو مولانا نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھا ہے۔ مولانا نے اپنی کتاب عظمت اسلام میں لکھا ہے: پیغمبر صرف پیغام رساں نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ وہ لوگوں کے لیے نمونۂ عمل بھی ہوتا ہے جس کو قرآن میں اسوہ (الاحزاب، 33.21) کہا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ ہر قسم کے حالات آپ کے اوپر گزریں تاکہ آپ ہر اعتبار سے ساری انسانیت کے لیے نمونہ بن سکیں۔ چنانچہ سیرت اور حدیث کی کتابیں بتاتی ہیں کہ واقعۃً ایسا ہی ہوا۔ آپ کی زندگی ہر قسم کے واقعات سے بھری ہوئی زندگی ہے۔ ہر صورتِ حال اور ہر موڑ کے لیے آپ کی زندگی میں نمونہ موجود ہے (صفحہ 106)۔ آپ نے اپنی عملی زندگی سے یہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی (supreme success) حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ آپ کی حیثیت ایک ابدی رہنما کی ہے (صفحہ 115)۔

اسی طرح مولانا ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت اتنی بلند تھی کہ اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس طرح کا انسان نہ کوئی پیدا ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ مولانا کے اسوہ حسنۃ اور کاملۃ کے جملے سے مقصود صرف اور صرف یہ تھا کہ رسول اللہ ہی کی طرح تمام پیغمبروں میں ہمارے لیے دعوتی نمونے موجود ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ حکم دیتا ہے: تم ان کی پیروی کرو۔ قرآن میں ہے: فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (6:90)۔

اسی طرح الرسالہ فروری 2013 میں مولانا نے اسوۂ رسول کے عنوان سے لکھا ہے: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل اسوہ بہ اعتبار فہرست (in terms of list) نہیں ہے (یعنی ایسا نہیں ہے کہ آج پیش آنے والے ہر واقعہ کے لیے ڈائریکٹ طور پر رسول اللہ کی زندگی میں نمونہ مل جائے)، بلکہ وہ بہ اعتبارِ انطباق (in terms of application) ہے۔ یہ حقیقت ایک حدیثِ رسول سے معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو (بطور عامل) یمن کی طرف بھیجا تو آپ نے معاذ بن جبل سے پوچھا کہ جب تمھارے سامنے کوئی معاملہ آئے گا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے۔ انھوں نے کہا کہ میں اللہ کی کتاب سے اس کا فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ۔ انھوں نے کہا کہ میں رسول اللہ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔

آپ نے فرمایا کہ اگر تم رسول اللہ کی سنت میں اور اللہ کی کتاب میں بھی نہ پاؤ۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی نہیں کروں گا (أجتهد رأيي ولا آلو)۔ رسول اللہ نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول کے فرستادہ کو اُس چیز کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے (سنن أبي داؤد، حدیث نمبر 3592)۔

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معاذ بن جبل کو اعتماد تھا کہ وہ سنتِ رسول کے ذریعے تمام پیش آمدہ معاملات کا فیصلہ کرسکتے ہیں، لیکن یہ فیصلہ اِس اعتبار سے نہ تھا کہ سنت بہ اعتبارِ فہرست ایک مکمل فہرست ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ معلوم فہرست پر اجتہاد کا اضافہ کرکے وہ اس کو مکمل کرسکتے ہیں۔ اِس روایت سے جو اصول دریافت ہوتا ہے، وہ یہ ہے — سنت پلس اجتہاد برابر ہے کامل اسوہ رسول کے:

Sunnah plus Ijtihad is equal to Uswah-e-Kamilah

9۔ مولانا پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے (یا کہوں کہ مولانا کی ایک مشہور کتاب شتم رسول کا مسئلہ پر کیا جاتا ہے) وہ ہے شاتم رسول کی سزا۔ میں اس بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ مولانا کی ویسے تو تمام کتابیں ایک شاہکار ہیں لیکن اگر ان میں بھی کچھ کتابوں کو منتخب کیا جائے تو بلاشبہ مولانا کی یہ کتاب مستقبل میں ایک ریفرینس بک شمار کی جائے گی۔ مولانا نے اس میں بہت ہی عمدہ طریقے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی معاشرہ جبر کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام آزادی رائے کا پورا احترام کرتا ہے صرف احترام ہی نہیں بلکہ آزادئ رائے کو معاشرے میں فروغ دیتا ہے۔ گستاخئ رسول کے نام پر قتل کرنا بلاشبہ نبی رحمت کا طریقہ نہیں۔

محمد بن عبداللہ تو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ عبداللہ بن ابی جیسا گستاخ رسول بلاشبہ سزا کا مستحق تھا۔ لیکن حضور کی جانب سے حُسنِ سلوک کا سزاوار بنا۔ ایک مرتبہ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا: لَنُحْسِنَنَّ صُحْبَتَهُ مَا دَامَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا (الطبقات الکبریٰ، جلد 2، صفحہ 50)۔ یعنی جب تک وہ ہمارے درمیان ہے، ہم ضرور ضرور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کریں گے۔ اسلام میں شتم بحث ومباحثے کا موضوع ہے، ڈائیلاگ کا موضوع ہے، نہ کہ قتل وسزا کا۔ یہی سب مٹانے کے لیے ہی تو اسلام آیا تھا۔ لیکن افسوس مسلمانوں پر کہ جوں

جوں مسلمان اپنی علمی کمی کی بنا پر دلائل میں کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے یہاں اس طرح کا تشدد اور غلو پنپتا جا رہا ہے۔

10۔ مولانا پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک یہ ہے کہ مولانا مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی اور دجال کو بھی ایک الگ زاویے سے دیکھتے ہیں تو بھائی جان کم از کم مولانا ان حدیث کا علمی تجزیہ کر کے ایک معقول تاویل تو پیش کرتے ہیں۔ ویسے بھی یہ چیزیں ایمانیات کا حصہ نہیں ہیں؟ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3435)۔ چلو مان لیا کہ مولانا مسیح علیہ السلام کی جسمانی آمد کے قائل نہیں۔ لیکن آپ ان علماء کے بارے میں کیا کہیں گے جو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس قبیل کی ایک بھی حدیث صحیح نہیں۔ بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے چلے جانے کے تین سو سال بعد امت میں پھیلیں، اور ایسا کہنے والے اس امت کے بڑے بڑے علماء ہیں۔ لہذا اگر دیکھا جائے تو اس معاملے مولانا کا معاملہ بالکل محتاط ہے۔ دوستو اب ہمیں ضرورت ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھیں۔ فرقہ واریت چھوڑیں، اور علمی اختلافات کو حسن سمجھیں، نہ کہ وبال۔ آج ضرورت ہے کہ مولانا وحید الدین صاحب کی فکر کو لوگوں تک پہنچایا جائے، دعوت کا شعور مسلمانوں میں پھر سے زندہ کیا جائے۔

مسئلہ کشمیر، این آر سی اور سی اے اے: مولانا وحید الدین خان ایک جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مدبر بھی تھے۔ اگر چہ بہت سے لوگ مولانا کو اس زاویے سے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مولانا کی خوبی صرف اچھی باتیں کرنے میں نہیں تھی۔ بلکہ وہ مسائل کی جڑ کو جاننے کی کوشش کرتے، اور پھر اس کا حل تجویز کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ حقیقت پسندی کی زمین پر کھڑے رہتے تھے۔ بلاشبہ یہی وہ حکمت خداوندی تھی، جس کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دے دیا گیا (البقرۃ، 2:269)۔

مولانا نے شروع ہی سے اہل کشمیر کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ تشدد کا راستہ مکمل طور پر چھوڑ دیں، اور ہندوستان سے الحاق کو دل کی رضامندی سے قبول کر لیں۔ مولانا نے کہا تھا کہ کشمیریوں کے پاس صرف دو ہی آپشنز ہیں۔ پہلا یہ کہ انڈیا سے الحاق پر راضی ہوتے ہوئے تعلیم و تجارت کے میدان میں ترقی کرتے چلے جائیں۔ اور دوسرا یہ کہ تشدد کے راستے پر چلتے ہوئے اپنے آپ کو مزید ہلاکت کے گڑھے میں ڈال

دیں۔ اور آج حالات ہمارے سامنے ہیں۔ اتنی قربانیوں کے باوجود آج کشمیر کے حالات بد سے بھی بدتر ہیں۔ کاش کہ کشمیریوں نے مولانا کی تجویز کو قبول کرلیا ہوتا تو آج ان کو یہ حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

مولانا کا ایک واقعہ آپ کے سامنے شیئر کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ والوں کا ردعمل پریشان کن حالات میں کیسا ہوتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں این آرسی اور سی اے اے کے معاملہ کو لے کر مسلمان کافی خوف زدہ ہیں۔ وہی جلسے جلوس اور احتجاجات کی فضا خوب چل رہی تھی، جو فی الحال کووڈ کی وجہ سے تھم چکی ہے۔ بہرحال مولانا سے سے این آرسی اور سی اے اے کے متعلق مشورہ چاہا کہ ایسے موقع پر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ مولانا نے بالکل خاموشی کے ساتھ یہ جواب دیا کہ یہ ملک اور اس کی نعمتیں تمہیں دینے والا خدا ہے تو جو چیز خدا نے دی ہے تو اسے چھیننے کا حق بھی صرف اور صرف خدا کو ہی ہے۔ کوئی اور اسے ہرگز چھین نہیں سکتا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، صرف اپنے وطنی بھائیوں کو خدا کا پیغام پہنچائیں ،ان کو خدا کے تخلیقی منصوبے سے آگاہ کریں۔ یقین جانیے، یہ سب معاملے یوں ہی ختم ہو جائیں گے۔

یقیناً اسی کو کہتے ہیں حکمت۔ خدا کی عنایت سے ایک مومن ان چیزوں کو جان لیتا ہے جسے دوسرے لوگ کبھی جان نہیں سکتے۔ مولانا کی یہ بات حتمی ہے۔ یقیناً ان چیزوں سے گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ماضی کے پہیے کو کبھی بھی ریورس گیئر میں گھمایا نہیں جاسکتا۔ مگر یہ کہ مسلمان پھر سے ''آ بیل مجھے مار'' والی پالیسی اپنائیں۔ ورنہ اس طرح کی چیزیں خود بخود مٹ جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ڈرنے کا نہیں، بلکہ یہ ایک عظیم الشان ذمہ داری کو کرنے کا کام ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کو سونپی ہے اور وہ ہے دعوت الی اللہ کا مشن۔

مولانا کی وہ صفت جس نے مولانا کو لاکھوں انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا، وہ تھی پوری انسانیت کی فلاح کے لیے ان کی کڑھن۔ وہ صرف ذہین انسان نہیں، بلکہ وہ ایک نہایت متقی انسان تھے، اور اسی تقوی کی بنا پر اللہ نے ان پر اپنی حکمت کے سرے کھول دئے تھے۔ آج کوئی بھی معقول آدمی مولانا کو پڑھ کر متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ ان کی باتوں میں جس طرح کا وضوح، مسائل کا استدراک اور ہر ایک واقعہ سے عبرت خیزی کا انوکھا انداز یقیناً خدا کی عطا کے بنا ناممکن ہے۔

مولانا دعا اور رینٹیڈ انسان تھے۔ وہ ہر وقت دعا میں رہتے تھے اور ہم تمام ساتھیوں کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ 2019 میں میں جب دہلی قرآن کانفرنس میں شریک ہوا تو مولانا

جس وقت تشریف لائے ان کی زبان سے سب سے پہلا لفظ جو نکلا وہ یہ تھا کہ اللہ تعالی ہم سب کو جنت نصیب کرے۔ آج مولانا اپنے کریم خدا کے سامنے حاضر ہو چکے ہیں۔ رب کریم مولانا پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں اوران کے لیے اس کار خیر کو ان کی بلندیٔ درجات کا ذریعہ بنائے۔ اور ہمیں کامل بصیرت کے ساتھ دعوت الی اللہ کے اس خدائی مشن میں اپنا بھر پور کنٹری بیوشن کرنے والا بنائے۔ آمین

---

امن وآشتی کے علم بردار تھے مولانا وحید الدین خان: نئی دہلی، مولانا وحید الدین خان ہمارے درمیان ایک ایسی شخصیت تھے جو ہمیشہ اہل ملک کے درمیان صلح اور امن کی راہیں تلاش کرتے تھے، وہ مذاہب کی ان تعلیمات کو پیش کرتے تھے جو سب کے درمیان یکساں تھیں، وہ برادران وطن کے ساتھ خیر خواہی کے تعلقات پر زور دیتے تھے، شدت پسندی کے سخت خلاف رہتے تھے۔ ان کا سارا لٹریچر امن اور صلح کا خزانہ ہے۔ جو ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار کل ہند مجلس اتحاد المسلمین دہلی کے صدر جناب کلیم الحفیظ نے پریس کو جاری ایک تعزیتی بیان میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کو درجنوں اعزازات سے نوازا گیا جس میں پدم بھوشن بھی شامل ہے، لیکن مولانا کی شخصیت بھارت کے لیے خود ایک اعزاز کی حیثیت رکھتی تھی۔ مولانا اسلام کے مبلغ بھی تھے اور مفکر بھی، ان کی فکری جدو جہد کے نتیجے میں بہت سے پہلو روشن ہوئے۔ مولانا کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ الرسالہ اپنی شناخت میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ کلیم الحفیظ نے کہا کہ مولانا کا انتقال علم کے سورج کے غروب ہونے کے برابر ہے۔ مولانا کافی مدت سے علیل تھے، انھوں نے بھر پور عمر (97 سال) پائی، اللہ نے ان سے خوب کام لیا۔ اب یہ ان کے عقیدت مندوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے مشن کو آگے بڑھائیں۔ کلیم الحفیظ نے کہا کہ مولانا کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور اپنے مشن کا ساتھی بنایا، ان کی ایک بیٹی فریدہ خانم صاحبہ جو جامعہ سے ریٹائرڈ ہیں انھوں نے مولانا کی درجنوں کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور الرسالہ انگریزی کی مدیر ہیں، ان کے بیٹے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان صاحب خود ایک بین الاقوامی اسلامی اسکالر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے۔ (اردو لیکس ڈاٹ کام، 22 اپریل 2021)

# موت العالَم، موت العالَم

خورشید احمد ندیم، پاکستان

بیسویں صدی کے بڑے اور جیّد عالم مولانا وحید الدین خاں دنیا سے رخصت ہوئے۔ خدا کا ایک بندہ جو پیغمبروں کی اتباع میں، تمام عمر رب سے ملاقات کی منادی کرتا رہا، اپنے رب کے سامنے پیش ہو گیا۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ پروردگارِ عالم کے دربار میں، ایک داعی الی اللہ کی یہ حاضری کیسی ہوگی۔ اس شان، اخلاص اور استدلال کے ساتھ آخرت کی تذکیر، واقعہ یہ ہے کہ اس امت میں صدیوں سے نہیں سنی گئی اور نہیں معلوم پھر کب سنی جائے گی۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

1988ء میرے لیے ایک مہربان سال تھا۔ اس سال مولانا وحید الدین خان اور جاوید احمد غامدی صاحب سے میرا شعوری تعارف ہوا۔ 1989ء میں جب جاوید صاحب کی صحبت نصیب ہوئی تو اِن شخصیات کے کام کو علمی سطح پر سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ اگر ''جاوید نامہ'' ان سے سبقاً سبقاً نہ پڑھا ہوتا تو علامہ اقبال کو شاید اس طرح دریافت نہ کر پاتا۔ یہی معاملہ مولانا وحید الدین خان اور دوسرے اہلِ علم کا بھی ہے۔

بطور عالم اور داعی، مولانا ایک بے مثل آدمی تھے۔ ان کی شخصیت کی تیسری جہت ادبی ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ وہ دبستانِ شبلی ہی کے ایک فرد تھے جس سے منسوب شخصیات کے علمی کمالات ہی نہیں، اردو زبان و ادب کے لیے خدمات بھی ہماری روایت کا ایک شاندار باب ہے۔ دینی ادب کو مولانا نے ایک نیا لہجہ اور اسلوب دیا۔ ان کے جریدے 'الرسالہ' کو دعوتی لٹریچر میں کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔

بحیثیتِ عالم، ان کا سب سے بڑا کارنامہ دین کی سیاسی تعبیر پر عالمانہ تنقید ہے۔ یہ تنقید مولانا اشرف علی تھانوی نے کی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی کی۔ مگر مولانا وحید الدین خان کی کتاب تعبیر کی غلطی اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔ علمی متانت، عقلی و نقلی استدلال، قوتِ بیان و تاثیر

اور دردِ دل کا ایسا مرقع، دینی لٹریچر میں شاید ہی مل سکے۔ اگر کوئی یہ سمجھنا چاہے کہ تنقید کا علمی معیار کیا ہوتا ہے تو اسے یہ کتاب پڑھنی چاہیے۔

یہ کتاب ایک علمی رومان کے ٹوٹنے کا بیان بھی ہے۔ ایک علمی وصال اور ہجر کی داستان بھی۔ جو اس حادثے سے دوچار ہوا ہو، وہی جان سکتا ہے کہ اِس کا کرب کیا ہوتا ہے— جنیاں تن میرے تے لگیاں، تینوں اک لگے تے توں جانے (جتنی میرے جسم پر لگی ہیں، تمہارے جسم پر اس طرح کی ایک ضرب لگے تو تمہیں اس کی اذیت کا ادراک ہو)۔ مولانا نے اس کتاب کے پہلے صفحے پر لکھا ''اس کتاب کی اشاعت میرے اوپر کتنی سخت ہے، اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے اس کے شائع ہونے کے بعد میں کسی ایسی جگہ پر جا کر چھپ جاؤں جہاں کوئی شخص مجھے نہ دیکھے، اور پھر اسی حال میں میں مرجاؤں۔''

'تعبیر کی غلطی' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تعبیرِ دین پر تنقید ہے۔ وہ مولانا مودودی کے پہلے باضابطہ ناقد ہیں جن کی رسائی مولانا کے فکری جوہر تک ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ معاملہ تعبیرِ دین کا ہے، کسی ایک مسئلے میں علمی تفرد کا نہیں۔ مولانا مودودی، مولانا وحیدالدین خان کے شعوری سفر کا پہلا پڑاؤ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''علم جدید کا چیلنج'' کو مولانا کا بالواسطہ فیض قرار دیا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسی قلم سے ''تعبیر کی غلطی'' لکھنا کتنا بارِ خاطر ہوگا۔ مولانا مودودی کی علمی وجاہت اور فکری شکوہ میں کچھ کلام نہیں۔ مولانا وحیدالدین خان نے اس فکر کا 'جوابِ دعویٰ' (antithesis)، اُسی علمی شان کے ساتھ ہمارے سامنے رکھا۔ زندہ فکر اسی طرح ارتقا کی منازل طے کرتی ہے۔

مولانا کا دوسرا بڑا کارنامہ مسلم نفسیات کی تشکیلِ نو ہے جو ان کے علمی کام ہی کا عملی اطلاق ہے۔ ماسبق مسلم مفکرین اور راہنماؤں کے زیرِ اثر، جو مسلم نفسیات پیدا ہوئی، وہ سیاسی تھی۔ اس کے نتیجے میں سیاسی عظمتِ رفتہ کی بازیافت، مسلمانوں کا اجتماعی نصب العین بنا۔ یہ ماضی کی فکری اسیری تھی، جس سے مولانا نے مسلمانوں کو نکالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بتایا کہ سیاسی غلبہ مادی دنیا کا ایک واقعہ ہے جس کا تعلق عالم اسباب سے ہے، دین سے نہیں۔

غلبے کی خواہش دوسروں کو حریف بنا کر آپ کے سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔ اس سے دیگر اقوام کے ساتھ آپ کا جو تعلق پیدا ہوتا ہے، وہ دنیاوی مفادات کے تصادم سے عبارت ہے۔ غیر مسلموں کے

ساتھ، اہلِ اسلام کا اصل تعلق داعی اور مدعو کا ہے۔ غلبے کی نفسیات اس تعلق کو مجروح کرتی ہے۔ داعی مدعو کا خیر خواہ ہوتا ہے، دشمن نہیں۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ ان کے دل میں کسی کے لیے کوئی نفرت نہیں۔ وہ اس دل کے ساتھ خدا کے حضور پیش ہونا چاہتے ہیں جو نفرت سے خالی اور سب کا خیر خواہ ہو۔

انسانوں کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ انہیں آخرت کے عذاب سے خبردار کیا جائے اور آخرت رخی (Akhirat oriented) شخصیات وجود میں آئیں۔ پیغمبر اسی لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ اس باب میں وہ سرسید اور مولانا محمد الیاس کے وارث تھے۔ سرسید کی خیر خواہی کا ہدف مسلمانوں کی دنیاوی ترقی اور مولانا الیاس و مولانا وحیدالدین خان کی مساعی کا حاصل اہلِ اسلام کی اُخروی نجات تھی۔

ان کا اصرار تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ایمپائر ختم ہوگئی لیکن ابلاغیات کی دنیا میں آنے والے انقلاب نے ان کے لیے یہ مواقع پیدا کر دیے کہ وہ اپنی 'دعوہ ایمپائر' کھڑی کر سکتے ہیں۔ وہ جدید ذہن کے شبہات دور کریں اور دین کو لوگوں کی علمی دریافت بنا دیں۔ مولانا ایک مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ دعوت کے لیے انہوں نے طویل عرصہ جدید علوم سیکھے۔ انگریزی زبان میں مہارت پیدا کی اور پھر ایسا دعوتی لٹریچر تیار کر دیا کہ اس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔

مولانا نے بتایا کہ انسان کی اصل آزمائش خدا کی معرفت کا حصول ہے۔ یہ معرفت کوئی پراسرار واقعہ نہیں جو صوفیانہ مشاغل، چلوں اور ریاضتوں کا محتاج ہو۔ یہ ایک شعوری تجربہ ہے۔ یہ آفاق و انفس پر غور و فکر کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ بات اگرچہ ان کے لٹریچر میں روح کی طرح جاری و ساری ہے مگر 'کتابِ معرفت' اس باب میں لاجواب ہے۔ اس کا ایک مضمون 'اسمِ اعظم' میں نے کئی بار پڑھا اور ہر بار یوں لگا کہ جیسے میرے دل پر اتر رہا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے، مجھے محسوس ہوا ہے کہ خدا کی دریافت میرے لیے ایک حسی واقعہ ہے۔

روزمرہ کے واقعات کو آفاقی حقیقتوں سے جوڑنا مولانا کا خاص امتیاز تھا۔ ایک مقام پر انہوں نے اپنے سفر کی روداد لکھی کہ وہ ایک ایئر پورٹ پر اترے تو ایک بزرگ آدمی کے طور پر انہیں خصوصی توجہ کا مستحق قرار دیا گیا۔ انہیں امیگریشن کے لیے قطار میں کھڑا نہیں ہونا پڑا اور ان کے لیے تمام مراحل آسانی سے طے ہوگئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں ایئر پورٹ سے نکلا تو میں نے دعا کی کہ اے

پروردگار، جب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں تو مجھے معذور جانتے ہوئے میرے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا اور مجھے حساب کتاب کی مرحلے سے اسی طرح آسانی کے ساتھ گزار دینا۔

اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ خدا بندے کے لیے ویسا ہی ہے جیسا وہ اس کے بارے میں گمان کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ ہوگا جیسا انہوں نے گمان کیا۔ ہم گواہ ہیں کہ وہ ایک صاف ستھری زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ (بشکریہ روزنامہ دنیا)

---

مولانا وحید الدین خان بہت بلند پایہ شخصیت تھے۔ آپ نے بہت کام کیا اور متاثر کن کام کیا۔ ان سے ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ مولانا کے ہم پر بے حد احسانات ہیں۔ میں مولانا کو اپنا بہت بڑا استاد مانتا ہوں۔ ایسا استاد جس نے میری علمی، فکری اور روحانی جستجو کی آبیاری کی۔ مولانا کے رخصت ہونے سے دل کو بہت قلق ہوا۔ (احسان اللہ، پاکستان)

---

بہت سیکھا ہے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں سے۔ نپی تلی بات کرنا، چیزوں کو عارفانہ نظر سے دیکھنا ان کی خوبیوں میں سے تھا۔ مولانا اپنے حصے کا کام کر گئے۔ اب ہمیں اس مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ (عفان رؤف، فیصل آباد)

---

ایک صدی کا خاتمہ، قوم سے خوشبو چلی گئی۔۔۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (زاہد کریم، دہلی)

# مولانا وحیدالدین خان اور ہندوستانی مسلمان

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، محکمہ اعلیٰ تعلیم حکومت جموں وکشمیر

مجتہد العصر مولانا وحیدالدین خان ( پیدائش 1925ء اعظم گڑھ اتر پردیش، وفات 21 اپریل 2021ء دہلی ) پوری دنیا میں دانشورانہ سطح پر اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے سلسلے میں جانے جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے فیلڈ میں ہندوستان کو represent کر رہے تھے، اور یہ ان کی منفرد پہچان بھی تھی۔

وہ اپنے نرم لہجے، معتدل نظریے، وسیع تر مطالعے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ کشادہ ذہن کی وجہ سے بلا تفریق مذہب وملت قبول کیے جاتے ہیں۔ اردو انگریزی ہندی میں ان کی 250 سے زائد کتابیں کئی ایڈیشنوں کے ساتھ شائع ہو کر داد حاصل کر چکی ہیں، جن میں

The Prophet of Peace. The Age of Peace, The Prophet Muhammad, A Simple Guide to his Life. Islam Rediscovered, etc.

تذکیر القرآن ( تفسیر قرآن ) شامل ہیں۔ ان کی بہت ساری کتابیں عالمی اشاعتی اداروں نے شائع کیں اور دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی کتابیں نصاب کے طور پر بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کا قائم کردہ ادارہ سی پی ایس انٹرنیشنل

Centre for Peace and Spirituality International
Nizamuddin West, New Delhi 110013

بھی اپنی نوعیت کی الگ پہچان رکھتا ہے۔

''ہندوستانی مسلمان'' نام کی کتاب میں مولانا وحیدالدین خان کے چھوٹے بڑے مضامین ولیکچرس اور ان کے افکار شامل ہیں، جنہیں (1) ہندوستانی مسلمان (2) روشن مستقبل (3) مسجد اور مسلمان اور (4) نیا دور، الگ الگ عنوان دے کر ایک لڑی میں پرویا گیا ہے، اور پھر ہر جگہ چند ذیلی سرخیوں کے تحت بھی بات کہی گئی ہے۔ کتاب میں شامل بیشتر مضامین کئی بین الاقوامی سمیناروں میں پڑھے گئے اور پھر مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

چونکہ یہ کتاب آج سے کئی سال پہلے شائع (پہلی اشاعت 1993ء اور اس کے بعد بھی) ہوئی اور ظاہری بات ہے کہ اس کتاب میں زیادہ تر ان ہی مسائل کو اٹھایا گیا ہے، جو اس وقت یہاں کے لوگوں کو خاص کر مسلمانوں کو درپیش تھے مگر مولانا نے ان مسائل پر اس طریقے سے بات کی اور اپنے خیالات کا اظہار اس انداز میں کیا ہے کہ ان کے یہ دانشورانہ خیالات آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ چونکہ ہر دور میں نئے نئے مسائل اور چیلنجز آتے رہتے ہیں اور ہمیں ان کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ تو ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یا پھر مختلف چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے اعلی دماغوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور یہ اعلی دماغ تب ہی پیدا ہوتے ہیں، جب ہمارے پاس علم ہو۔ علم کے مختلف sources ہوتے ہیں۔ خان صاحب کی تحریریں ہمیں وہ سب کچھ دے دیتی ہیں، جو ہمیں وقت اور حالات کے پیش نظر درکار ہوتا ہے۔

مولانا صاحب ایک تو بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور وہ ہر بات کا حال اور مستقبل کیا ہوسکتا ہے اس پر بھی ضرور روشنی ڈالتے تھے۔ اس کے علاوہ تقسیم ہند کے بعد برصغیر میں جو حالات پیدا ہوئے، ہم اس ٹراما (trauma) سے ابھی بھی نہیں نکل پائے ہیں۔ بدقسمتی سے روز بہ روز نئے نئے مسائل ہی پیدا ہوتے جارہے ہیں! اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ''ہندوستانی مسلمان'' نام کی کتاب کے مطالعے سے ہمارا ذہن اس قدر کشادہ ہوسکتا ہے کہ ہر مسئلے کا حل ہونے کے امکانات نظر آجاتے ہیں یا اگر ہم خان صاحب کے دیے ہوئے نسخے آزما سکتے ہیں، تو ایسے مسائل پیدا ہونے میں کمی بھی ہوسکتی ہے۔

خان صاحب اپنی کتاب کی شروعات ''ناکامی میں کامیابی'' کے عنوان سے کرتے ہیں اور ایک مغربی مفکر ٹوائن بی کی کتاب تاریخ کا مطالعہ (Study of History) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جن قوموں نے کوئی تہذیب پیدا کی، وہ پہلے شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ اس طرح دنیا کی مختلف تحریکوں کے ناکام ہونے کی اصل وجہ وہ بتاتے ہیں کہ ان کا سرا کسی اور کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ملک کے اندرون میں آپسی فسادات کبھی کبھار ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے مختلف واقعات کا تجزیہ کر کے وہ لکھتے ہیں کہ ان حالات میں ''ردعمل کے بجائے حکیمانہ عمل کا طریقہ اختیار کیا جائے'' تو بہتر ہے۔ آگے وہ ملت کی تعمیر کرنے کے لیے درج ذیل 10 نکاتی پروگرام بھی ترتیب دیتے ہیں:

(1) اللہ اور بندہ کے حقوق سمجھ کر ادا کرنا (2) بہتر انسان بننا (3) باہمی اتحاد (4) ہر مسئلے کا

حل مقامی کمیٹی کر سکتی ہے۔(5) فضول خرچی کو روکنا(6) مذہبی جگہوں اور اسکول کا بہتر بنانا(7) تعلیم(8) ہنر اور تجارت(9) وقف کی جائیداد کا صحیح استعمال(10) مقامی سیاست کا فروغ۔

مولانا وحید الدین خان سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی تعداد کی کمی کی سب سے بڑی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں خاص کر مسلم عورتوں میں ابھی بھی تعلیم کی کمی ہے۔اعلی تعلیم میں بھی مسلم بہت پیچھے ہیں، البتہ اس معاملے میں انہیں آگے امید کی کرن نظر آنے لگتی ہے۔ وہ معاشی حالات کے بارے میں کہتے ہیں کہ مجموعی طور پر 1947ء سے پہلے سے ہم بہتر ہیں۔ یہاں کے مذہبی اداروں کی حالت اطمینان بخش تو ہے، مگر مسلم سیاست سے وہ کسی قدر نالاں ہی ہیں۔فسادات کے زیادہ تر ذمہ دار سیاسی لیڈروں کو ٹھہراتے ہیں۔ چونکہ ہمیں وحید الدین خان کے خیالات تقریباً بقیہ بھی مذہبی رہنماؤں سے الگ تھلک لگتے ہیں۔ وہ اس لیے کیوں کہ انہوں نے خود اس بات کو مانا ہے کہ ان کا اپروچ Realistic ہے، جب کہ دوسرے لوگوں کا اپروچ Non-Realistic ہوتا ہے۔ وحید الدین خان کے مطابق انہوں نے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر (Realisti Approach) 1967 سے الجمعیۃ ویکلی کے زمانے سے ہی اپنانا شروع کیا تھا۔تب سے لے کر مرتے دم تک مایوسی خان صاحب کے نزدیک پھٹکتی بھی نہیں تھی۔ برصغیر کے جن اسلامی دانشوروں اور رہنماؤں نے بیسویں صدی کے آغاز سے ہی تشدد کو اسلام سے جوڑ کر اپنے خیالات کا پرچار کیا، ان کی خان صاحب نے کافی مذمت کی ہے۔

''ہندوستان کدھر'' سرخی کے تحت خان صاحب نے بابری مسجد پر بھی اپنے منفرد انداز میں بات کی، اور وہ ہمیشہ اس مسئلے کے سلجھنے کے حق میں تھے۔جن خیالات کا اظہار بیان اس کتاب میں تفصیلاً کیا گیا۔اس طرح وہ ''نیا ہندوستان'' سرخی کے تحت نئی امیدوں کے سہارے نئے ہندوستان میں مذہبی ہم آہنگی، انسانیت، قومی اتحاد اور مسائل کا ایک proper حل کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

وحید الدین خان مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح تقسیم ہند کو سب سے بڑا المیہ اور غلطی بھی مانتے ہیں اور قومیت کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں: قوم وطن سے بنتی ہے، نہ کہ مذہب سے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب بلاشبہ الگ الگ ہے، مگر دونوں ایک قوم ہیں۔

جنگ آزادی کے دوران مسلمانوں کی خدمات کو وہ دہراتے ہیں، البتہ دوقومی نظریے

Two Nation Theory کو وہ اسلام سے دور ہی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہندو مسلم ڈائیلاگ پر سب سے زیادہ زور دیا، نہ کہ ہمیں اپنے مسائل کو حل کرانے کے معاملے میں سرکار پر dependent رہنا چاہیے۔ تاریخ کے اوراق کو کھنگالتے ہوئے انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ انڈیا میں ایک ہزار سال سے مسلمان رہ رہے ہیں۔ یہ لوگ پہلے ہندو ہی تھے، جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ اب بتائیے یہ نسلی اعتبار سے انڈین ہی تو ہیں۔ اس بات کے پیش نظر دونوں مذہبوں کے لوگوں کو بھائیوں کی طرح ایک ہی خاندان میں رہنا چاہیے اور باہمی مسائل بھی اپنے ہی گھر میں حل کر لینے چاہیے اور اسی سے ہندوستان میں ایک نیا سورج طلوع ہوسکتا ہے! غرضیکہ مولانا کے یہ سارے افکار آج بھی تازہ ہیں اور موجودہ انتشار کا حل پیش کر سکتے ہیں!

آخر میں مولانا وحیدالدین خان اور ان کے مجموعی کنٹریبوشن کے پیش نظر یہاں یہ بات بھی درج کی جاسکتی ہے کہ بھارت سرکار کے ساتھ ساتھ دنیا کی مختلف تنظیموں اور اداروں نے انہیں کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا، مگر وہ امن کا داعی، اسلامی مفکر، عالمی دانشور نوبل پرائز کے مستحق تھے!۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مسلم رہنماؤں کے ذریعے بار بار آزمائے ہوئے بے نتیجہ تجربات کو چھوڑ کر ہمیں مرحوم وحیدالدین خان کے مشن کو آگے لے جانا ہوگا، اسی میں قوم کی بھلائی ہے۔ (ہفت روزہ سری نگر سماچار، 26 اپریل 2 مئی 2021، صفحہ 8)

---

بچھڑا کچھ اس انداز سے کہ رت ہی بدل گئی ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مولانا ہمارے لیے دین کا روشن چراغ تھے۔ جن کے سائے میں ہم نے اپنے من کی اندھیر نگری کو روشن پایا۔ وہ تنہا شخص ایک عہد تھا۔ اس کے جانے سے عہد بدلا ہے۔

(امین، اوکاڑا)

# امن اور عدم تشدد کا نقیب:
# مولانا وحید الدین خاں

حکیم شمس الآفاق، نئی دہلی

**میری ملاقات:**

غالباً اکتوبر 1976 کا واقعہ ہے۔ میرے ایک ملاقاتی جناب ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب جو آل انڈیا ریڈیو عربی یونٹ میں ایک سرکاری عہدے پر فائز تھے، سے میری ملاقات مفتی عتیق الرحمن عثمانی صاحب کے دولت کدہ پر ہوئی تھی۔ یہ ملاقات گہری ہوتی گئی۔ تعلقات بڑھتے گئے۔ اسی بیچ حیدر آباد ہاؤس کی لکڑی والی مسجد میں محسن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اتوار کا دن تھا۔ انھوں نے بتایا کہ آج میرے ہاسٹل میں ایک بزرگ تشریف لا رہے ہیں ان کا نام مولانا وحید الدین خاں ہے۔ ان کا لکچر ہے گھر پر، آپ تشریف لائیے۔ میں نے حامی بھرلی۔ ان کے گھر پر اکثر مولانا کی تقریر ہوا کرتی تھی جو بین المذاہب افراد پر مبنی ہوتی۔ میں حسب وعدہ پہنچا۔ دیکھا کہ ایک طویل القامت شخصیت، درخشاں چہرہ بالکل سادہ لباس میں موجود ہیں۔ اسی جگہ میری پہلی ملاقات مولانا مرحوم سے ہوئی۔ پھر دھیرے دھیرے تعلقات بڑھتے گئے۔ اور ایک دور ایسا بھی آیا کہ مولانا میرے غریب خانہ گول مارکیٹ پر ہر مہینے کے آخری Saturday کو تشریف لاتے۔ بین المذاہب افراد کی موجودگی میں تقریر اور اصلاح کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس طرح مولانا سے قربت بڑھتی گئی۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا۔

**الرسالہ سے تعلق:**

غالباً اکتوبر 1976 سے ماہنامہ الرسالہ سے جڑا۔ ایجنسی لی، اور الرسالہ کو اپنے حلقہ احباب میں متعارف کرایا۔ پڑھے لکھے باشعور اور سنجیدہ افراد نے ایک نئے ولولے کے ساتھ الرسالہ پڑھنا شروع کیا۔ میرے نرمان بھون کے دفتر میں الرسالہ کو پڑھنے اور پسند کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ الحمدللہ مولانا کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو میری نظر سے نہ گزری ہو۔ غلط فہمیوں کی وجہ سے

اکثر میرے کچھ ساتھیوں کو شکایت بھی ہوجاتی تھی۔ اور تقریر کے بعد یا دوران تقریر مولانا سے ذکر کر کے اس کا ازالہ چاہتے تھے۔ مولانا اس شکایت کا اس طرح ازالہ کرتے کہ تمام افراد اور خاص طور پر شکایت کنندہ بالکل مطمئن ہوجاتے۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ مولانا تقریر کے دوران ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پرچہ لئے رہتے تھے۔ تقریر کے دوران اکثر قرآن کی کوئی آیت پڑھتے اور اسے دیکھتے۔ پھر اس کاغذ کو اپنی جانگھ کے نیچے دبا لیتے۔ یہ بات شکایت کنندہ امتیاز صدیقی صاحب کو ناگوار اور ناپسندیدہ لگتی۔ ان کی نظر میں یہ قرآن کی بے حرمتی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔ میں نے اسی وقت مولانا سے تقریر کے دوران یہ بات پوچھ لی کہ جناب امتیاز صاحب کو شکایت ہے کہ آپ قرآن کی آیت کو اپنی جانگھ کے نیچے رکھتے ہیں، یعنی آپ قرآن کا احترام نہیں کرتے۔ مولانا کی صفت یہ بھی تھی کہ کسی بات پر فوراً react نہیں کرتے تھے۔ مسکرا کر کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ دیکھا تو اس کاغذ پر صرف ٹاپک کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ مثلاً امن، اصلاح، وغیرہ جیسے الفاظ۔ سب لوگ شرمندہ ہوگئے اور غلط فہمی دور ہوگئی۔ یہ تھا مولانا کا مزاج۔ اصلاح کا یہ طریقہ لوگوں کو بہت پسند آیا اور ان کی محبت اور ان کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

عرصے تک اس طرح کی نشست ہوتی رہی۔ میرے 2006 میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ اکثر احباب بھی retire ہوگئے، سب ادھر ادھر منتشر ہوگئے۔ پھر جب للیتا پارک، لکشمی نگر میں رہائش ہوئی تو یہ سلسلہ پھر شروع کیا۔ اس وقت مولانا کمزور ہوچکے تھے۔ اور حلقہ احباب بھی الگ الگ ہوگئے جس سے یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ لیکن الرسالہ کا مطالعہ اور احباب کے درمیان اس کی تقسیم اب بھی جاری ہے۔ تازہ شمارہ مئی 2021 کا میرے پاس ہے۔

حلقہ احباب جس میں دیگر مذاہب کے لوگ بھی تھے، مولانا کی قلمی و علمی صلاحیت، قابلیت، مقبولیت اور ان کی سادگی سے بہت متاثر تھے۔ وہ انسان کے روپ میں ایک فرشتہ نظر آتے تھے۔ میری ان سے ملاقات نظام الدین والے گھر C-29 پر اکثر ہوتی، کبھی اکیلے کبھی احباب کے ساتھ۔ ان کے کمرے کے چاروں طرف کتابوں کا انبار تھا۔ وہ اسی میں غرق رہتے تھے۔

**امن کے نقیب:**

یقیناً مولانا امن کے نقیب تھے۔ وہ communal harmony کے ایک بہت بڑے

علمبردار تھے۔ وہ خیر سگالی چاہتے تھے۔ ان کی تصنیفات کا ذخیرہ اردو، ہندی، انگریزی اورعربی زبانوں میں موجود ہے۔لوگ اس سے مستفید ہورہے ہیں۔وہ جتنی اچھی اردوزبان جانتے تھے اسی طرح وہ انگریزی زبان بھی جانتے تھے۔مولانا نے جدید سائنس اور اسلام کے موضوع پر جوکام کیا ہے۔وہ قابلِ ستائش ہے اور ناقابل فراموش ہے۔ان کی تصانیف،تحریروں نے ایک بہت بڑے علمی حلقے کومتاثر کیا۔کچھ لوگوں کوان کی کچھ باتیں پسند نہیں آتی تھیں۔

**روحانی طبیب یا مصلح امت:**

مولانا وحید الدین خان ایک روحانی طبیب تھے۔متعدد ایوارڈ یافتہ تھے۔اندرون ملک بھارت اور متعدد بیرون ملک نے ان کی علمی صلاحیت کے طور پر ان کو ایوارڈ سے نوازا لیکن یہ سارے ایوارڈز نے رتی بھر مولانا کے اندر کوئی تبدیلی یا کوئی کِبر پیدا نہیں کیا۔زندگی کا آخری ایوارڈ Padam Vibhushan 2021 میں وفات سے تقریباً ڈھائی ماہ (25 جنوری 2021) قبل ملا۔اس وقت ان کی طبیعت ناساز تھی،جس کی تصویر میرے پاس موجود ہے۔یہ خبر سن کر مولانا کے چہرے پر ذرہ برابر فرق نہیں پڑا۔لوگوں نے بتایا تو کوئی توجہ نہ دے کر ہاتھ سے اشارہ کردیا۔کہا چھوڑئے یہ سب باتیں۔یہ تو تھی ان کی سادگی۔وہ انکساری سے پُر شخصیت تھے۔

مولانا امن اور خیر سگالی کے بہت بڑے علم بردار تھے۔بے لوث انسان دیکھا تو مولانا کو دیکھا۔ان کی متعدد کتابیں پڑھی ہیں۔میرے پاس میرے چھوٹے کتب خانہ میں موجود ہیں مگر ان کی چند کتابیں مثلاً علم جدید کا چیلنج، پرافٹ آف پیس،تذکیر القرآن جیسی نایاب کمیاب کتابیں پڑھنے کو ملیں۔

مختلف ادوار سے گزر کر مولانا نے غالباً 1976 میں اسلامک سینٹر قائم کیا۔اس کے بعد غالباً اکتوبر 1976 سے ماہنامہ الرسالہ شروع کیا جو روز بروز ترقی کی طرف بڑھتا گیا۔اس کی مقبولیت ہی ان کے مشن کی سچی ضامن ہے۔آج بھی اردو رسالوں میں الرسالہ سے بہتر کوئی اور قدیم رسالہ نہیں۔اتنے عرصے تک اس کا زندہ رہنا ہی اس کی مقبولیت کا ضامن ہے۔

یہاں ایک واقعہ درج کرنا چاہتا ہوں۔R.S.S کے سدرشن صاحب نے غالباً کانسٹی ٹیوشن کلب یا اس کے آس پاس کسی لان میں ایک جلسہ منعقد کیا۔اس جلسہ میں ہندو مسلمان پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت تھی۔اس جلسے میں آر ایس ایس کی طرف سے ایک کتاب ’’مسلمان غریب اور

پچھڑے کیوں'' کا اجرا ہونا تھا۔ مولانا صدارت کررہے تھے۔ متعدد شرکاء نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میں بھی اپنے حلقہ احباب کے ساتھ اس میں موجود تھا۔ جلسے کے مقررین زہریلی، غلط سلط، بے مقصد ناپسندیدہ باتیں بولتے رہے۔ مولانا صدر کی حیثیت سے ایک سادہ سے لباس اور ایک پتلی سی چادر میں لپٹے ہوئے خاموش بیٹھے سن رہے تھے۔ جب سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرلیا اور صدر صاحب کی باری آئی تو مولانا کھڑے ہوئے، سدرشن صاحب نے کہا کہ مولانا آپ بیٹھ کر ہی اپنی بات کہیے۔ مولانا نے بیٹھ کر ہی جو تقریر کی اور ان سب کے غلط بیانات، ان کی غلط فہمیوں کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں واضح کیا تو سارا مجمع حیران رہ گیا۔ جلسہ میں ایک دم خاموشی طاری ہوگئی۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں سدرشن صاحب اٹھے، کہنے لگے مولانا آپ نے جو اسلام کی تشریح کی ہے اگر یہی اسلام ہے اور یقیناً ہے تو آج میں اس کتاب کا اجرا واپس لیتا ہوں۔ یہ سنتے ہی لوگوں میں ایک عجیب تجسس پیدا ہوا۔ اس کتاب کا اجرا واپس لے لیا گیا، اور کتاب روک دی گئی۔ بہر حال کسی طرح ایک دو کتاب میں نے اور میرے احباب نے حاصل کرلی۔ الحمد للہ آج تک وہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔ بہر حال یہ وہ صفات اور کمالات ہیں کہ بڑی سے بڑی ہستی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ایک اور واقعہ مولانا کا یاد آتا ہے۔ مولانا کی ایک تقریر ہلٹن ہوٹل (امریکا) میں تھی۔ عنوان تھا: Islam: Religion of Peace۔ غالباً دنیا بھر کے مفکر، علمی شخصیتیں اور ہر مذہب کے نمائندے اس میں موجود تھے۔ ایسی مجلسوں میں پہلے پیپر سامعین کو بانٹ دیا جاتا ہے پھر تقریر ہوتی ہے۔ اس پر سب کچھ تفصیل سے لکھا ہوتا ہے۔

مولانا کی جب تقریر ختم ہوئی تو چند حضرات مولانا کی تقریر سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ انھوں نے مولانا سے دہلی میں رابطہ قائم کیا۔ ملاقات کا ٹائم لیا۔ مقرر وقت پر مولانا کی پہلی منزل پر بڑے ہال میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت ایک مقامی مولانا بھی آگئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ مولانا اس ڈیلیگیشن سے بہت انہماک سے بات کررہے ہیں مجھ سے بات نہیں کررہے ہیں۔ انھوں نے معذرت چاہی اور اٹھ کر واپس چلے گئے۔ اس ڈیلیگیشن میں پانچ افراد تھے۔ جن میں غالباً 3 مرد اور 2 خواتین تھیں۔ مولانا کے شاگردوں نے انھیں اسلام پر چند کتابیں پیش کیں۔ انھوں نے شکریہ کے

ساتھ کتابوں کو قبول کیا۔ یہ لوگ چند ماہ بعد دوبارہ آئے تو ان کی سوچ بدل چکی تھی۔

آج وہ امریکا میں اسلام کی دعوت کا زبردست نظام چلا رہے ہیں۔ اور ایک داعی کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح بہت سے علمی واقعات مولانا کے موجود ہیں۔ کہاں تک صفحہ قرطاس کو سیاہ کروں۔

کوئی بھی آدمی فرشتہ نہیں ہوتا۔ لیکن آدمی رہ کر زندگی گزارنا بڑی بات ہے۔ مولانا بھی آدمی تھے، فرشتہ نہیں — انھوں نے ایک بامقصد زندگی گزاری۔ پوری زندگی مذہبی، قومی اور ملی خدمات میں صرف کردی۔ ان کا صرف یہ شیوہ تھا کہ اپنا کام کرتے رہو۔ لوگ کیا کہتے ہیں اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک میں ہی بلکہ پوری دنیا میں امن اور سلامتی رہے۔ ملک ترقی کرے۔ مسلمان ترقی کریں۔ وہ اپنے ملک بھارت سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ملک کے ہر فرد سے پیار کرتے تھے۔ کسی کو بھی غیر نہیں سمجھتے تھے۔ کسی سے کوئی بھی شکایت نہیں تھی۔ نہ کوئی ہندو تھا نہ کوئی مسلمان۔ سب اس رب العزت کی پیدا کردہ کائنات میں اولاد آدم تھے۔ سب بھائی بھائی ہیں۔ ہر جگہ ہر قوم میں ناپسندیدہ عناصر موجود ہوتے ہیں ان سے الگ ہو کر اپنا کام کرو۔ بس یہی ہمارا مشن ہے۔

مولانا نے انتہائی آسان زبان میں قرآن کریم کا انگریزی ہندی اور اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ عبدالکلام صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں نے مولانا کی متعدد کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ ایک زبردست مفکر ہیں۔ میں ان کو روحانی رہنما سمجھتا ہوں۔ اسی طرح انڈین ایکسپریس، ٹائمس آف انڈیا جیسے نیشنل اخباروں نے مولانا پر مضمون لکھا۔ اردو اخبارات خاص طور پر راشٹریہ سہارا نے دو مکمل صفحہ کا مضمون شائع کیا ہے جو قابل غور ہے، سب کو پڑھنا چاہیے۔

مولانا کی تحریر بھی غضب کی ہوتی تھی۔ سمندر کو کوزے میں بھرتے دیتے تھے۔ ایک صفحہ کا الرسالہ کا مضمون اور مکمل سبق۔ کیا خوبی تھی جو دوسرے لوگ لمبی لمبی تحریروں اور تقریروں سے نہیں سمجھا پاتے تھے مولانا ایک صفحہ کے مضمون میں حل کردیتے تھے۔ مولانا نے کبھی بھی جذباتی تقریر یا تحریر نہیں کی۔ یہ بڑی صفت تھی مولانا کی۔

بیسویں صدی کے جن علماء دین کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ان میں مولانا وحید الدین خاں

کوغیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔خصوصی طور پر بین المذاہب مکالمے کو فروغ دینا ہی ان کی زندگی کا اہم مقصد تھا۔اس میں انھوں نے کلیدی رول ادا کیا۔ان کا نظریہ دین سائنٹفک تھا۔وہ اپنی تقریر اورتحریر کی بدولت غیر مسلم دانشور طبقے میں بہت مقبول تھے اور پسند کئے جاتے تھے۔مولانا نے مذہب اسلام کواعتدال پسند مذہب کے طور پر پیش کیا۔کبھی بھی تشدد کا پیغام نہیں دیا۔

مولانا میرے مشیر تھے۔جب بھی میں کسی پریشانی یا الجھن میں ہوتا ان سے شیئر کرتا۔ان کو اپنے حالات بتاتا۔مولانا بہت مفید مشورہ دیتے۔میرے پیچیدہ مسائل سن کر حالات اور واقعات سے متاثر ہوکرایک مضمون کمینہ پن کے عنوان سے الرسالہ میں شائع کیا جو بہت کارگر ثابت ہوا۔اسی طرح ایک مسئلہ میری زندگی کے اہم موڑ پر ہوا۔میں نے مولانا سے ذکر کیا۔اس واقعہ سے بھی بہت متاثر ہوئے۔کچھ دنوں کے بعد الرسالہ کے ذریعہ دوسرا مضمون ''غلط فہمی'' کے نام سے شائع ہوا۔ان دونوں مضامین میں مولانا نے یہ ثابت کیا کہ غلط فہمی سے کیسے مسائل خراب ہوتے ہیں اوران پر صبر کر لینے اور خاموشی اختیار کرنے سے مسائل خود بخود حل ہوجاتے ہیں۔صبر پر اللہ کی غیبی مدد ہوتی ہے۔

مولانا نے معاشرہ کوخدا سے جوڑنے کی کوشش کی۔مولانا محترم بیسویں صدی کے آخری سب سے بڑے عالم تھے۔جلیل القدرہستی تھے۔وہ برصغیر کے واحد عالم تھے،جنھوں نے دورِجدید میں اسلامی فکر کو بہت آگے بڑھایا۔ان میں اعتدال پسندی کوٹ کوٹ کربھری تھی۔

جوشخص اصلاح کی غرض سے کام کرنا چاہتا ہے اس کی مخالفت بھی ضرور ہوتی ہے۔وہ غالباً پہلے آدمی ہیں جنھوں نے تنقیدی نظریہ کواپنایا۔دنیا کی تبدیلی کودیکھااورسمجھا۔

مولانا وحیدالدین خاں جیسے جیدعالم اور مصلح قوم وملت کا رخصت ہونا قوم اورملت کا ایک بڑا خسارہ ہے۔مولانا نے خود کوصرف مذہب تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ انھوں نے بھارت میں قومی یکجہتی اور فرقہ پرستی کے خلاف ماحول سازی کے لئے بھی اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا۔بڑے سے بڑے فرقہ پرستوں کی زبان پر تالا لگا دینا صرف اورصرف مولانا مرحوم کا ہی کام تھا،دوسرا کوئی اس کام کو لگام نہیں دے سکتا۔مولانا اعتدال پسندی کے نظریہ کے قائل تھے اوراپنی بات کہنے اور سمجھانے کا علمی ہنر بھی خوب جانتے تھے۔اس کام کے لئے مولانا نے سوچا کہ جب تک بھارت کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پرامن تعلقات قائم نہیں ہوں گے تب تک نہ تو قوم ترقی کرے گی،نہ مسلمان

ترقی کرے گا، اور نہ ملک۔ کسی قوم کی کسی ملک کی ترقی کے لیے ’’امن‘‘ سخت ضروری ہے۔ آج کے لیے بھی اور کل کے لیے بھی۔

چھوٹے چھوٹے صفحات میں بڑی بڑی گہری باتیں لکھنا یہ مولانا کی صفت تھی۔ اسلام کو جدید اسلوب میں اور محکم سائنسی و منطقی دلائل کے ساتھ پیش کرنے کے لیے۔ مولانا مرحوم کی کوشش بھی ان کے لیے ان شاء اللہ صدقہ جاریہ بنے گی۔ مذہب اور جدید چیلنج، کتابِ معرفت، پیغمبر انقلاب، گاڈ ارائزز، تعبیر کی غلطی، قیامت کا الارم، اظہارِ دین، آخرت کا سفر، ڈسکوری آف گاڈ، اور سیکرس گائڈ وغیرہ جیسی بہترین تصانیف نے مولانا کو برصغیر کی اسلامی علمی روایات کا ایک اہم سنگ میل بنا دیا۔

وہ ایک جید عالم و دانشور، اور امن کے پیغمبر تھے۔ انتہائی خاموش طبیعت پائی۔ بہت کم بولتے تھے، گہرائی سے سوچتے تھے۔ یہ ساری خوبیاں آج کے لوگوں میں خاص کر علماء میں کہاں پائی جاتی ہیں۔

---

# طارق بدر صاحب (لاہور) کے نام ایک خط

برادرم طارق بدر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے آپ کی ریکارڈنگ سنی۔ آپ کے خیالات کو جان کر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ اللہ تعالی آپ کی بھرپور مدد فرمائے۔ اب دوسرے دور کے لیے آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ اسٹرکٹلی نان پولیٹکل بن کر کام کریں۔ اسی کے ساتھ لو پروفائل کا طریقہ اختیار کریں۔ اللہ تعالی آپ کی ہر طرح کامل مدد فرمائے۔

20 جون 2020

دعا گو

وحید الدین خاں

نئی دہلی

# خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

مولانا محمد عبدالہادی عمری، برمنگھم، یوکے

جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ جامعہ دارالسلام عمرآباد میں جب ہم زیرِ تعلیم تھے اس وقت برصغیر کی جن شخصیات کا طلبہ کے درمیان چرچا تھا ان میں مولانا وحیدالدین خاں کا نام نمایاں تھا، خاص طور پر ان کی کتاب علم جدید کا چیلنج کے حوالے سے۔ اس کے ایک دو نسخے طلبہ تک پہنچے تھے، غیر درسی کتب کے اوقاتِ مطالعہ میں اس کتاب کے مندرجات سینئر طلبہ سے ہم سنا کرتے۔ کتاب کا محققانہ اسلوب، قوتِ استدلال اور پھر اسلامی تعلیمات کی عظمت کے نقوش قاری کو ذہنی مرعوبیت سے نکال کر اسلام کی حقانیت کا قائل کرتے۔

پھر مولانا کی مختلف کتابوں کے مطالعہ کا شوق بڑھتا گیا۔ جب یہاں برطانیہ پہنچے تو ان کے ساتھ ملاقاتوں اور نشستوں کے کئی مواقع میسر آئے۔ بعض مسائل میں اختلاف رائے کے باوجود دعوتی کاز کے لئے ان کے خلوص اور تڑپ سے انکار ممکن نہیں۔

ہمارے بھائی شمشاد خان صاحب مؤسس اسلامی پروپیگیشن سنٹر برمنگھم جو مشہور داعی شیخ احمد دیدات کے برمنگھم میں میزبان خاص ہوا کرتے، ان کی دعوت پر مولانا جب برمنگھم پہنچے تو ان کے پروگرامز کی فہرست میں جمیعت اہل حدیث، برمنگھم، برطانیہ کا مرکز بھی تھا۔ یہاں کے بعض علماء اور اراکین کے ساتھ مولانا کے تعلقات کا دائرہ قدیم اور وسیع تھا۔ جمیعت کی طرف سے شائع ہونے والے اردو مجلہ ماہنامہ صراطِ مستقیم کا ایک کالم درسِ قرآن ہے۔ اس میں عرصہ تک اس وقت کے مدیر مسئول مولانا محمود احمد میرپوری نے پسند کیا کہ مولانا کی تذکیر القرآن کا ہی حصہ شائع کیا جائے اور ماہنامہ الرسالہ دہلی کے مختلف مضامین اور اقتباسات بھی اس میں چھپتے رہے۔

مہمانِ گرامی نے صراطِ مستقیم کے حوالہ سے مختلف پہلوؤں سے صراطِ مستقیم کی تعریف اور حوصلہ افزائی کی، اس دورہ میں مولانا کے ساتھ دو نشستیں ہوئیں، ایک خصوصی نشست جس میں اہم موضوعات پر علماء کے ساتھ تبادلہ خیال ہوا بلکہ یوں کہیے کہ کچھ اشکالات پر گفتگو ہوئی۔ مولانا کا ایک

خاص وصف تھا کہ اختلاف رائے کو اہمیت سے سنتے اور دلائل پر مناقشہ بھی کرتے، اس نشست میں زیادہ گفتگو جہاد اور قربِ قیامت میں ظاہر ہونے والی کچھ نشانیوں کے متعلق، جن کی پیشین گوئی صحیح احادیث میں وارد ہے اور بعض کے بارے میں مولانا کا اپنا خاص نقطہ نظر تھا۔ گفتگو کے بعد مولانا محترم نے کچھ باتوں پر دوبارہ غور کرنے کا وعدہ کیا اور بعض کے متعلق کہا کہ یہ میری رائے ہے، اگر آپ مطمئن نہیں تو اس رائے کو چھوڑ دیجئے۔

مولانا یہاں کئی بار تشریف لا چکے ہیں، اس وزٹ کی دوسری نشست خطابِ عام کے لئے تھی۔ خاصی تعداد میں احباب جمع تھے۔ میں نے خطاب سے پہلے تعارف میں ایک بات کہی تھی کہ مولانا نے کمیونزم کے بارے میں کہا تھا کہ یہ نظریہ زوال پذیر ہے اور بہت جلد یہ ناکام ہو جائے گا۔ جب آپ نے یہ بات کہی اس وقت وہ اپنے عروج پر تھا، پھر تقریباً تیس سال بعد اس کی شکست وریخت ہوئی۔ ہمیں ایسے رہنما چاہیے جو وقت سے پہلے حالات کی تہ تک پہنچ کر درست رہنمائی کر سکیں اس تعارفی نکتہ کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ بہت توجہ سے مولانا کا خطاب سنتے رہے اور وقفۂ سوالات میں کئی احباب نے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے سوالات کئے کیونکہ اگر مولانا کی نظر اتنی گہری ہے تو اس مسئلہ میں کیا رہنمائی فرمائیں گے۔ یاد رہے یہ اس وقت کی بات ہے جب عموماً کشمیری رہنما اپنی تقریروں میں یہ تاثر دیا کرتے کہ گویا کشمیر کا مسئلہ حل ہونے کی خبر آج ملے کہ کل ملے۔

مولانا افکار و خیالات میں تقلیدِ جامد کے سخت خلاف تھے۔ اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے نتیجہ میں جس بات کو درست سمجھا اس کا اظہار برملا کیا، وہ اس اصول پر عمل پیرا تھے "لَا یَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ"۔ اپنے موقف کے اظہار میں کسی تعریف یا مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ کسی کو مولانا کے نتیجۂ فکر سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن جس کو حق سمجھا اس کا برملا اعلان کیا۔

مشہور محدث علامہ الشیخ ناصر الدین البانی کی فن حدیث پر تحقیقی مساعی کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور فنِ حدیث میں انھیں اتھارٹی سمجھتے ہوئے الرسالہ کے مختلف شماروں میں ان کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کیا۔

مولانا کے بعض خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن وہ اپنے موقف کو دلائل سے اس طرح مزین اور وزنی کرتے کہ ان کا علمی جواب ہر کس و ناکس کے بس میں نہ ہوتا۔ مولانا کی

نگارشات میں فکرِ آخرت گویا مرکزی عنوان اور اہم نکتہ تھا کہ دنیا کو آخرت کی کامیابی کا زینہ بناؤ، موصوف کی بیشتر تحریریں اسی نکتہ کے گرد گھومتیں اور اسی نتیجہ کی طرف قاری کو وہ لے جانا چاہتے۔

ماہنامہ الرسالہ کا بیشتر حصہ فردِ واحد کی صلاحیت کا نمونہ تھا کہ پرچہ کو شائع ہوتے ہوئے چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزرا، اس کا اپنا ایک طرز تھا۔ اس وجہ سے ہر ماہ نئے شمارہ کا قارئین کو شدت سے انتظار رہتا، بلاشبہ صحافتی دنیا میں یہ عظیم کارنامہ ہے۔

وہ مسائل اور دشواریوں کی شکایت کرنے اور اپنی محرومی یا ناکامی کا شکوہ کرنے، راستہ میں حائل سیاسی اور سماجی ناانصافیوں کے ذکر میں اپنی توانائیاں صرف کرنے کے بجائے زور دیتے کہ ان رکاوٹوں سے اعراض کرتے ہوئے نئی راہیں تلاش کیجیے۔

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے

---

# جوانی اور بڑھاپا

بڑھاپے کا دور انسان کے لیے عجز کی دریافت کا دور ہے۔ جس انسان کے اوپر بڑھاپے کا دور گزرے، وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے عجز کو دریافت کرے۔ عجز کی دریافت دوسرے اسباب سے بھی جزئی طور پر ہوتی رہتی ہے، لیکن کامل معنوں میں عجز کی دریافت صرف بڑھاپے سے حاصل ہوتی ہے۔

انسان جب جوانی کی عمر میں ہوتا ہے، اس کی تمام قوتیں شباب پر ہوتی ہیں۔ اس کے تمام آرگن پوری طرح کام کررہے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان قوتوں کا مالک وہ خود ہے۔ بڑھاپے کی عمر اس غلط فہمی کی تردید ہے۔ (مولانا وحید الدین خاں)

---

میرے روزمرہ کے مشاہدے اور تجربے کے مطابق، مولانا کی خاص صفت تھی—
اپنے خلاف تنقید کو معتدل انداز میں سننا اور اپنی غلطی کو ماننے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا۔
(فرہاد احمد، نئی دہلی)

# اہم تجاویز

ڈاکٹر محمد خالد، برمنگھم

میں الرسالہ کی کتابیں غور وفکر کے ساتھ پڑھتا رہتا ہوں۔ دوران مطالعہ جو باتیں میں نے محسوس کی ہیں، ان کو تجاویز کی شکل میں ذیل میں درج کر رہا ہوں:

1۔ "امت کا زوال اور اسباب"

اس موضوع پر مولانا کی کتابوں میں بہترین مواد (data) موجود ہے۔ مگر یہ مواد مختلف کتابوں میں منتشر حالت میں ہے۔ اسے یکجا کر کے ایک کتابی شکل میں مدوّن کیا جاسکتا ہے جس کی افادیت بے حد وحساب ہوگی۔ ایسے دلائل ابھی تک سامنے نہیں لائے گئے۔

مثلاً کتاب: "اسباقِ تاریخ" کے صفحات 158، 160، 233، 239، 175، 171، 92، 263، 233، 227، 362، 326۔ یہ صفحات امت کے زوال اور یورپ کے عروج سے متعلق ہیں۔

یہی موضوع دوسری کتاب "تصویر ملت" کے صفحات: 152، 5، 8، 20، 37، 20، 89، 131، 141، 296، 306، 320، اور 297۔

یہی موضوع مولانا کی دیگر کتب، تمام ڈائریز، اور سفرناموں میں بھی مختلف انداز میں موجود ہے۔ ان سب کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔ یہ امت کی تربیت کے لیے بہترین کتاب ہوگی۔ مگر یکجا تصنیف کی ضرورت کے تحت ان میں حذف واضافہ ناگزیر ہوگا۔ اہل علم اس سے واقف ہیں۔

2۔ موضوع: اسلامی دعوت

اس پر موثر مضامین مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً کتاب " تصویر ملت " کے صفحات، 255، 292، 354، 366، اور "اسباقِ تاریخ" سے، 251، 230، 242، 284، 147، 259، 288، 348، "ڈائری 94-1993" سے 241۔

یہ موضوع مولانا کے تمام سفرناموں، ڈائریوں اور دیگر کتب میں بکھرا ہوا ہے۔ ان میں "الاسلام"، "دینِ انسانیت"، "عظمتِ اسلام"، "احیاء اسلام"، "عقلیاتِ اسلام"، "مضامین

اسلام''، اور خود''الرسالہ'' کی متعدد شماروں میں موجود ہے۔ سب کو جمع کرکے انھیں کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔

مثالیں اور نقشہ چونکہ سامنے آچکا ہے، اس لیے ذیل میں صرف اہم موضوعات ہی کا ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ ان کے مطابق مواد کو جمع کیا جاسکے۔

دیگر موضوعات

- جدید اسلامی سیاسی تحریکیں اور ان کی ناکامی
- کائنات اور جدید فلکیات (خدا کا وجود)
- مسلمانوں کی علمی وسائنسی خدمات (اہم ومتفرق مواد)

بشمول غیر مسلم سائنس دانوں کے اعتراف

کچھ موضوعات پر تو الگ سے باقاعدہ کتب موجود ہیں، ظاہر ہے کہ انھیں چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ اسلامی فکر، راہِ عمل، اسلام اور عصر حاضر، دین انسانیت اور اسی طرح اسلام اور امن پر اردو اور انگلش میں الگ سے مرتبہ کتب۔

• مذکورہ بالا موضوعات میں سے ہر ایک کے حق میں اسی لٹریچر میں متعدد تاریخی، علمی وفکری اور اقوال زریں وزندگی کے عملی تجربات کی شکل میں عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ انھیں بھی متعلقہ موضوع کے تحت ترتیب وار رکھ دیا جائے۔ نیز تمام موضوعات جو یہاں نہیں دیے گئے، وہ تحقیق کی صورت میں سامنے آسکتے ہیں، اسی انداز میں ان کی تدوین بھی ہوسکتی ہے۔

• ایک عظیم علمی پروجیکٹ ہے۔ جس کے لیے باصلاحیت افراد کار کی ضرورت ہے۔ یقین ہے کہ وابستگانِ الرسالہ مشن میں ایسے افراد کی کمی نہیں۔ اور یہ بھی امید ہے کہ یہ کام پہلے ہی سے ان کے مدِنظر ہوگا۔

خدا ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ والسلام

# مولانا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان برِج تھے

عالم اسلام کی معروف شخصیت اور اسلامی اسکالر مولانا وحید الدین خان کے سانحہ ارتحال پر ریاست اتر پردیش کے رامپور میں ورک تنظیم کے ڈائریکٹر سید عبداللہ طارق نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا وحیدالدین خاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان برج کے مانند تھے۔

عالم اسلام کی ممتاز و معروف شخصیت مولانا وحیدالدین خان 21 اپریل 2021 کی رات 11 بجے 96 برس کی عمر میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کے سانحہ ارتحال پر ملک وملت کی سرکردہ شخصیات کی جانب سے اظہار تعزیت کا سلسلہ جاری ہے۔

رامپور میں ورلڈ آرگنائزیشن آف ریلیجیس اینڈ نالج نام کی دعوتی تنظیم کے سربراہ سید عبداللہ طارق نے اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا وحیدالدین خان جیسی شخصیت کا دنیا سے چلے جانا ایک بڑا خسارہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ متعدد اجتماعات میں ان کا اور مولانا کا کافی ساتھ رہا ہے۔

مولانا وحیدالدین خاں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان پُل کے مانند تھے: سید عبداللہ طارق نے کہا کہ مولانا وحیدالدین خان کی زندگی میں انفرادیت تھی۔ انہوں نے اسلامی دعوت کو عام کرنے میں کبھی کسی سے کوئی تعاون نہیں لیا۔ وہ اکیلے ہی کام کرتے چلے گئے اور انہوں اپنی زندگی میں مختلف اہم کاموں کو انجام دیا۔ عبداللہ طارق نے کہا کہ مولانا کی سرگرمیاں منفرد انداز کی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ مولانا وحیدالدین خان کا سب سے بڑا اور اہم کام وہ تھا جس کی آج کے زمانے میں شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے، وہ یہ ہے کہ نفرتوں کے ماحول میں ہندو—مسلمان کے درمیان کی کھائی کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔

اس موقع پر سید عبداللہ طارق نے کہا کہ مولانا نے اپنے مشن سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انھوں نے مولانا وحید الدین خان کے ساتھ گزرے اپنے اوقات کو بھی یاد کیا۔ واضح رہے کہ مولانا وحیدالدین خان مرحوم نے متعدد کتابوں کی تصنیف کے ساتھ ہی قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے جس کو انگریزی حلقہ میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔ (ای ٹی وی بھارت)

# علمی وادبی دنیا کا بہت بڑا خسارہ

## فیروز خان، دیوبند

معروف عالم دین مولانا وحید الدین خانؒ 96 سال کی عمر میں علالت کے باعث انتقال کر گئے۔ وہ نئی دلی کے ایک نجی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ انہوں نے پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی علاقے کی فضا سوگوار ہوگئی۔ مولانا وحید الدین خان کے سانحہ ارتحال پر دارالعلوم وقف دیوبند کے نائب مہتمم مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مولانا وحید الدین خان نے اپنی زندگی میں درجنوں کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر بھی لکھی، ان کی علمی خدمات کے باعث حکومت نے انہیں دوسرے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ پدم وی بھوشن سے بھی نوازا تھا۔ اللہ مرحوم کی مغفرت اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ دارالعلوم زکریا دیوبند کے مہتمم مولانا محمد شریف خان قاسمی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایک کر کے ساری بڑی ہستیاں بچھڑتی جا رہی ہیں، روزانہ کوئی نہ کوئی جانے پہچانے ہمارے درمیان سے رخصت ہو رہے ہیں، ہم نے اپنی زندگی میں اس تواتر کے ساتھ اپنوں کو کھوتے ہوئے نہیں دیکھا، خدا کرے کہ یہ سلسلہ دراز نہ ہو، ایک دن میں کئی کئی جاننے والوں کی جدائی کا غم اٹھانا بہت مشکل ہے۔

انہوں نے کہا کہ مولانا مرحوم پانچ زبانیں جانتے تھے۔ ان کی تحریریں بلا تفریق مذہب و نسل مطالعہ کی جاتی ہیں۔ وہ دانشور طبقہ میں امن پسند مانے جاتے تھے۔ ان کا مشن مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اسلام کے متعلق غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کرنا تھا۔ ان کے مشن کو جاری رکھنا ہی انہیں سچی خراج عقیدت ہوگی۔

عالمی شہرت یافتہ شاعر و ماہر تعلیم ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ مولانا وحید الدین خاں بڑی عہد ساز شخصیت کے مالک تھے انھوں نے بہت منظم طریقہ پر اپنے دعوتی مشن کو مسلسل جاری رکھا۔ مخالف اور تیز ہواؤں کے باوجود صبر و ضبط کے ساتھ اپنے مشن کے چراغ کو جلائے رکھنے کا ہنر کوئی مولانا وحید الدین خان سے سیکھے۔ وہ ہمیشہ سے مثبت سوچ کے حامی اور مبلغ رہے۔ ان سے بہت

سے معاملات میں اختلاف رکھنے والے لوگ بھی ان کے علمی کمالات کے قائل رہے ہیں۔ ملی، سماجی اور سیاسی مسائل پر بغیر کسی مصلحت کے بروقت اور برمحل بولنے والوں میں ان کا نام جلی حروف سے لکھا جائے گا۔ مولانا وحیدالدین خاں نے اپنی تحریروں سے مثبت قومی مزاج بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا رخصت ہونا ملک وقوم کا ایک بڑا نقصان ہے۔

معروف ادیب وقلم کار سید وجاہت شاہ نے مولانا مرحوم کے فرزندان و دیگر اہل وعیال کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خالص مذہبی مسائل پر مولانا وحید الدین خان کے دلائل، زندگی کے حقائق واحوال پر سادہ وجاذب اسلوب میں کیے گئے ان کے تبصرے، ان کی رہنمایانہ گفتگو انہیں بہت پسند تھی اور حقیقی زندگی میں ان سے استفادے کی بھی کوشش کی۔ ان کے اسلوب میں ایک بانکپن تھا اور اندازِ تحریر میں بلا کی کشش، وہ لکھتے نہیں تھے، اپنی بات کو قاری کے دل کی گہرائیوں میں اتارنے کا ہنر جانتے تھے، ایسی سادگی کے ساتھ ایسی سحر انگیز تحریریں لکھنے والا اردو زبان میں شاید ہی کوئی دوسرا گزرا ہوگا۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

جامعۃ الشیخ حسین احمد المدنی خانقاہ دیوبند کے مہتمم مولانا مزمل علی قاسمی نے کہا کہ مولانا مرحوم کے انتقال پر ملال کی خبر نے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اللہ نے انھیں بے پناہ مقبولیتوں سے نوازا اور ہندوستان سے لے کر یورپ کے دور دراز ملکوں تک ان کے دورے ہوئے، مگر روئے زمین کے ہر خطے اور ہر گوشے میں وہ اپنی عالمانہ شان اور قلندرانہ وقار کے ساتھ پہنچے۔ انھوں نے دینِ اسلام کی عصری تعبیر وتشریح کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہوئے اپنی حد تک پوری زندگی اس ضرورت کی تکمیل کی کوشش کی۔ اللہ مرحوم کو اپنے قرب خاص سے نوازے۔

جمعیۃ علماء ہند کے ضلع سکریٹری مولانا محمد ابراہیم قاسمی نے کہا کہ مولانا وحید الدین خان سماج کی صالح تعمیر وتشکیل کے لیے فرد کی تعمیر کو ضروری قرار دیتے تھے اور فرد کی تعمیر کے اجزا وعناصر وہ قرآن و حدیث، اسلامی مآخذ اور دنیا بھر کی ترقی یافتہ قوموں کے واقعات واحوال سے تلاش کرتے تھے۔ مولانا وحید الدین خان ایک فرد نہیں تھے، ایک ادارہ تھے، ایک انجمن تھے، ایک اکیڈمی تھے؛ بلکہ علم ونظر اور فکر ودانش کی پوری ایک کائنات تھے۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔

دارالعلوم فاروقیہ دیوبند کے مہتمم مولانا نورالہدی قاسمی بستوی اور انڈو عرب ملٹی لنگول

پرائیویٹ لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائرکٹر محمد انوار خان قاسمی بستوی نے کہا کہ مولانا وحید الدین خان کو اے گریٹ سائنٹیفک سینٹ آف مسلم ورلڈ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا اچانک یوں چلے جانا علمی اور ادبی دنیا کا بہت بڑا نقصان ہے، لیکن مولانا نے زندگی کی آخری سانسیں لینے کے لیے خاتمہ بالخیر کے طور پر جو مبارک لمحات پائے وہ ان کی دینی خدمات کی قبولیت کا نشان ہیں۔

یوپی رابطہ کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، الحیاء پبلیکیشنز کے ڈائرکٹر عبداللہ عثمانی، نوجوان شاعر تنویر اجمل دیوبندی، معروف افسانہ نگار ہارون حسرت اور ماسٹر شمیم کرتپوری، قاری عامر عثمانی، مولانا عبداللطیف قاسمی، مہدی حسن عینی قاسمی، جمعیۃ فلاح انسانیت کے قومی جنرل سکریٹری الحاج شاہ عالم قاسمی، معروف اسلامک اسکالر مولوی سکندر خان اور محمد ثاقب خان نے مشترکہ طور پر کہا کہ مولانا وحید الدین خان اپنی سحر انگیز اور پر اثر خطابت کے ذریعہ ہوا کے رخ کو بڑی حد تک پھیرنے اور سامعین کے دلوں پر حکومت کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ اللہ رحم کا معاملہ اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ (awazthevoice.in, 22.04.2021)

---

ہندوستان کے معروف اسلامی اسکالر وحید الدین خان نہیں رہے: (یو این آئی) ہندستان کے معروف اسلامک اسکالر اور پدم بھوشن سے سرفراز مولانا وحید الدین خان کا کل دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ 96 برس کے تھے۔ ان کی پیدائش یکم جنوری 1925ء کو بڈھریا اعظم گڑھ، اتر پردیش میں ہوئی۔ وہ مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے فارغ التحصیل عالم دین، مصنف، مقرر اور مفکر تھے۔ وہ اسلامی مرکز نئی دہلی کے چیرمین اور ماہ نامہ الرسالہ کے مدیر تھے۔ وہ 1967ء سے 1974ء تک الجمعیۃ ویکلی (دہلی) کے مدیر رہ چکے ہیں۔ آپ کی تحریریں بلاتفریق مذہب ونسل مطالعہ کی جاتی ہیں۔ خان صاحب پانچ زبانیں جانتے تھے (اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی) اور وہ ان زبانوں میں لکھتے اور بیان دیتے تھے۔ ٹی وی چینلوں میں آپ کے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔ مولانا وحید الدین خاں عام طور پر دانشور طبقہ میں امن پسند مانے جاتے ہیں۔ ان کا مشن ہے مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔ اسلام کے متعلق غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کرنا۔ مسلمانوں میں مدعو قوم (غیر مسلموں) کی ایذا و تکلیف پر یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی تعلیم کو عام کرنا ہے جو ان کی رائے میں دعوت دین کے لیے ضروری ہے۔ (قومی آواز، 22 اپریل، 2021)

# میرے مولانا صاحب

## ڈاکٹر شیام سندر شرما، نئی دہلی

میں نے مولانا صاحب کے ساتھ رہ کر جن اچھائیوں کو حاصل کیا وہ آپ لوگوں سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے پندرہ سال آرتھوپیڈکس کی حیثیت سے مولانا صاحب کی خدمت انجام دی ہے۔ مولانا صاحب اپنے آپ میں ایک مکمل شبد تھے۔ انھوں نے پوری زندگی سچائی کی تلاش میں گزاری۔ اتنا سمپل لیونگ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کے پاس جب میں پہنچتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں کسی فرشتے کے پاس آکر بیٹھا ہوا ہوں۔ آج تک میں نے ان سے نگیٹیو شبد نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ ہم لوگوں کو یہی سکھاتے تھے کہ جیون میں کبھی نگیٹیوٹی نہیں آنے دیجئے گا۔ چاہے کیسی بھی مشکل ہو اس کو ایک چیلنج کے طور پر لیجئے گا۔ اللہ جب ایک راستہ بند کرتا ہے تو دوسرا راستہ ضرور کھولتا ہے۔ اسی امید کے ساتھ آپ کو آگے بڑھنا ہے۔ مولانا کی سمپل لیونگ کے بارے میں میں اکثر ان کی زبان سے سنتا تھا کہ ان کی امی جان اکثر کہا کرتی تھیں کہ ’’رہلین باہمن، بھَیلی دھوب، جات جات ہم کیسَن ہوب)‘‘ ہم برہمن تھے، دھوبی بن گئے، معلوم نہیں جاتے جاتے ہم کیسے ہوں گے )۔ مطلب کہ مولانا صاحب کی بچپن سے اتنی سادہ زندگی رہی ہے کہ ان کی امی کو بھی یہ احساس ہوتا تھا کہ اتنی بڑی فیملی میں ان کا جنم ہوا اور ان کا جیون صوفیانہ اور فقیری والا گزر رہا ہے۔ مولانا کے پاس جب بھی ہم آتے تو وہ خیریت نہیں پوچھتے تھے کہ کیا حال ہے بلکہ پوچھتے کہ آپ کے پاس کوئی نیوز ہے؟ اور اس سے وہ کچھ نہ کچھ سیکھ ضرور لیتے تھے۔ ہر پل اور ہر سکنڈ صرف اور صرف پازیٹیو تھاٹ اور اللہ کی حمد میں جیتے تھے۔ جب وہ سوتے تھے تو اللہ کے نام سے سوتے تھے، اور جب سو کر اٹھتے تھے تو بھی اسی کے نام سے اٹھتے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جب وہ سوتے تھے تو بھی اللہ ہی کے دھیان میں سوتے تھے۔ ان کی سمپل لیونگ ایسی تھی کہ ان کو فرق نہیں پڑتا تھا وہ کپڑا سیدھا پہنے ہوئے ہیں یا الٹا پہنے ہوئے ہیں، بس ان کا جسم ڈھکا ہوا ہو بہت ہے۔ وہ اپنے کمرے میں، اپنی لیونگ میں چینج نہیں چاہتے تھے۔ نیچر سے بھی ان کو بہت لگاؤ تھا، وہ نیچر میں جینے والے شخص تھے۔ ایک بات وہ مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ ڈاکٹر شرما اللہ سب کچھ معاف کرے گا لیکن مورتی پوجا کبھی معاف نہیں کرے گا تو میری بات یاد رکھیے گا کہ کبھی مورتی پوجا مت کیجیے گا، تو میں ان سے کہتا تھا کہ مولانا صاحب میرا وعدہ ہے آپ سے کہ میں صرف مالک کی پوجا اور سجدے میں زندگی گزاروں گا۔

# عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

امتِ مسلمہ کا فائنل رول
اسفارِ ہند
سفرنامہ غیر ملکی اسفار۔2
سفرنامہ غیر ملکی اسفار۔1
میوات کا سفر
ڈائری 1983۔1984
ڈائری 1989۔1990
ڈائری 1991۔1992
ڈائری 1993۔1994
ہند۔پاک ڈائری
اسباقِ تاریخ
اظہارِ دین
کتابِ معرفت
اسلام: ایک تعارف
مطالعہ قرآن
مطالعہ سیرت
مطالعہ حدیث
دینِ کامل
دین و شریعت
حکمتِ اسلام
عظمتِ اسلام
دعوتِ اسلام
دینِ انسانیت
مسائلِ اجتہاد
امنِ عالم
قال اللہ، قال الرسول

اللہ اکبر
پیغمبرِ انقلاب
دعوتِ حق
اسلامی زندگی
نشری تقریریں
قیادت نامہ
خاتونِ اسلام
عورت: معمارِ انسانیت
کتابِ زندگی
ہندستانی مسلمان
الربانیۃ
عظمتِ قرآن
فکرِ اسلامی
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرِ حیات
رازِ حیات
عقلیاتِ اسلام
مذہب اور جدید چیلنج
کاروانِ ملّت
مضامینِ اسلام
رہنمائے حیات
تعبیر کی غلطی
تصویرِ ملّت
سیرتِ رسول
ظہورِ اسلام
تعمیرِ حیات

تعمیرِ انسانیت
اسلامی تعلیمات
انسان کی منزل
صراطِ مستقیم
حیاتِ طیّبہ
حقیقتِ حج
حدیثِ رسول
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
احیائے اسلام
الاسلام
اسلام اور عصرِ حاضر
شتمِ رسول کا مسئلہ
سوشلزم اور اسلام
راہِ عمل
دعاء و ذکر کی حقیقت اور اسمِ اعظم
اسلام دورِ جدید کا خالق
حل یہاں ہے
مذہب اور سائنس
تبلیغی تحریک
تجدیدِ دین
سوشلزم: ایک غیر اسلامی نظریہ
قرآن کا مطلوب انسان
معرفتِ قرآن
دین کی سیاسی تعبیر
زلزلۂ قیامت
تعمیر کی طرف

اسلام دینِ فطرت
اسلام اور انتہا پسندی
تعارفِ اسلام
صوم رمضان
صبح کشمیر
امہاتُ المومنین
تعددِ ازواج
کشمیر میں امن
خدا اور انسان
تعمیرِ ملّت
اتّحادِ ملّت
نارِ جہنم
مطالعہ سیرت (کتابچہ)
ایمانی طاقت
اسلامی دعوت
اسلام کیا ہے
دینی تعلیم
فسادات کا مسئلہ
حقیقت کی تلاش
تاریخ دعوتِ حق
تاریخ کا سبق
یکساں سول کوڈ

روشن مستقبل
سبق آموز واقعات
آخری سفر
علماء اور دورِ جدید
دین کیا ہے
خلیج ڈائری
عظمتِ صحابہ
عظمتِ اسلام (کتابچہ)
عظمتِ مومن
باغِ جنت
راہیں بند نہیں
اسلام کا تعارف
رہنمائے حیات (کتابچہ)
اسلام: پندرھویں صدی میں
ہندستان آزادی کے بعد
انسان اپنے آپ کو پہچان
نئے عہد کے دروازے پر
سچا راستہ
منزل کی طرف
پیغمبر اسلام
طلاق اسلام میں
اسلام اور خدمتِ خلق

اسلام: ایک عظیم جدّ و جہد
تربیتِ اولاد
صوم رمضان
خاندانی زندگی
اقوالِ حکمت
قیامت کا الارم
معرفتِ الٰہی
تزکیہ نفس
اسمائے حسنیٰ
مقصدِ حیات
آخرت کا سفر
دعوتِ الٰہی
حقیقتِ توحید
حج کا پیغام
اسلامی جہاد
شہادتِ: امتِ مسلمہ کا مشن
منصوبہ بند عمل
سوال وجواب
دورِ دعوت
خدا کی دریافت

ان اردو کتابوں کو پی ڈی ایف (PDF) فارمیٹ میں پڑھنے کے لیے اس لنک پر کلک کریں یا QR Code کو اسکین کریں: https://cpsglobal.org/books/mwk/urdu

# دعوت اور معرفت

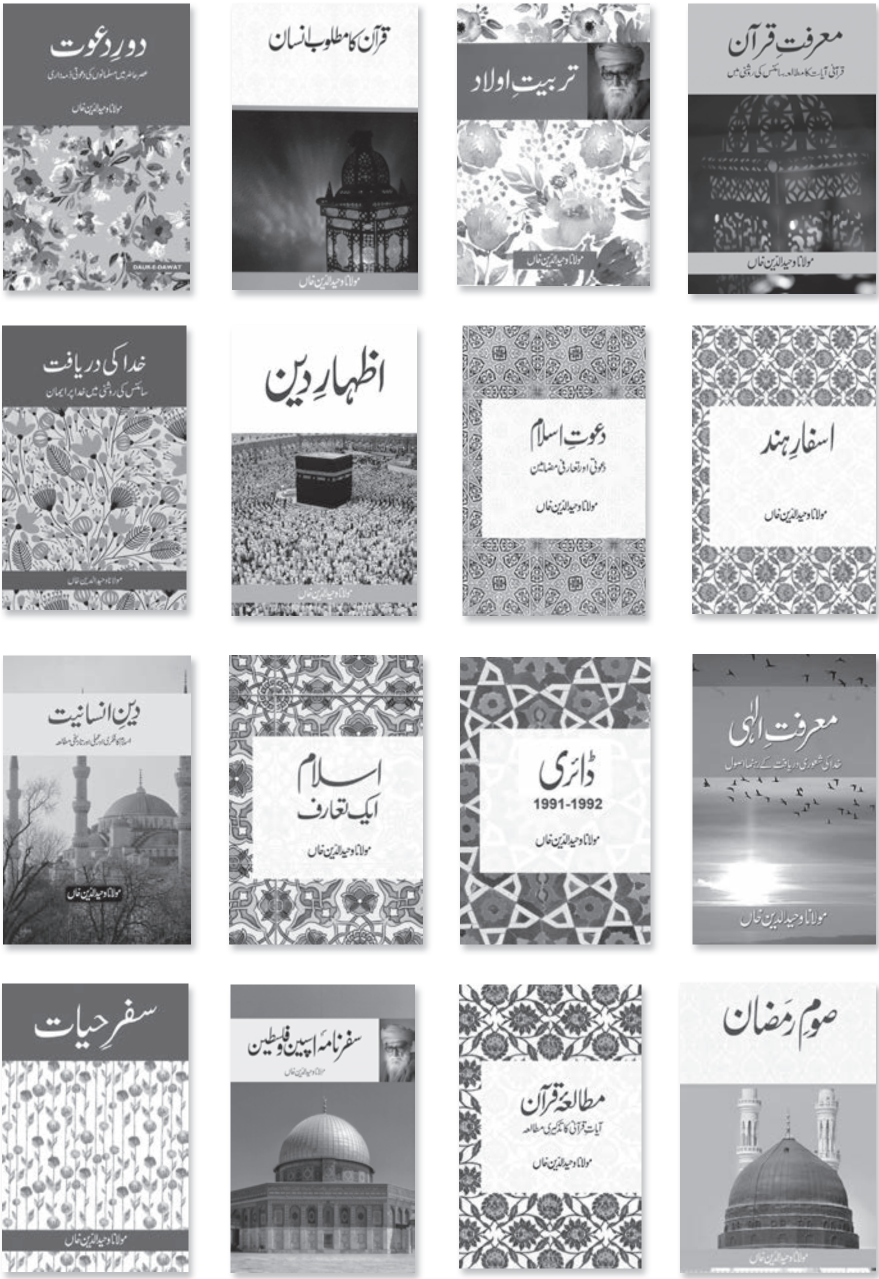


**Call: 011 41827083** **sales@goodwordbooks.com**

مولانا وحید الدین خاں کی تقریر اور تحریر کے لیے سی پی ایس انٹرنیشنل کے کچھ اہم لنک اور QR Codes ملاحظہ فرمائیں:

سی پی ایس انٹرنیشنل کے ویب سائٹ پر جانے کے لیے

https://cpsglobal.org/

الرسالہ اردو، انگلش اور ہندی کا مطالعہ کرنے کے لیے

https://cpsglobal.org/magazines

مولانا کے آرٹکلس پڑھنے کے لیے

https://cpsglobal.org/articles/mwk

سوال وجواب کا مطالعہ کرنے کے لیے

https://cpsglobal.org/faq

مولانا کے اردو انگلش ویڈیو دیکھنے کے لیے

https://cpsglobal.org/videos

اردو، انگلش آڈیوز کے لیے اس لنک پر کلک کریں

https://cpsglobal.org/podcasts

Madrasatul Islah in Sari Meer, U.P. where Maulana Wahiduddin Khan studied during his youth.

Maulana Wahiduddin Khan at the bridge in his village in Azamgarh in 2010. In his youth Maulana used to sit here hours and hours contemplating on the Creator.

The Prime Minister of India Mr Manmohan Singh honours Maulana Wahiduddin with Rajiv Gandhi National Sadbhavna Award in New Delhi in 2010.

Maulana Wahiduddin Khan receiving the Divaliban Mohan Lal Mehta Award Progress of Religion from the former President of India, Mr R Venkataraman in 1997.

Maulana Wahiduddin Khan receiving the Communal Harmony Award from the former President of India, Mr K R Narayanan in 1998

Maulana Wahiduddin Khan receiving Demirguis Peace Award at Zug, Switzerland in 2002.

Maulana Wahiduddin Khan receiving Sayyidina Imam Al Hassan Ibn Ali Peace Award from Sheikh Abdullah Bin Bayyah in Abu Dhabi in 2015.

Maulana Wahiduddin Khan receiving the Lifetime Achievement Award from ISNA President Azhar Azeez at Chicago in 2015.

Saniyasnain Khan receiving National Citizen Award from Mother Teresa on behalf of Maulana Wahiduddin Khan in New Delhi in 1996.

Maulana Wahiduddin Khan at Al-Aqsa Mosque, Jerusalem in 2010

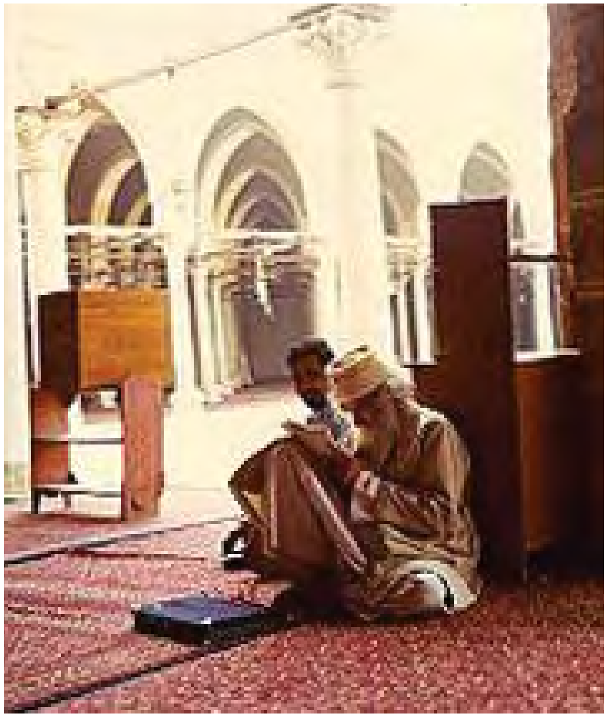

Maulana Wahiduddin Khan in Amr ibn Al-As Mosque, Cairo

Maulana Wahiduddin Khan delivering a lecture on the occasion of the 150th Birth anniversary of Swami Vivekananda at India International Centre in New Delhi in 2013

Maulana Wahiduddin Khan at Malta during a Peace Conference in 1991

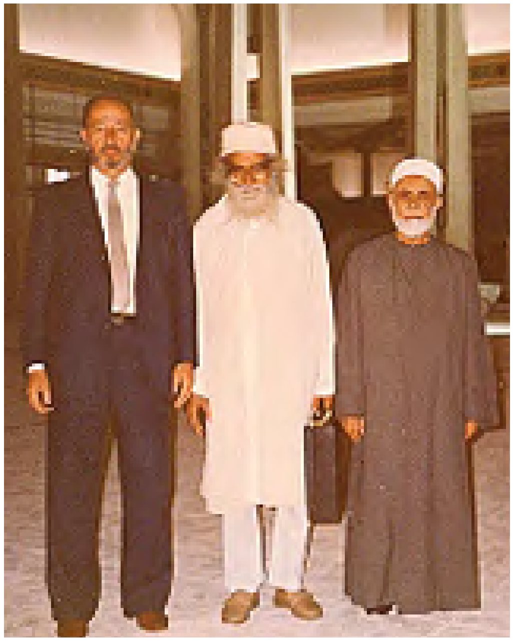

Maulana Wahiduddin Khan at the Grand Mosque in Rome in 1991

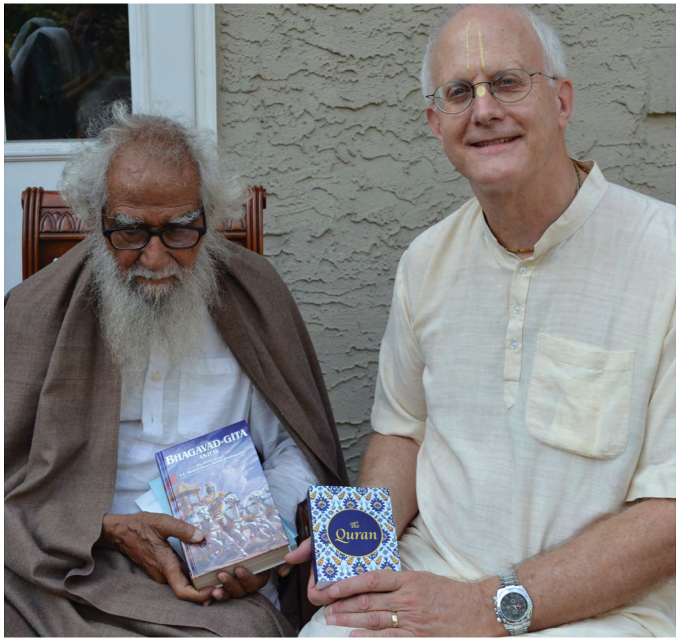


Maulana interacting with ISKON Temple representative in Pennsylvania, USA in 2015

Maulana Wahiduddin Khan delivering a talk at Sai Baba Centre

Maulana Wahiduddin Khan at an interfaith conference 'Walk of Hope' in New Delhi in 2016

Maulana Wahiduddin Khan delivering a talk a IRS Conference in Toronto, Canada in 2016

Maulana Wahiduddin Khan in a Prayer Meeting in Cyprus in 2008

Maulana Wahiduddin Khan at an interfaith conference organized by the Community de St. Edigio in Rome in 1996

Maulana Wahiduddin Khan at a Peace Conference in Cyprus in 2008

Maulana Wahiduddin Khan delivering a lecture at Dubai Awqaf with Javed Khateeb and Dr Rajat Malhotra in 2011

Maulana Wahiduddin Khan and Dr Farida Khannam interacting with Mr Becov and other delegates at the Interfaith Conference at Zug, Switzerland in 2002

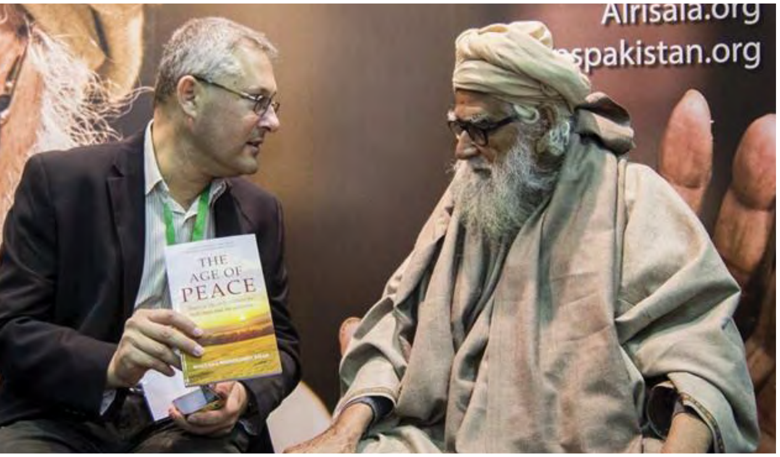


Maulana Wahiduddin Khan at ISNA Convention in 2015

Maulana Wahiduddin Khan participating in an interfaith program 'Walk of Hope' at New Delhi in 2016

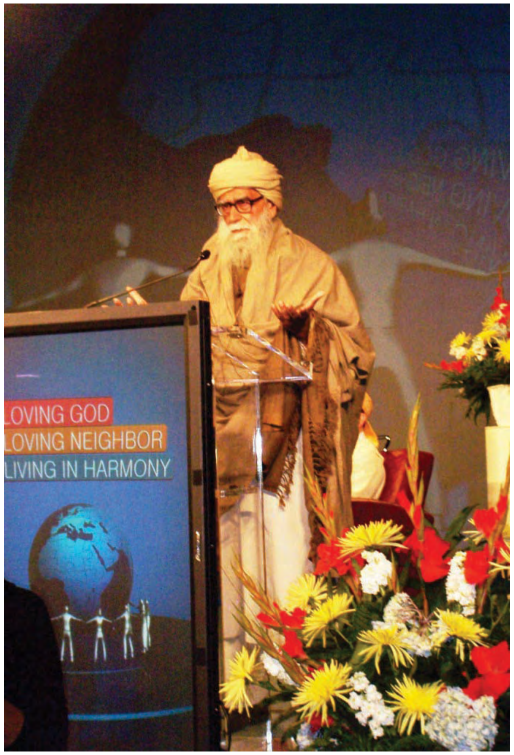


Maulana Wahiduddin Khan speaking in ISNA, USA in 2011

Maulana Wahiduddin Khan participating in a Peace Conference

Maulana Wahiduddin Khan delivering a lecture at Quran Conference 2019 organised by CPS International in New Delhi

Maulana Wahiduddin Khan at New World New Peace Conference in Israel in 2010

Maulana Wahiduddin Khan with the Prime Minister of India Dr Manmohan Singh in 2010

Maulana Wahiduddin Khan interacting with a participant of the program in New Delhi

Maulana Wahiduddin Khan presenting a copy of the English Quran to the Israel President, Shimon Peres in 2010

Maulana at the US State Department office in Washington DC in 2015

Maulana Wahiduddin Khan is presenting the book, Prophet of Peace to Mrs Sonia Gandhi in 2010

Meetingg with US Ambassador to India Mr Richard Verma in 2015

Maulana Wahiduddin Khan is visit to the USA in 2015

Maulana Wahiduddin Khan with Morari Bapu in his Gurukol, Gujrat 2010

Maulana Wahiduddin Khan meeting with the President of India, Dr Abdul Kalam in 2009

Maulana Wahiduddin Khan with the President of India, Mrs Pratibha Patil along with religious leaders in 2011

Maulana Wahiduddin Khan with H. H. Dalai Lama in 2013

Maulana Wahiduddin Khan with Sudhanshu Ji Maharaj in 2010

Maulana Wahiduddin Khan doing dua at the Quran Conference 2019, New Delhi

CPS Delhi Team at the Quran Conference 2019